مزاراتِ حرمین

یعنی

مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے مشہور مزارات و مقابر کی

جامع و مفصل تاریخ

از

علی شبّیر

سررشتہ دار انتظامی ہائیکورٹ حیدرآباد دکن

مصنف نظمِ شبیر مترجم سفرنامہ برکھارٹ سیاح عرب و مؤلف محاکمہ قطعات ابن یمین و سعدی و تاریخ حجر اسود و حجاز کے فرنگی سیاح و تاریخ غلاف کعبہ وغیرہ وغیرہ

باہتمام و نگرانی سید علی رضا

مطبع انوار الاسلام کوٹلہ اکبر جاہ حیدرآباد دکن میں چھپی

۱۳ شعبان سنہ ۱۳۴۷ھ — ۲۳-اسفندار سنہ ۱۳۳۸ف

فہرست مضامین کتاب مزارات حرمین

فصل دوم
جنت البقیع
مدینہ منورہ کا مشہور قبرستان

فصل سوم

مدینے کے بعض دوسرے قبرستان

تمت

دیباچہ شکر

خدا کا ہزار ہزار شکر جس نے حرمین الشریفین کی محبت میرے دل میں ودیعت فرمائی جس نے مجھکو ایک ایسی آتش شوق بخشی جو نہ حرمین کی دید سے بجھی اور نہ حسرت زیارت سے۔ جس نے دو دو جنتیں میری تفریح کیلیے عنایت کیں۔ کبھی جنت المعلیٰ کی وادیوں میں گشت لگاتا ہوں اور کبھی جنت البقیع کے زاویوں کی سیر کرتا ہوں۔ میرے ہمراہیوں کے حج و زیارت ختم ہوگئے مگر میرا یہ مبارک سفر ابھی تک طے نہیں ہوا۔ میرا جسم خاکی یہاں ہے لیکن میرا پیکر روحانی مکہ و مدینے کی گلیوں میں چکر لگا رہا ہے۔ میں اپنے مضامین سفر حج اور تاریخ مزارات حرمین کی بدولت ابھی تک حجاز ہی میں ہوں اور اس اعتبار سے میرا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے

جو میں ہوں محو طوافِ کعبہ تو دل ہے مصروفِ سیرِ طیبہ
یہ دو دو ہاتھوں سے لوٹتا ہوں جنابِ عالی ثواب کیسا

اللہ کے شکر کیساتھ حضرت ظل اللہ کا شکریہ بھی مجھپر واجب ہے جسکی بذل وعطا پر حرمین کے در و دیوار صدائے شکر سے گونج رہے ہیں جس کے دریائے سخا کی لہریں ہندوستان سے نکلکر اگر ایک طرف عراق و مشہد تک پہنچی ہیں تو دوسری طرف حجاز و بیت المقدس تک۔ جس کے وظیفہ خوار سلطان المعظم معزول خلیفۃ المسلمین[1] اور اُن کی ملکہ سے لگا کر حجاز کے عام مستحقین تک ہیں۔ جسکی خدمات مذہبی کی گواہی ساکنین یثرب و بطحیٰ۔ آستانہ رسول اللہ و در بیت اللہ پر دیتے ہیں جسکی دستگیری سے ہر سال حاجیوں کے قافلے حج و زیارت سے

[1] سلطان عبدالمجید خاں کو سرکار آصفی سے تقریباً چار سو روپیہ ماہانہ اور اُن کی ملکہ کو ایک معتدبہ سالانہ وظیفہ عطا ہوتا ہے۔

مشرف ہوتے ہیں۔ جو عازمین بیت اللہ و بیت الرسول کو چھ چھ مہینے کی رخصت اور چھ چھ مہینے کی پیشگی تنخواہیں مرحمت فرماتا ہے۔ جسکی عنایات بے غایات سفر حجاز میں ہر جگہ مجھ پر سایہ فگن رہیں۔ مکے میں مجھے آرام ملا تو اُسی کی رباط[1] میں۔ مدینے میں ٹھہرا تو اُسی کی مسافر خانے میں[2]۔ بیت اللہ میں دھوپ سے بچا تو اُسی کی سبیل میں[3]۔

اللہ تعالیٰ ہمارے آقائے ولی نعمت۔ حامیٔ دین و ملت۔ بادشاہ اسلام۔ عاشق رسول محب اہلبیت اعلیحضرت بندگان عالی آصفجاہ نظام الملک سلطان العلوم **نواب میر عثمان علیخاں بہادر** خسروِ دکن خلد اللہ ملکہم و سلطنتہم کو مع شاہزادگان بلند اقبال و شہزادیان فرخ فال سلامت رکھے۔

والبستۂ دامن دولت آصفیہ

علی شبیر

سررشتہ دار انتظامی ہائیکورٹ

حیدرآباد دکن

(ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۶ھ)

---

[1] مکہ معظمہ میں علاقہ حیدرآباد کے کئی رباط ہیں جنمیں حیدرآبادی حجاج بلاکسی کرایہ کے ٹھہر سکتے ہیں منجملہ اُنکے ایک رباط حسین بی صاحبہ مرحومہ ہے۔ میں نے مکے میں یکے بعد دیگرے دو مکان کرایہ پر لیے تھے مگر کہیں آرام نہ ملا تو کرایہ سے دست بردار ہو کر بالآخر حضرت حسین بی صاحبہ کی رباط میں مقیم ہوا۔

[2] مدینۂ منورہ میں بھی ہماری ریاست کے کئی رباط ہیں۔ یہاں بھی میں حضرت حسین بی صاحبہ مرحومہ کے رباط میں فروکش ہوا تھا۔

[3] بیت اللہ کے باب الزیادہ سے متصل حرم سے ملحق ایک حجرہ ہے۔ اس کا ایک دروازہ حرم میں کھلتا ہے۔ اسمیں سے کعبہ و حرم سب دکھائی دیتا ہے۔ یہ حجرہ حرم کا جز و سمجھا جاتا ہے اور اس کی نماز مثل حرم کی نماز کے ہوتی ہے۔ یہ مقام نہایت ٹھنڈا ہے۔ دوپہر کے کئی گھنٹے عموماً میں یہیں گزارا کرتا تھا۔ اس حجرے میں حضرت بندگان عالی کیطرف سے آب زمزم کی سبیل ہے۔ حجاج خصوصاً ظہر و عصر کی نماز کے بعد یہاں آکر سیراب ہوتے ہیں۔ اس سبیل کے داروغہ حاجی حافظ احمد علیخاں صاحب ہیں۔ میں نے اُن کو بہت سی خوبیوں سے متصف پایا۔ سبیل کے اخراجات علاقہ صرفخاص مبارک ادا ہوتے ہیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ اس سبیل کو ہماری ریاست ابدمدت کی عظمت و شان کے لحاظ سے وسیع پیمانہ پر قائم کیا جائے۔ امید ہے کہ خدام بارگاہ اس بارہ میں حضرت اقدس و اعلیٰ کی توجہ مبذول کرائینگے۔

دیباچۂ شکایت

اشھد ان لا الہ الا اللہ

(ش)

عقل کی بات کوئی ہمنے کہی ہے شاید
جنتی جتنے ہیں سب ہمسے خفا بیٹھے ہیں
حالی

سفر حجاز و گزشتہ حج کے متعلق میرے بعض مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شایع ہوئے ہیں جو زیادہ تر تاریخی واقعات اور میرے مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین میں حکومت نجد کے عدل و انصاف اور امن و امان کا اظہار کر دینا اور خدا و رسول کے پڑوسیوں کی حالتِ زار دکھا دینا مجھپر اسلیے واجب تھا کہ عازمین حج کہیں اُن بے بنیاد افواہوں سے جو حجاز کی بدامنی وغیرہ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں متاثر ہو کر سفرِ حج کا ارادہ فسخ نہ کر دیں۔ اور مسلمان اپنے مقدس شہروں کے رہنے والوں سے بیخبر نہ رہیں۔ اسکے سوا نہ تو اُن مضمونوں میں وہابیوں کے عقائد کے متعلق میں نے کوئی بات کہی اور نہ شیعہ سُنیوں کے خلافِ مذہب کوئی حرف زبان سے نکالا۔ پھر بھی اُمتتِ مرحومہ کے بہت سے افراد مجھے وہابیانہ خیالات کا اشاعت کرنے والا اور وہابی مذہب کا داعی کہنے لگے۔ میرے لیے وہابی کا لقب اگرچہ بالکل ناموزوں ہے تاہم میں اسکا برا نہیں مانتا۔ مگر میرے وہابی دوستوں کو یہ بات ناگوار گزر رہی ہے کہ مجھ جیسے شخص کو

ان کے گروہ میں شریک کیا جا رہا ہے۔

میرے وہابی ثابت کرنے کیلیے یہ چار دلیلیں پیش کیجاتی ہیں۔

(الف) میں نے ایسے وقت میں جبکہ حجاز پر وہابیوں کی حکومت ہے مسلمانوں کو حج و زیارت کی ترغیب دی۔

(ب) میں نے اپنے مضمونوں میں نہ کہیں ہز مجسٹی سلطان ابن سعود پر تبرا پڑھا۔ نہ اہل نجد کو گالیاں دیں بلکہ نجدی حکومت کے انتظام کی تعریف کی۔

(ج) سلطان ابن سعود نے مجھے خلعت عنایت فرمایا۔

(د) سلطان نے میری اسلامی خدمات پر بذریعہ فرمان اظہار مسرت فرمایا۔

الزام اول کا مطلب یہ ہے کہ جبتک حجاز پر نجدی حکومت قائم ہے اُس وقت تک نہ حج واجب ہے نہ زیارت مستحب۔ بیت اللہ و بیت الرسول کو دور ہی سے سلام۔ اس کا شافی جواب میرا رسالہ " مدینے والوں کا ایک پیغام " ہے۔

امر دوم کی نسبت عرض ہے کہ اس فقیر کی عادت رہی ہے کہ اپنی تالیفات میں قطع نظر اہل اسلام کے غیر مسلم بزرگوں اور پیشواؤں کا ذکر بھی ادب و تعظیم سے کرتا ہے۔ مضامین شایع شدہ میرے سفرنامے کے اجزا ہیں اور تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں اس سفرنامے کو سفرنامہ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ مناظرہ کی کتاب بنانا نہیں چاہتا۔ اگر میں طریقۂ وہابیہ کی تائید یا تردید میں کچھ لکھتا یا اہل نجد کو بُرا بھلا کہتا تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی دوسرا فریق اُسکا جواب دیتا اور پھر جواب الجواب کی نوبت آتی۔ یہاں تک کہ ادھر سے رد الجواب لکھی جاتی اُدھر سے رد الجواب اور پھر نہ معلوم یہ سلسلہ کہاں جاکر ختم ہوتا۔ علاوہ ازیں کسیکو کافر و ملعون قرار دینا اُن بزرگوں کا منصب ہے جنکی شان میں یہ وارد ہوا ہے۔

کافر بنا بنا کر اُمت کو چھانٹ ڈالا
اسلام ہے فقیہو ممنون بہت تمھارا
حالی

میں بے بضاعت نہ اتنی لیاقت رکھتا ہوں نہ اتنی جرأت۔ میں اتحاد اسلامی کا متمنی ہوں اور مسلمانوں میں اختلافات بڑھانا گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں۔

امر سوم و چہارم کی حقیقت یہ ہے کہ ۱۳۴۵ھ میں جب میں مکہ معظمہ میں تھا تو ایک مرتبہ جلالتہ الملک ہز مجسٹی سلطان ابن سعود کے دربار میں بھی باریاب ہوا تھا۔ سلطان نے میری اُن خدمات کا ذکر سُنا تھا جو میں نے بذریعہ نظم و نثر و لکچر و تقریر ہندوستان میں انجام دی تھیں ۵۱ نیز میری تالیفات تاریخ حجر اسود۔ برکھارٹ کے سفرنامہ حجاز کا ترجمہ۔ حجاز کے فرنگی سیاح اور تاریخ غلاف کعبہ ۵۲ وغیرہ کی کیفیت اُنکو معلوم ہوئی تھی۔ اسی بنا پر سلطان نے اپنے انڈین سکرٹری مولانا سید اسمٰعیل غزنوی کے ذریعہ سے طلائی کام کی ایک اُونی عبا مجھے عنایت فرمائی جو سکرٹری صاحب ممدوح نے بذریعہ نیم سرکاری میرے پاس پہنچا دی۔ اسکے بعد جب میں حیدرآباد واپس آگیا تو یہاں سلطان کا فرمان مجھے ملا۔

۵۱۔ اِن خدمات کے ضمن میں دو چیزوں کا ذکر کردینا کافی ہے۔ ایک انجمن اصلاح خیالات حیدرآباد۔ دوسری انجمن ہدایت الاسلام دہلی۔ (۱) سنہ ۱۹۰۵ء میں اس فقیر اور اس کے ہم خیال بعض احباب نے مسلمانوں کے تمدنی اصلاح کی غرض سے بمقام بازار عیسیٰ میاں واقع حیدرآباد دکن "انجمن اصلاح خیالات" قائم کی تھی۔ یہ درویش اس انجمن کا سب سے پہلا پریسیڈنٹ اور ممبر انتظامی تھا۔ محکمہ تعلیمات نے ہائی اسکول رزیڈنسی اس کے لیے وقف کردیا تھا۔ ہر جمعہ کو اسکے جلسے ہوا کرتے تھے جن میں تقریریں کی جاتی تھیں۔ لکچر دیے جاتے تھے اور مضامین نظم و نثر پڑھے جاتے تھے۔ یہ گنہگار ان جلسوں میں خاص طور پر حصہ لیتا تھا۔ انجمن مذکور کوئی پانچسال تک اپنا کام کرتی رہی۔

(۲) انجمن ہدایت الاسلام سنہ ۱۹۰۸ء میں بمقام دہلی و آگرہ قائم ہوئی تھی۔ اس کا اہم مقصد تحفظ اسلام اور دیہاتی مسلمانوں کو آریہ ہونے سے روکنا تھا۔ انجمن مذکور کی دعوت پر اس فقیر نے ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۰۸ء میں ارکین و واعظین انجمن کے ایک وفد کے ساتھ مضافات آگرہ میں دورہ کیا اور بمقام صالح نگر۔ساندھن و فتحپور بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں دور دور کے دیہاتی جمع ہوئے تھے اُن کو سمجھانے کے خیال سے اس فقیر نے بزبان بھاشا لمبی چوڑی تقریریں کی تھیں۔ نیز آگرہ کے مختلف محلوں میں بھی انجمن کی طرف سے جلسہ ہائے وعظ منعقد ہوئے تھے اُن میں بھی یہ گنہگار اظہار خیالات کرتا رہا۔ اس فقیر کی تقریروں کے اثرات و نتایج کا ذکر اخبار مفید عام آگرہ مطبوعہ ۲۰ جون ۱۹۰۸ء میں کسی قدر تفصیل کیساتھ شایع ہوا ہے۔

۵۲۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ سلطان کے حکم سے اس کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا ہے۔

(سکرٹری صاحب معتمد کی نیم سرکاری اور فرمان کی نقول علحدہ درج کیجاتی ہیں۔
سلطان ابن سعود کی قدر شناسی کیساتھ یہاں کے مسلمانوں کی ناقدری بھی قابل داد ہے
جنھوں نے میری اس خطا پر کہ میں نے عہد نجدی میں حج و زیارت کی ترغیب دی مجھکو
وہابی سمجھ لیا۔ سبحان اللہ۔

من چہ می گفتم و یاراں چہ جوابم دادند
جرعۂ آب نہ دادند و سرابم دادند

عاشق گنبد خضرا و وہابی؟ ہیہات
طرفہ قومے است کہ ایں طرفہ خطابم دادند

منت۔ ایں راہزناں راکہ زراہ احسان
مال من جملہ ببردند و حسابم دادند[۱]

ہندوستان کے مسلمانوں کے نزدیک چونکہ اس وقت مسائل حجاز میں سب سے
زیادہ اہم مسئلہ حجاز کے مزارات و مقابر کا ہے جن کے قبوں کے انہدام پر یہاں کے
بہت سے مسلمان حکومت نجد سے بیزار ہو گئے ہیں اور ہر شخص ان مزاروں کے
حالات معلوم کرنے کا شائق نظر آتا ہے اس لیے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ بغرض انکشاف
حقیقت و اظہار واقعات مزارات حرمین کی ایک جامع و مفصل تاریخ مسلمانوں کے
سامنے پیش کردوں۔

؎۱ یہ میری ایک غزل ہے جس کے باقی اشعار یہ ہیں۔

جلوۂ کعبہ و دیدار حریم نبوی
نعمتے بود کہ در عالم خوابم دادند

ساحل بحر جہاں را ہمہ طوفاں دیدم
چشم دادند ولے چشم حبابم دادند

بسکہ بگریختم از صحبت واعظ شبیر
سبق وعظ ہم از چنگ و ربابم دادند

چونکہ یہ تالیف مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے مشہور و متبرک قبرستانوں کی تاریخ ہے اسلیے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب سے حرمین کے مزارات کی گزشتہ حالت انکے عہد بعہد تغیر و تبدل کی کیفیت اور ان کی موجودہ صورت ظاہر ہوگی۔ اس کی ترتیب میں اس امر کی کوشش کیگئی ہے کہ مزارات حرمین کے متعلق کوئی ضروری و اہم سچا واقعہ رہ نہ جائے اور اس کے دیکھنے کے بعد حرمین کے مقبروں کے متعلق کسی تاریخ یا سفرنامے کے دیکھنے کی حاجت باقی نہ رہے۔ میں نے اس تالیف میں عربی۔ فارسی۔ انگریزی اُردو کی متعدد کتابوں سے مدد لی ہے جن کے حوالے موقع بموقع دیدیے ہیں اور انمیں سے بعض کی صراحت علیحدہ بھی کر دی ہے[1]۔ میں نے حتی الامکان اپنی رائے ظاہر کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ البتہ جو حالت میں نے ان مقبروں کی ذیحجہ ۱۳۴۵ھ میں بچشم خود دیکھی وہ بلاکم وکاست لکھدی ہے۔

اس تالیف میں اگرچہ واقعات و روایات کو تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا ہے مگر ایک کسر رہگئی وہ یہ کہ میں نے اس مسئلہ پر بحث نہیں کی کہ وہابی پختہ قبروں کو کیوں ناپسند کرتے ہیں اور قبوں کو منہدم کرنے سے ان کی کیا غرض ہے۔ جو صاحب اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ کسی وہابی سے دریافت کرلیں یا اپنے پیر و مرشد و قبلہ و کعبہ سے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اس کتاب میں گو طرفداری و تعصب سے مطلق کام نہیں لیا ہے اور اس تالیف سے میرا مقصد کسی کی دلجوئی یا دل شکنی ہرگز نہیں ہے تاہم مجھے اندیشہ ہے کہ میرے ناراض دوست اس کے مطالعہ کے وقت بھی

---

[1] میں نے اس مضمون کو زیر عنوان "ماخذ تالیف" آیندہ صفحات میں درج کیا ہے اور ماخذات کی فہرست میں نام مؤلف و سنہ تالیف اور بعض جگہ مقام طبع و نام مطبع بھی درج کیا ہے۔ اسکے متعلق اگر ناظرین کوئی امر معلوم کرنا چاہیں تو براہ کرم کتاب مطبوعہ کے سنہ طبع و مقام طبع کو بھی ملحوظ رکھیں۔

قیافہ شناسی کے حسب ذیل اصول کو ضرور ملحوظ رکھینگے۔

صوفی ہوٹل میں اگر جائے شرابی سمجھو
گوشت کا نام لے بنیا تو کبابی سمجھو

جن کی الماری میں رکھی ہوئی دیکھو انجیل
اُن مسلمانوں کو کفّارِ کتابی سمجھو

عہدِ نجدی میں جو دے حج و زیارت کی صلاح
پیرزادہ بھی اگر ہے تو وہابی سمجھو (شبیر)

(ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ)

پیرزادے ہیں یا نہیں اللہ معلوم
مگر دجال ضرور ہیں

[illegible] 12/4/96

فقیر الی اللہ

علی شبیر

سر رشتہ دار انتظامی
ہائیکورٹ حیدرآباد دکن

عطائے عبا کے متعلق ہز مجسٹی سلطان ابن سعود کے معتمد خاص عالیجناب حاجی مولوی سید اسماعیل صاحب غزنوی امرتسری کی تحریر یکاری

مونوگرام
بخط عربی وانگریزی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم محترم جناب حاجی مولوی علی شبیر صاحب بالقابہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جلالۃ الملک عبد العزیز آل سعود ملک الحجاز والنجد وملحقاتہا نے آپ کیلیے ایک عربی چُغہ جو اُن کے اپنے مُلک کا بنا ہوا ہے عنایت فرمایا ہے کہ اُن کی طرف سے آپ کے پاس بطور برادرانہ تعلقات کے یادگار رہے۔ میں اسکو پیش کرنیکا فخر حاصل کرتا ہوں۔ اُن کا دستخطی عنایت نامہ دوسری ڈاک میں انشاءاللہ آپ کو پہنچ جائیگا۔

آپکا

اسماعیل غزنوی کان اللہ

محرم الحرام ۱۳۴۶ھ ہجری

هز مجسٹی جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمن آل فیصل ابن سعود بادشاہ حجاز کا **فرمان** اِس فقیر کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المملکۃ الحجازیۃ والنجد وملحقاتہا

عدد (٦٠٦) فی ۱۳۴۲ھ

من عبد العزیز ابن عبد الرحمن آل فیصل

الی حضرت جناب الاجل المحترم الشیخ علی شبیر

سررشتہ دار انتظامی عدالت عالیہ حیدر آباد دکن شبیر حفظہ اللہ

بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ثم الداعی

لتحریرہ۔ قد بلغنا نصرکم للحق ورغبتکم فی صلاح المسلمین

واعلاء کلمۃ الدین وسررنا من ذالک غایۃ

ونرجو الله ان يوفقنا وإياكم لما فيه خير الإسلام
والمسلمين وينصر دينه وكتابه ويعلي كلمته
ويجعلنا وإياكم من أنصاره. وعن أخبار طرفنا فهي
من فضل الله ساكنة ولم أجد ما يجب الذكر إلا
دوام الخير والعافية. هذا ما لزم بيانه
والله يحفظكم والسلام.

٢٢ ربيع (١) سنة ١٣٤٦

ملحق خير وسرور إن شاء الله

ثم حسب داعي الوداد وعقد روابط وحسن الذكرى
يصلكم مع الشيخ اسماعيل الغزنوي بشت من الملبوس
العربي الجيد. إن شاء الله ملبوس العافية.

ترجمہ فرمان ہز مجسٹی سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن آل فیصل[1] ابن سعود بادشاہ حجاز و نجد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المملکۃ الحجازیۃ و النجد و ملحقاتھا

عدد (۶۰۶) ۱۳۴۲

منجانب عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن آل فیصل
بخدمت جناب شیخ بزرگ و محترم علی شبیر
سررشتہ دار انتظامی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن شہیر
اللہ تعالیٰ آپکو اپنی حفاظت میں رکھے۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ باعث تحریر ہذا یہ کہ ہمکو یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ آپکو حق کی تائید، مسلمانوں کی بھلائی اور کلمۂ دین کے بلند کرنیکا بڑا خیال ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکو اور ہمکو ایسے کاموں کی توفیق عطا فرمائے گا جنمیں دین اسلام کی فلاح اور مسلمانوں کی بہتری ہو۔ اللہ اپنے دین اور کتاب کی مدد فرمائے اپنے کلمے کو بلند کرے اور آپ اور ہمکو اپنے دین کی نصرت کرنیوالوں میں شامل فرمائے۔

بفضلہ تعالیٰ ہم خیریت سے ہیں۔ کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپکو آفتوں سے محفوظ رکھے۔ خیر و خوبی آپ کے شامل حال ہو۔

مہر سلطان

بطور یادگار محبت و رابطہ اتحاد و ذکر خیر ایک عمدہ عبائے عربی بذریعہ شیخ اسماعیل غزنوی آپ کے پاس پہنچیگی جو انشاء اللہ آپ کیواسطے لباس عافیت ہوگی۔

[1] موجودہ سلطان حجاز چونکہ امیر سعود کے فرزند فیصل کی اولاد میں ہیں اسوجہ سے انکو آل فیصل کہتے ہیں اور سعود کی نسبت سے وہ ابن سعود یا آل سعود بھی کہلاتے ہیں

ماخذ تالیف

کتاب مزارات حرمین کی تالیف میں اگرچہ مجھے سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی لیکن یہاں چند کتابوں کے نام جن سے بطور خاص مدد لیگئی یا جن کا اس تالیف میں کہیں حوالہ دیا گیا ہے تحریر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے مکرم دوست حاجی مولوی عبد المحیط خاں صاحب منشی فاضل مددگار مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کا ممنون ہوں کہ اُن کی وجہ سے بعض نایاب کتابوں کے دیکھنے کا مجھے موقع ملگیا

(الف) وہ کتابیں جنسے تالیف میں خاص مدد لیگئی

(۱) اخبار مکہ للازرقی۔ عربی۔ تالیف ابی الولید محمد بن عبد اللہ الازرقی مطبوعہ لپزک واقع جرمنی ۱۸۵۸ء۔ یہ کتاب تواریخ مکہ معظمہ میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ گو صحیح طور پر اسکا سن تالیف معلوم نہیں ہوتا مگر غالباً یہ تیسری صدی ہجری کے آخر میں تالیف ہوئی ہے۔

(۲) خلاصہ شفاء الغرام باخبار بلد الحرام۔ عربی۔ مولفہ تقی الدین محمد بن احمد الفاسی تالیف ۸۲۹ھ ہجری مطبوعہ لپزک واقع جرمنی ۱۸۵۱ء۔

(۳) خلاصہ تاریخ مکہ۔ عربی۔ مؤلفہ ابی عبد اللہ محمد بن اسحاق الفاکہی تالیف ۲۸۰ھ ہجری مطبوعہ لپزک جرمنی ۱۸۵۹ء۔

(۴) الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ عربی۔ مؤلفہ قطب الدین مکی تالیف ۹۸۵ھ ہجری مطبوعہ مطبع عامرۃ العثمانیہ قاہرہ۔

(۵) جامع اللطیف فی فضل مکہ و اہلہا و بناء البیت الشریف۔ عربی۔ مؤلفہ جمال الدین محمد جار اللہ بن محمد نور الدین ابن ظہیرہ۔ تالیف ۹۱۰ھ ہجری مطبوعہ

مطبع دار احیاء الکتب مصر۔

(۶) **وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ** ۔ عربی ۔ مؤلفہ سید نور الدین علی سمہودی تالیف سنہ ۸۸۸ ہجری مطبوعہ مطبع الآداب والموید مصر ۔ تواریخ مدینہ منورہ میں یہ کتاب سب سے زیادہ مستند ہے اور دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے ۔

(۷) **خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ** ۔ عربی ۔ تالیف سید سمہودی ۔ مطبوعہ مطبع المیریۃ الکائنہ مکہ ۔ یہ کتاب وفاء الوفا کا خلاصہ ہے جو بعد اصلاح و ترمیم و اضافہ سید موصوف نے سنہ ۸۹۳ میں مرتب کیا ۔ اس کا حجم بھی کوئی پانسو صفحے ہے ۔

(۸) **جذب القلوب الی دیار المحبوب** ۔ فارسی ۔ مولفہ مولوی شیخ عبد الحق محدث دہلوی تالیف سنہ ۱۰۰۱ ہجری

(۹) **نزھۃ الناظرین فی مسجد سید الاولین والآخرین** ۔ عربی ۔ مؤلفہ سید جعفر ابن سید اسمٰعیل المصری البرزنجی مفتی شافعیہ مدینہ ۔ مرتبہ سنہ ۱۲۸۷ھ و مرمجہ سنہ ۱۲۹۲ھ مطبوعہ مطبع جمالیہ مصر ۔

(۱۰) **احیاء العلوم** ۔ عربی ۔ مؤلفہ امام محمد غزالی ۔ تالیف سنہ ۴۸۷ھ مطبوعہ مصر ۔ یہ اخلاق کی کتاب ہے جس میں ایک باب مدینہ منورہ کی زیارت کے متعلق ہے ۔

(۱۱) **سفرنامہ محمد ابن جبیر اندلسی** ۔ عربی ۔ تالیف سنہ ۵۸۰ھ مطبوعہ گوٹنگن واقع جرمنی سنہ ۱۸۵۸ء

(۱۲) **سفرنامہ برکھارٹ** ۔ انگریزی ۔ تالیف سنہ ۱۸۱۴ء ۔ یورپ کے مشہور سیاح عرب ابراہیم ابن عبد اللہ عرف برکھارٹ کا سفرنامہ حجاز ۔ اس کا ترجمہ اُردو میں اس فقیر نے کیا ہے ۔ جس کی ایک جلد حیدرآباد کے مطبع تاج پریس میں شائع ہوئی ہے ۔

(۱۳) **سفرنامہ برٹن** ۔ انگریزی ۔ تالیف سنہ ۱۸۵۳ء ۔ انگلستان کے مشہور سیاح کپتان برٹن کا سفرنامہ حجاز جو دو جلدوں میں شائع ہوا ہے ۔

(۱۴) **السکینہ باخبار مدینہ** ۔ مولفہ مولوی صبغۃ اللہ صاحب مترجم عدالت خفیفہ مدراس تالیف سنہ ۱۲۲۹ھ ۔

(ب) وہ کتابیں جنکا اس تالیف میں کہیں کہیں حوالہ دیا گیا ہے

(۱) مراۃ الحرمین ۔ عربی ۔ تالیف ۱۳۲۵ھ مطبوعہ دارالکتب مصریہ قاہرہ ۔ یہ کتاب جنرل ابراہیم رفعت پاشا مصری کا سفرنامہ ہے جو دو ضخیم باتصویر جلدوں میں شایع ہوا ہے ۔

(۲) سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ تالیف ۷۲۶ھ ۔ (عربی ۔ اُردو)

(۳) صبح الاعشیٰ فی فن الانشا ۔ عربی ۔ مطبوعہ مصر ۔ تالیف ۸۱۴ھ ۔ مولفہ ابی العباس احمد القلقشندی ۔ یہ کتاب (۱۴) ضخیم جلدوں میں شایع ہوئی ہے ۔ اسکی جلد چہارم میں مدینۂ منورہ کے کچھ حالات درج ہیں ۔

(۴) روزنامچۂ سیاحت ۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم تالیف ۱۳۲۹ھ ۔ اس میں مدینۂ منورہ کے حالات بھی ہیں ۔

(۵) سفرِ حرمین ۔ اُردو ۔ خان بہادر حاجی عبدالرحیم صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنگلور کا سفرنامہ ۔ تالیف ۱۳۲۹ھ ۔

(۶) رفیق الحجاج ۔ اُردو ۔ سفرنامہ ڈاکٹر نور حسین صاحب صابر تالیف ۱۳۲۵ھ ۔

(۷) وکیل الغربا ۔ اُردو ۔ سفرنامۂ حج سید وزیر حسین صاحب جج رائے بریلی تالیف ۱۳۰۲ھ

(۸) کلید باب الحج ۔ مولفہ حاجی سید انور علی تالیف ۱۲۸۱ھ ۔

(۹) سیاحت حرمین ۔ اُردو ۔ سفرنامۂ حاجی دلدار علی صاحب وکیل حیدرآبادی تالیف ۱۳۱۰ ہجری ۔

(۱۰) سفرنامۂ حجاز ۔ مرزا عرفان علی بیگ صاحب ڈپٹی کلکٹر بستی تالیف ۱۳۱۱ھ ۔

(۱۱) مرآۃ العرب ۔ اُردو ۔ سفرنامۂ نادر علی صاحب وکیل میرٹھ ۱۳۲۰ھ ۔

(۱۲) الہاد الی سبیل الرشاد ۔ سفرنامۂ حج قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری تالیف ۱۳۴۲ھ ۔

(۱۳) صراط الحمید ۔ سفرنامہ الحاج مولوی محمد الیاس صاحب برنی ۔ ایم اے پروفیسر

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

(۱۴) مقصود المومنین فی بیان فضائل بلد الامین۔ مولفہ محمد اکرام الدین صاحب تالیف سنہ ۱۳۱۲ھ۔

(۱۵) سفرنامہ حرمین۔ مولفہ مولوی محی الدین حسین صاحب ساکن ویلور تالیف سنہ ۱۳۲۲ھ۔

(۱۶) مروج الذہب۔ عربی۔ مطبوعہ مصر مولفہ علی بن حسین مسعودی تالیف سنہ ۳۳۶ھ۔

(۱۷) مسئلہ حجاز۔ یعنی رپورٹ وفد خلافت کمیٹی سنہ ۱۹۲۶ء مرتبہ مولوی محمد علی صاحب و مولوی شوکت علی صاحب و مسٹر شعیب وغیرہ۔

(۱۸) حیات القلوب۔ فارسی۔ حالات حضور سرور عالم مولفہ ملا باقر صاحب مجلسی۔

(۱۹) تاریخ ابن خلکان۔

(۲۰) تاریخ ابو الفدا۔

(۲۱) تاریخ ابن خلدون۔

(۲۲) تاریخ ابن اثیر۔

(۲۳) تاریخ الخلفا۔ مولفہ جلال الدین سیوطی۔

(۲۴) کریڈل آف اسلام۔ (گہوارۂ اسلام) مولفہ پادری زویمر صاحب تالیف سنہ ۱۸۹۸ء۔

(۲۵) ناسخ التواریخ۔

مزاراتِ حرمین

بابِ اوّل

مکۂ معظمہ کے مشہور قبرستان

فصل اوّل

جنّتُ المعلّیٰ

(۱) معلّیٰ کی اجمالی حالت

معلّیٰ کے معنی بلند کے ہیں۔ شہر مکۂ معظمہ کا وہ حصّہ جو بیت اللہ سے شمال کی طرف واقع ہے اور جس میں بیت اللہ سے لگا کر کوئی پون کوس تک بتدریج چڑھاؤ ہوتا چلا گیا ہے۔ اسگلے

زمانہ میں اس سب کو معلیٰ کہتے تھے۔ ازرقی نے معلیٰ کے جو حدود بیان کیے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ اس سطح مرتفع کی حد مشرق میں جبل ابوقبیس تک اور جنوب میں جبل قعیقعان تک چلی گئی ہے اور ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں جس قدر علاقہ ہے وہ سب معلیٰ میں داخل ہے۔ اس کے برعکس مکۂ معظمہ کا نشیبی حصہ مسفلہ کہلاتا ہے۔ (اخبار مکہ عربی مطبوعہ جرمنی ص ۴۷۲)

حج کے بعد جب طوافِ زیارت کے لیے میں منیٰ سے گدھے پر مکۂ معظمہ آیا تو میں نے اچھی طرح محسوس کیا کہ میرا گدھا تھوڑی دور تک معمولی چال سے چلتا رہا لیکن جنت المعلیٰ کے

۱۔ ابوقبیس مکۂ معظمہ کے جنوب میں شہر کے اندر ایک پہاڑ ہے۔ بیت اللہ کے باب صفا سے نکلکر سڑک کو عبور کرتے ہی اس کی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ بیت اللہ سے چوٹی تک کوئی ایک میل ہو گا۔ چڑھنے کا راستہ صاف نہیں ہے۔ اچھلتے کودتے اوپر پہنچتے ہیں۔ تاہم اس پہاڑ پر آبادی ہے۔ جا بجا مکان بنے ہوئے ہیں اور گھوڑے اونٹ وغیرہ بھی یہاں آ ہی جاتے ہیں۔ چائے اور پانی وغیرہ کی مختصر دکانیں بھی دو تین ہیں بعض بڑے بڑے مکانات بھی یہاں دیکھنے میں آئے۔ چنانچہ افریقہ کے مشہور شیخ سنوسی جو ۱۳۴۵ھ میں حج کو آئے تھے وہ اسی پہاڑ پر ایک مکان میں اپنے ہمراہیوں سمیت مقیم تھے۔ میں نے بھی اُن سے ملاقات کی تھی۔ جس کمرے میں وہ مجھ سے ملے بہت وسیع تھا۔ رئیس الشیبیین حضرت شیخ عبدالکریم سے بھی میری پہلی ملاقات اسی پہاڑ پر ہوئی تھی اُن کا مکان بھی اچھا خاصہ تھا۔ ابوقبیس پر ایک مسجد بھی ہے جس میں کئی سو آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ بعض تاتاری حاجیوں کو میں نے دیکھا کہ وہ یہاں پتھروں میں جا بجا ٹھہر گئے تھے۔ اس پہاڑ سے شہر اور بیت اللہ کا منظر نہایت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ خانۂ کعبہ کی چھت بھی یہاں سے پوری نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ معجزۂ شق القمر اسی پہاڑ پر ہوا تھا جس کی یادگار میں یہاں ایک قبہ بنا ہوا تھا جو اہلِ نجد نے توڑ دیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس پہاڑ پر بہت سے نبیوں کی قبریں ہیں۔

۲۔ بیت اللہ سے جنت المعلیٰ کو جاتے وقت جو پہاڑی سلسلہ بائیں جانب نظر آتا ہے اُسے جبل قعیقعان کہتے ہیں۔ یہ کچھ زیادہ بلند نہیں ہے آبادی اس میں بھی بکثرت ہے۔ محلۂ معلیٰ اور حجون اسی میں واقع ہے۔

۳۔ کعبے کے گرد پھرنے کو طواف کہتے ہیں۔ ہر طواف میں سات چکر کئے جاتے ہیں۔ ہر چکر کی دعا علٰحدہ ہے طواف کی پانچ قسمیں ہیں۔ مکۂ معظمہ میں داخل ہونے کے بعد جو طواف کیا جاتا ہے اُسے (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۳)

قریب پہنچ کر کچھ اپنے اڈّے پر پہنچنے کی خوشی میں اور کچھ آثار کی وجہ سے بگٹٹ دوڑنے لگا۔[لے]
مکۂ معظمہ کا مشہور قبرستان جنت المعلیٰ اسی بلند حصّے میں واقع ہے اور اب معلّیٰ کا لفظ مخصوص اسی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اسی سبب سے یہاں کی آبادی کو بھی محلہ معلّیٰ کہنے لگے ہیں۔ قبرستانِ معلیٰ بیت اللہ سے کوئی ڈیڑھ میل ہے۔ پیدل چلیں تو آدھ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔ حرم سے معلیٰ تک مسلسل آبادی چلی گئی ہے اور سڑک کے دونوں طرف دکانات و مکانات ہیں[۱۲]۔ جنتُ المعلیٰ کی نسبت آنحضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ :-

(بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گزشتہ)

طواف القدوم کہتے ہیں۔ دوسرا طواف الزیارت ہے۔ حاجی عرفات سے واپس ہو کر منیٰ میں دس گیارہ بارہ ذی الحجہ تین دن قیام کرتے ہیں ان تاریخوں میں سے کسی دن منیٰ سے مکے آکر یہ طواف کیا جاتا ہے۔ دس ذی الحجہ کو افضل ہے۔ تیسرا طواف تکمیل مناسک عمرہ کے لئے کیا جاتا ہے اسے طواف عمرہ کہتے ہیں۔ چوتھا طواف نفل ہے جس کے لئے کوئی وقت معین نہیں ہے جب چاہیں اور جتنی بار چاہیں کر سکتے ہیں۔ دوسروں کی طرف سے بھی یہ طواف کر دیا جاتا ہے۔ پانچواں طواف وداع ہے جو مکۂ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت کیا جاتا ہے اس کا نام طواف صدر بھی ہے۔

[لک]۔ منیٰ مکۂ معظمہ سے ڈیڑھ کوس ہے، پہاڑوں کے بیچ میں واقع ہے۔ یہاں ایک گلی میں دورویہ کچھ مکان دومنزلہ بنے ہوئے ہیں جو صرف زمانۂ حج میں آباد ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کی ضروری اشیاء کا بازار لگ جاتا ہے۔ عرفات جاتے وقت آٹھویں ذی الحجہ کو ایک رات منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے اُس کے بعد عرفات سے واپس ہو کر تین دن ٹھہرتے ہیں قربانی۔ رمی الجمرات (شیاطین پر کنکریاں مارنا) اور حجامت وغیرہ مناسک یہاں ادا کیے جاتے ہیں۔

[لے]۔ حجاز کے گدھے بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور ایسے سدھے ہوئے کہ اُن کے ساتھ مالک کے رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گدھے والا کرایہ پہلے لیکر سواری کو بٹھا دیتا ہے اور ایک قمچی مار کر گدھے کو بڑھا دیتا ہے۔ گدھا آگے کی منزل پر یا اپنے اڈّے پر پہنچکر ٹھہر جاتا ہے۔ گدھے والے کی ہدایت یا کوئی اور شخص سوار سے کہہ دیتا ہے اب یہاں سے پیدل چلے جاؤ۔ مکے میں شعب بنی عامر کے پاس گدھوں کا اڈا ہے منیٰ کے سوار یہیں اترتے ہیں۔ حجاز میں گدھوں پر زین بہت اچھا کس دیا جاتا ہے مگر نہ لگام ہوتی ہے اور نہ رکاب۔ صرف ایک رسّی گردن میں (بقیہ مضمون برصفحہ ۸)

اس کا ہر شخص ... اور ... ۔۔۔

سب مقبروں میں اچھا مقبرہ اہل مکہ کا ہے اس میں جو دفن ہوا اُس کو نجات ملی۔
(اخبار مکہ و الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام)

مقبرہ معلیٰ زمانۂ جاہلیت سے اس وقت تک اہل مکہ کا قبرستان چلا آرہا ہے۔ اس کی لمبائی کوئی پانسو گز۔ چوڑائی دو سو گز اور دور کوئی ایک میل ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس کے کئی حصے تھے جن کے نام یہاں کی وادیوں۔ کوہستانی نشیب و فراز اور دوسری خصوصیات کی وجہ سے جدا جدا تھے اور شعب[1] بنی ہاشم۔ شعب[2] ابی دُب۔ شعب الصفی ثنیۃ[3] الاذاخر و حایط[4] خرمان وغیرہ کے نام سے موسوم تھے، ان مقامات پر مختلف خاندانوں کی ہڑواڑیں تھیں۔

جنت المعلیٰ کا قدیمی نام صرف معلیٰ یا مقبرہ معلیٰ ہے۔ مورخین مکہ اسی نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن جبیر و ابن بطوطہ نے اس کو جبانۂ معلیٰ لکھا ہے۔ جبانہ کے معنی میدان یا جنگل کے ہیں

(بقیہ مضمون حاشیہ صد۳)

بندھی ہوتی ہے۔ سوار اُسے پکڑ لیتا ہے اور جب موڑنا چاہتا ہے تو گدھے کی گردن پر آہستہ سے تھپی مارتا ہے۔

۵۔ معلیٰ سے تھوڑی دور ادھر شریف مکہ کا ایک عالیشان محل ہے جو اب سلطان ابن سعود کے قبضے میں ہے رات کو اس میں برقی روشنی ہوتی ہے اور لوگوں کے بھی بڑے بڑے مکان یہاں ہیں معلیٰ سے متصل ایک بہت بڑا چائے خانہ ہے جس کے وسیع میدان میں مسافروں کے آرام کے لئے سینکڑوں چارپائیاں پڑی رہتی ہیں۔ گرمی کے دنوں میں رات کے وقت یہ مقام ایک نعمت ہے۔ آدھ آنہ کی پانی کی صراحی یا دو آنے کی چائے لے کر چارپائی پر یہاں گھنٹوں بیٹھ سکتے ہیں۔ آٹھ آنے میں ایک چارپائی سونے کے لئے اور دو صراحی پانی وضو وغیرہ کے لئے مل جاتا ہے۔ موسم گرما میں جو حاجی بند مکانوں کی برداشت نہ کر سکتے ہوں وہ اس چائے خانے کو اپنا ٹھکانا بنالیں۔

[1] معلیٰ کا وہ حصہ جہاں کفار قریش کے مظالم سے تنگ آکر آنحضرت اور بنی ہاشم کچھ دنوں کے لئے جا رہے تھے۔ [2] ابی دُب قبیلۂ بنی سوات کا کوئی شخص یہاں رہتا تھا۔ جنگ صفین کے مشہور حَکَم ابو موسیٰ اشعری نے بھی زندوں سے بیزار ہو کر مُردوں کے پڑوس میں یہاں مکان بنا لیا تھا اور کہا کرتے تھے کہ اب میں ایسی قوم کے پاس آرہا ہوں جو میرے فیصلہ پر ناراض نہ ہوگی۔ [3] ثنیہ ٹیلے کو کہتے ہیں۔ اذخر خوشبودار گھانس۔ اذاخر اس کی جمع ہے۔ [4] حایط خرمان۔ کھجور کے درختوں کی باڑ۔

مراد اس سے گورستان لی جاتی ہے۔ زمانۂ حال کے بعض مصری سیاحوں نے بھی جبانۂ معلے کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اہلِ ہند اس کو جنت المعلیٰ کہتے ہیں اور یہ لقب غالباً چودھویں صدی ہجری کی ایجاد معلوم ہوتا ہے۔ عام اہل مکہ اسے "جنت المالا" کہتے ہیں۔ میں نے بعض پڑھے لکھوں کو بھی یہی کہتے سنا اور جب اُن سے کہا کہ اس کا صحیح نام جنت المعلیٰ ہے تو جواب دیا کہ وہ کوئی دوسرا قبرستان ہوگا یہ تو جنت المالا ہی ہے۔

معلیٰ کے مدفونین میں بہت سے صحابہ و تابعین و تبع تابعین و علما و صلحا وغیرہ ہیں مگر ان کے مزارات یا تو بالکل ہی لاپتہ ہیں یا بجز معدودے چند کے سب مشتبہ۔

۱۳۴۴ھ تک جنت المعلیٰ میں صرف چار پانچ قبے تھے جو حضرت عبد مناف و حضرت عبد المطلب و حضرت ابی طالب و حضرت آمنہ و حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزاروں پر بنے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت قاسم ابن رسولؐ و حضرت قحافہ والد حضرت ابوبکرؓ و حضرت عبد الرحمٰن بن ابوبکرؓ و حضرت اسما بنت ابوبکرؓ و حضرت عبد اللہ ابن زبیرؓ و حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ وغیرہم کی قبریں ہیں جو مدت سے زیارت گاہ چلی آرہی ہیں اور ہر حاجی ان کی زیارت کرتا ہے۔

معلیٰ میں بعض امرا اور متمول اشخاص کی قبریں بھی ہیں جن کے گرد لکڑی کے کٹہرے یا پختہ چار دیواریاں کھچی ہوئی تھیں۔ مکہ معظمہ میں عموماً مستطیل شکل کی قبریں بناتے ہیں جن میں پتھر کی دو بڑی سلیں لمبائی میں اور دو چھوٹی سرہانے پائینتی جما دیتے ہیں اور ایک چھوٹا سا پتھر سرہانے کھڑا کر دیتے ہیں۔ قبروں کی اونچائی تقریباً ایک بالشت ہوتی ہے۔ بعض ترکوں اور مصریوں کی بلند و بالا پختہ قبریں دوسری وضع کی بھی ہوتی ہیں۔ کتبے کا رواج کم ہے۔

بتاریخ ۸ محرم ۱۲۱۸ھ مطابق مئی ۱۸۰۳ء جب مکہ پر پہلی مرتبہ وہابیوں[۵] کا قبضہ بسرکردگی امیر سعود

۵۔ وہابی مذہب کے بانی محمد ابن عبد الوہاب نجد میں بمقام عیینہ ۱۱۱۵ھ م ۱۶۹۱ء میں پیدا ہوئے تھے اُنھوں نے مذہبی تعلیم حنبلی طریق پر اپنے باپ سے پائی اس کے بعد حج کو گئے اور مدینۂ منورہ میں حدیث کی تکمیل کی۔ وہ تعظیم قبور اور اولیاء اللہ سے مدد طلب کرنے کو شرک و قبر پرستی و پیر پرستی سے تعبیر کرتے تھے اس کے علاوہ اور بھی بعض باتیں مسلمانوں میں اُن کو ایسی نظر آئیں جن کو وہ خلاف شرع سمجھتے تھے۔ شیخ نے ان رسوم کا قلع قمع کرنا چاہا۔ اُن کے اہلِ وطن اُن کے دشمن ہوگئے آخر بڑی جد و جہد کے بعد محمد بن سعود امیر نجد ان کا معتقد ہوگیا (بقیہ برص ۶)

ابن عبدالعزیز امیر نجد ہوا تو یہاں کی قبروں کے گنبد اور اونچی اونچی قبریں منہدم کردی گئیں۔

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ)۔ اور ۱۱۵۷ھ میں امیر نجد نے کتاب و سنت کی تلقین کے لئے اطراف و اکناف عرب میں اس مذہب کے داعی روانہ کئے۔ بعض جگہ اُن کی دعوت قبول کی گئی اور بعض مقامات پر خصوصاً حجاز میں اُن کی تکفیر کے فتوے دیے گئے اور عبدالوہاب کی مناسبت سے محمد بن عبدالوہاب کے پیرووں کو وہابی مشہور کیا گیا۔ جب ان لوگوں کو مخالفین طرح طرح کی ایذائیں دینے لگے اور اِن کے لئے حج کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیدیا تو ۱۱۵۹ھ میں شیخ نے اپنے معتقدین کو حکم دیا کہ

"جو لوگ افعالِ جاہلیت سے باز نہ آئیں اعلائے کلمۃ الحق میں رکاوٹ پیدا کریں
اور اہلِ حق کو ایذا پہنچائیں تو اُن سے مقابلہ و مقاتلہ کرو۔"

اس فتوے کے ساتھ ہی محمد بن سعود امیر نجد نے جنگ شروع کردی۔ بالآخر عرب کے مختلف علاقوں احساء، عمان۔ تہامہ۔ عسیر وغیرہ پر اُس کا تسلط ہوگیا۔ اور اُس کے عقیدے کے مطابق خالص توحید رائج ہوگئی۔

ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ میں محمد بن عبدالوہاب کا انتقال بمقام درعیہ (۹۲) برس کی عمر میں ہوگیا اور انہوں نے چار لڑکے اور کئی پوتے اپنی یادگار چھوڑے۔ محمد بن عبدالوہاب کی تصنیفات میں کتاب التوحید بہت مشہور کتاب ہے۔

محمد بن سعود نے لڑبھڑ کر آس پاس کے قبائل کو زیر کیا۔ ۱۱۷۹ھ میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا عبدالعزیز اوّل اس کا جانشین ہوا اُس نے بحرین وغیرہ پر قبضہ کیا اور اُس کے لڑکے سعود نے ۱۰ رجب ۱۲۱۶ھ کو کربلا فتح کرکے امام حسین علیہ السلام کے روضے کا گنبد ڈھایا۔ ۱۲۱۷ھ میں طائف فتح کیا۔ ۷ محرم ۱۲۱۸ھ کو مکہ فتح کرکے یہاں کے مزارات کے قبّے منہدم کردیے۔ ۱۲۱۹ھ میں مدینہ پر قبضہ کیا اور جنت البقیع کے قبّے مسمار کردیے ۱۲۲۱ھ میں سعود نے محمل مصری کو جلادیا اور اس کے بعد کئی سال تک مصر سے غلافِ کعبہ نہ آسکا سلطنتِ ترکی اُس وقت فرنگیوں کے نرغے میں گھری ہوئی تھی۔ اس طرف متوجہ نہ ہوسکی۔ آخر ۱۲۲۶ھ میں وہابیوں کے خلاف مہم بھیجنے کی تیاری کی گئی اور محمد علی پاشا نے جو اُس وقت بابِ عالی کی طرف سے مصر کا والی تھا محرم ۱۲۲۷ھ میں اپنے فرزند طوسون پاشا کی ماتحتی میں بری و بحری دو فوجیں روانہ کیں۔ اس کے بعد ۱۲۲۸ھ میں خود محمد علی پاشا میدانِ جنگ میں پہنچ گیا۔ مختلف لڑائیوں میں بڑے بڑے معرکے ہوئے جن میں کبھی وہابیوں کو اور کبھی ترکوں کو فتح حاصل ہوئی۔ ربیع الثانی ۱۲۲۸ھ میں سعود کا انتقال ہوگیا اور اُس کا لڑکا عبداللہ جانشین ہوا (بقیہ بر ص)

چودہ پندرہ برس بعد ترکوں نے حجاز پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا اور حسب الحکم سلطان محمود خاں[1]
تقریباً ۱۲۳۲ھ میں محمد علی پاشا[2] والی مصر نے مسمار شدہ قبوں کو حسب سابق از سر نو تعمیر کرا کے

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ)

آخر محمد علی پاشا کے فریب و فیاضی نے عربوں کو اپنی طرف ملا لیا۔ عبد اللہ قید کر کے قسطنطنیہ بھیجد یا گیا۔ وہاں اُس کو پھانسی دی گئی اور اب وہابیوں کی قوت میں زوال آگیا یہاں تک کہ ۱۲۳۲ھ میں ترکوں نے حجاز پر کامل تسلط حاصل کر لیا۔ اس کے بعد پاشا مصر چلا گیا اور اپنے بڑے لڑکے ابراہیم پاشا کو حجاز روانہ کیا کہ وہ وہابیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ یہ فتح کرتا ہوا وہابیوں کے پایۂ تخت درعیہ تک پہنچ گیا اور اس خوشنما شہر کو ڈھا کر مٹی کا ڈھیر کر دیا۔ عبد اللہ ابن سعود کو قید کر کے قاہرہ بھیجا وہاں سے اس کو قسطنطنیہ روانہ کیا گیا اور پھانسی دی گئی ابراہیم پاشا باوجودیکہ صلح کے بعد درعیہ میں داخل ہوا تھا۔ پھر بھی جبر و ظلم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وہابی علماء کے اُس نے دانت تک اکھڑوا دیے۔ اس ضرب سے وہابی سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ صرف علاقہ نجد میں اُن کی برائے نام حکومت رہ گئی اور معمولی رئیس یکے بعد دیگرے وہاں حکمراں ہوتے رہے۔ سو برس کے بعد زمانہ نے پھر پلٹا کھایا۔ یورپ کی جنگ عظیم کے بعد امیر نجد سلطان عبد العزیز ثانی ابن عبد الرحمن آل سعود نے جو ابن سعود کے نام سے مشہور ہیں اپنی بے مثل تدبیر و شجاعت سے تمام نجد پر تسلط حاصل کر لیا اور کافی قوت بہم پہنچا کر شریف مکہ حسین کو جس نے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء میں مختلف مقامات پر شکست دے کر حجاز سے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ انھوں نے بھی حسب عادت قدیم مکہ و مدینہ کے مزاروں کے گنبد ڈھا دیے ہیں۔ ہندوستان میں بھی بہت سے مسلمان وہابیانہ خیالات کے ہیں اور متعصب اہل سنت اور وہابیوں میں بہت ہی تھوڑا فرق ہے۔ یہاں وہابیانہ تحریک کے بانی مولوی محمد اسمٰعیل شہید اور سید احمد صاحب بریلوی سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے ۱۸۲۵ء میں سکھوں سے پنجاب میں جہاد کر کے پشاور فتح کر لیا تھا اور آخر دونوں میدان جنگ میں مارے گئے۔ ہندوستان کے وہابی غیر مقلد ہیں۔ نجد کے وہابی حنبلی طریق کے پابند ہیں۔ یہ لوگ اپنے تئیں اہل حدیث یا محمدی کہتے ہیں اور دوسروں کو بدعتی و قبر پرست سمجھتے ہیں۔ وہابیوں کے تفصیلی حالات اس فقیر کی تاریخ وہابیہ میں درج کیے گئے ہیں جو زیر طبع ہے۔

[1] سلطان محمود خاں ثانی کا عہد سلطنت ۱۲۲۳ھ سے ۱۲۵۵ھ تک ہے ان کے زمانہ کا سب سے بڑا واقعہ جنگ وہابیہ
[2] محمد علی پاشا موجودہ خاندان خدیویۂ مصر کا بانی ۱۷۶۹ء میں قصبہ قوالا واقع رومیلیا (بقیہ مضمون برصفحہ

قبروں پر غلاف ڈالے اور بعض قبروں کے کتبے جو اہل نجد نے اکھاڑ دیے تھے اور جو ابھی تک ٹوٹے نہ تھے اُن کو دوبارہ نصب کر دیا۔ اُس وقت کی جنت المعلیٰ کی حالت ایک مشہور و معروف فرنگی سیاح حجاز برکھارٹ کے سفرنامے سے درج کی جاتی ہے۔ جو ۱۸۱۴ء م ۱۲۳۲ھ میں مسلمانوں کا بھیس بنا کر ابراہیم ابن عبداللہ کے نام سے حجاز گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

صوبہ البانیہ میں پیدا ہوا تھا۔ اولاً یہ ترکی فوج میں بھرتی ہوا۔ پھر ۱۷۹۹ء میں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں اپنے سپاہیوں کا دستہ اکھٹا کر کے مصر میں سلطان کی طرف سے لڑکر دادِ شجاعت دی۔ بڑھتے بڑھتے ۱۸۰۵ء میں مصر کا گورنر ہو گیا۔ اوائل ۱۸۱۱ء میں وہابیوں کے مقابلہ کے لئے اپنے لڑکے طوسون پاشا کو حجاز روانہ کیا۔ محمد علی بڑا بہادر و مدبر تھا مگر اس کے ساتھ ہی انتہا کا فریبی و چالباز شخص بھی تھا اس نے مملوک سلاطین مصر کے پسماندہ اُمرا و رؤسا کو جو ہمیشہ ترکی سلطنت کو دق کیا کرتے تھے بتاریخ یکم مارچ ۱۸۱۱ء انتظام مصر و معاملات حجاز اور وہاں سے وہابیوں کے اخراج کے متعلق مشورہ کے حیلہ سے قلعہ قاہرہ میں بلا کر سب کا قتل عام کر دیا چار سو تیس آدمیوں میں سے صرف ایک مملوک امین بے اپنے گھوڑے کو قلعہ کی عالیشان دیواروں کو پھاند کر گولیوں کی بوچھاڑ میں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ گھر کے انتظام سے فارغ ہو کر ۱۸۱۲ء میں اس نے حجاز پر خود چڑھائی کی اور اپنی زر پاشی و سیاسی چالوں سے ۱۸۱۶ء میں فتوحاتِ حجاز مکمل کر دیں۔ اس کے بعد اپنے لڑکے ابراہیم پاشا کو بھیجا کہ وہابیوں کا رہا سہا نام بھی مٹا دے۔ محمد علی پاشا کا سب سے بڑا کارنامہ یا سیاہ تاہ وہ سرکشی و تمرد ہے جو اُس نے اپنے ولی نعمت سلطان ٹرکی سے کی۔ ۱۸۳۱ء میں اس کے لڑکے ابراہیم پاشا نے ملکِ شام پر حملہ کیا اور ترکوں کو شکست دے کر شام فتح کر لیا۔ اس وقت دول یورپ بیچ میں کود پڑیں اور دونوں میں صلح کرا کے بعض شرائط کی بنا پر مصر کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محمد علی اور اُس کے ورثا کے واسطے مخصوص کرا دی۔ چنانچہ موجودہ خدیو بھی اسی خاندان کے ایک رکن ہیں ۱۸۴۸ء میں محمد علی پاشا نے بوجہ ضعف و ناتوانی عزلت اختیار کر لی۔ اور ابراہیم پاشا کو خدیو مقرر کیا۔ ۲ اگست ۱۸۴۹ء میں محمد علی پاشا کا انتقال ہوا۔

محمد علی پاشا کی تصویر میرے پاس موجود ہے۔ عجیب نورانی صورت کے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ظاہری شکل و شمائل کو دیکھ کر بے اختیار دل چاہتا ہے کہ اس تقدس مآب شیخ المشائخ کے ہاتھ چوم لوں۔ مگر یہ ہاتھ بہت سے بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اس عبا قبا میں فولاد کا دل (بقیہ مضمون بر صفحہ ۹)

حجاز نجدیوں کے ہاتھ سے نکل کر ترکوں کے قبضے میں آچکا تھا اور خاص خاص قبروں کے گنبدوں کی تیاری ہو رہی تھی وہ کہتا ہے :-

"میں نے اس وسیع قبرستان میں پھر کر بہت سی قبریں دیکھیں جن پہ کوئی کتبے تھے مگر ان میں کوئی بھی چھٹی صدی ہجری سے قبل کا نہ تھا[۱] اور ان میں بھی دعائیں زیادہ تھیں۔ متوفی کا نام و تاریخ وفات کچھ نہ تھی بعض بزرگوں کی قبروں پر یہاں گنبد بنے ہوئے تھے جو وہابیوں نے توڑ ڈالے۔ یہ لوگ زیارتِ قبور کو ایک قسم کی بت پرستی سمجھتے ہیں اس لیے قبروں کو توڑ پھوڑ کر اپنی نفرت کا ثبوت دیا ہے مگر یہ متعصب مسلمان قبر کے اندرونی حصے کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے اور مُردوں کی ہڈیوں کی بے حرمتی نہیں کرتے۔ اگرچہ وہابیوں کی دست بُرد سے یہ قبرستان زیادہ ویران ہو گیا ہے مگر میرا خیال ہے کہ مکے والے بھی اپنے عزیزوں اور دوستوں کی قبروں کی کچھ زیادہ خبر گیری نہیں کرتے"

(سفر نامۂ برکھارٹ مترجمۂ خاکسار علی شبیر مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد ص۱۲۵)

سنہ ۱۲۶۹ھ میں انگلستان کا نہایت مشہور سیّاح کپتان برٹن[۲] عبد اللہ خاں کے نام سے مکے گیا تھا جنت المعلیٰ کی اُس وقت کی حالت بھی ملاحظہ ہو :-

"ایک بھدی چار دیواری اور ایک حقیر دروازہ اسے محصور کیے ہوئے ہے اس قبرستان کے اندر چند معمولی سفید سے قبے ہیں جو سب حال کی تعمیر ہیں۔ باقی احاطے میں کچھ چار دیواریاں ہیں جو بعض لوگوں کی ہروائیں ہیں۔ ان کے علاوہ کچی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

چھپا ہوا ہے۔ یہ وہ قسیُ القلب مدبر ہے کہ مملوکوں کے قتل عام کا حکم دے کر دستر خوان پر بیٹھتا ہے۔ یہ وہ مستقل مزاج بہادر ہے کہ پانچ ہزار وہابیوں کے سر اس کے اطراف جمع ہیں اور یہ مزے سے قالین پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ یہ وہ ستم ظریف فاتح ہے کہ اپنے قیدیوں کو قتل کرنے سے قبل اُن کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے جیسے بلی ایک چوہے سے چہلیاں کھیلتی ہے

[۱] اس سے خیال ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری تک قبروں پر کتبے نصب کرنے کا رواج یا تو بالکل نہ تھا یا بہت کم تھا۔

[۲] کپتان برٹن کے تفصیلی حالات اس کتاب کے باب دوم فصلِ اوّل میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔

بے ڈول قبروں کے کھنڈر بے ترتیبی کے ساتھ ہر طرف ہیں جن کے بیچ میں کہیں کہیں مرجھائے ہوئے گھی کوار کے درخت نظر آرہے ہیں۔"

(سفرنامۂ برٹن انگریزی جلد دوم ص ۲۴۸)

مرزا عرفان علی بیگ صاحب ڈپٹی کلکٹر اپنے سفرنامۂ حجاز تالیف ۱۳۱۱ھ میں اس قبرستان کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :-

یہاں بالعموم قبروں پر سنگِ بالین وسنگ پائین دونوں نصب کرتے ہیں۔ ترکوں کی قبروں پر سنگِ بالین جو نصب ہے اُن کے سروں پر ترکی ٹوپی یا عمامہ کی صورتیں گڑھی ہوئی ہیں۔ اہلِ عرب کو ایسی صورت گری پر قدرے اعتراض ہے۔"

(سفرنامۂ حجاز ص ۱۴۳)

نجدی حکومت کے تخمیناً سو برس بعد پھر انسانی ہاتھ نے کچھ دست درازی کی۔ یہ ہاتھ اہلِ نجد کا نہ تھا۔ بلکہ آلِ رسول شریفِ مکہ سید عون[۵۱] الرفیق پاشا کا ہاتھ تھا جن کو بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیعہ تھے۔ رحلۃ الحجازیہ خدیو عباس حلمی پاشا تالیف ۱۳۲۷ھ میں اس واقعہ کی کیفیت یہ درج ہے :-

"اسی قراقہ (قبرستان) میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی قبر ہے جس پر ایک قبہ بھی تھا لیکن شریف عون الرفیق نے اور بہت سی چیزوں کے ساتھ[۵۲] اُسے بھی منہدم کر دیا اور اب تک اس کی تعمیر نہیں ہوئی ...... انھوں نے حضرت آمنہ اور حضرتِ خدیجہ کی قبر کے قبے بھی گرا دینے چاہے تھے لیکن ابھی وہ منصوبہ پورا نہیں ہونے پایا تھا کہ خود ان کی حکومت کو زوال آگیا۔ اسی طرح حضرت فاطمہؑ کی ولادت گاہ میں جو ایک چکی رکھی ہوئی تھی اور جس کی نسبت اہلِ عرب کا خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اسی سے آٹا پیسا کرتی تھیں۔ شریف کے حکم سے اس کو بھی

۵۱۔ عون الرفیق ۱۲۹۹ھ میں شریفِ مکہ مقرر ہوئے اور ۱۳۲۳ھ وقتِ وفات تک شریف رہے۔

۵۲۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابوبکر کی دکان بزازی بھی جو مکہ معظمہ میں زیارت گاہ تھی منہدم کرادی۔

ہٹا دیا گیا۔"

(تاریخ حرمین مرتبہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی صفحہ ۴۴ و ۶۹)

۱۳۲۹ھ میں خان بہادر حاجی عبدالرحیم صاحب بنگلوری نے اس قبرستان کی زیارت کی تھی یہ زمانہ سلطان عبدالحمید خاں اور شریف عون الرفیق کا تھا۔ حاجی صاحب موصوف نے یہاں کی صفائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے مسلمان اسے پڑھیں اور شرمائیں۔

"رستے میں ایرانی۔ترکی۔بخاری۔ڈیرے لگائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے قبرستان کے نزدیک بہت غلاظت اور بدبو پھیل گئی تھی۔گورنمنٹ اور شریف صاحب کو ادھر ضرور توجہ کرنی چاہیئے۔ایسے پاک و منزہ مقام پر جہاں ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت آمنہ آرام کر رہی ہیں ایسی غلاظت کا رستے میں ہونا کہاں تک زیبا ہے۔"

(سفرنامۂ حرمین صفحہ ۱۸۰)

حاجی صاحب موصوف کا یہ فقرہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

یہ قبرستان بہت بڑا تھا مگر اس میں چند مکانات زیر تعمیر ہیں۔نہ معلوم کس مصلحت اور کس وجہ سے اب جنت المعلیٰ میں مکانات تعمیر کیے جا رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ یہ قبرستان بہت ہی مختصر رہ جائے گا۔

(سفر حرمین صـ ۱۸۹)

ایسی مثالیں ہندوستان کے اکثر قبرستانوں میں پائی جاتی ہیں مگر معلیٰ اور دوسرے قبرستانوں میں فرق ہے ایسی جگہ مکان بنانے والوں کی ناعاقبت اندیشی پر میر کا وہ شعر صادق آتا ہے۔

جو لوگ آسماں نے یاں خاک کر اڑائے
بے عبرتوں نے لیکر خاک ان کی گھر بنائے

سابقہ نجدی تسلط حجاز سے تقریباً ایک سو برس بعد زمانے نے پھر پلٹا کھایا اور ۱۳۴۳ھ میں حجاز دوبارہ اہل نجد کے زیر نگیں آ گیا۔ انھوں نے حسب عادت قدیم یہاں کے چاروں پانچوں قبّوں کو اور چونے گچی کی اُن بلند قبروں کو جو اُن کی فقہ کی اصطلاح میں "مشرف" تھی

تعریف میں آسکتی تھیں ڈھادیا اور کتبات و لوح وغیرہ منہدم کر دیئے۔ اس بارہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ سلطان ابن سعود نے تحفظ و احترام قبور کے متعلق جو وعدے کیے تھے اُن کا ایفانہ کیا گیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے خلافت کمیٹی نے جن صاحبوں کو اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا تھا اُن کے احتجاج پر کوئی توجہ نہ کی۔[۱] حجاز کے وہابیوں کو اس بارہ میں جب مینے قائل معقول کیا تو اُنھوں نے یہ جواب دیا:۔

(۱) "سلطان کے وعدے کتاب وسنت کے تابع تھے اس کے خلاف وعدہ کرنے کے وہ مجاز نہیں ہیں۔ قوم نے اسی شرط کے ساتھ اُن کو بادشاہ تسلیم کیا ہے"۔

(۲) " رپوٹر کے بعض تاروں کو بھی سلطان ابن سعود کا وعدہ سمجھ لیا گیا حالانکہ وہ کسی افترا پردازکے تار تھے"۔

(۳) "جس حدتک شرع نے قبروں کے تحفظ و احترام کی اجازت دی ہے اُس کا لحاظ کیا گیا۔ کسی میت کی توہین نہیں کی گئی۔ کسی مُردے کی ہڈیاں قبر سے نہیں نکالی گئیں"۔

(۴) "گنبدوں کا قیام شریعت کے فتوے پر منحصر تھا۔ علمائے اسلام کا فتوی اس کے خلاف ہوا اس لیے وہ منہدم کر دیے گئے۔ اور چونکہ کچی قبروں کا ثواب بھی زیادہ ہے اس لیے کچی قبریں بنوادی گئیں۔ سلام وزیارت وفاتحہ کی ہر شخص کو عام اجازت ہے"۔[۲]

(۵) "ہندوستان سے جو نمایندے موتمر اسلامی میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے تھے وہ تمام فرقہائے اسلام کے نمایندے نہ تھے تاہم اُن کے مطالبات سُنے گئے مگر مشکل یہ ہے کہ خدا اور رسول کے احکام کے مقابلے میں زیدوعمرو بکر کے قول کی سند نہیں لیجا سکتی"۔

میں اس جھگڑے کو اب مولویوں اور قوم کے لیڈروں کے حوالہ کرتا ہوں۔

قبرستان معلی میں بعض بزرگوں کی قبریں جو زمین سے صرف بالشت بھر اونچی تھیں اور جن کے حاشیے میں پتھر کی سلیں رکھی ہوئی تھیں اُن کو اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ وہابیوں کے نقطۂ نظر میں اُن کی شکل شرعی قبروں کی صورت سے ملتی جلتی تھی۔ بعض قبروں کے گرد جو احاطے

[۱] ان واقعات کی توضیح کے لیے ملاحظہ ہو "مسئلۂ حجاز" یعنی وفد خلافت کمیٹی کی رپورٹ مطبوعہ خلافت پریس بمبئی۔

[۲] سنہ ۱۳۴۵ھ میں عام اجازت تھی سنہ ۱۳۴۶ھ میں جو لوگ حج کو گئے اُن میں سے بعض کو جنت المعلی میں سلام وفاتحہ کی اجازت ملی بعض کو نملی

کھنچے ہوئے تھے اُن کو بھی عموماً چھوڑ دیا۔ البتہ ان چار دیواریوں میں جو پختہ اونچی قبریں تھیں اُن کو مسمار کر دیا اور کہیں کہیں بگڑے دل وہابی نے ایسی چار دیواریاں بھی ڈھا دیں مگر یہاں کے مدفونین کی قبروں نے وہ تین مدارج طے نہیں کیے جو جنت البقیع میں طے کرنے پڑے۔ وہ یہ کہ:-

(۱) یہاں کی قبریں نہ زمین سے بالکل ہموار کی گئیں۔

(۲) نہ ان پر علامت قبر کے طور پر تختے نصب کیے گئے۔

(۳) اور نہ یہاں از سر نو خام چبوترے بنا کر اُن کے گرد معمولی پتھروں کی بندش کی گئی۔

اس کی وجہ مجھ سے وہابیوں اور اہل مدینہ نے یہ بیان کی کہ بقیع کے مزارات اور خصوصاً قبور اہل بیت علیہم السّلام کی بعض لوگ غیر معمولی تعظیم کرتے تھے اس لیے یہاں زیادہ سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ مدفونین معلی کے ساتھ لوگوں کو اتنی عقیدت نہ تھی اس وجہ سے وہاں نرمی سے کام لیا۔

میں نے جنت المعلیٰ اور جنت البقیع کی قبروں میں جو فرق پایا وہ یہ ہے کہ:-

(۱) بقیع میں کسی قبر کے گرد احاطہ یا چار دیواری پہلے بھی نہ تھی اب بھی نہیں ہے معلی میں بعض ٹھرواڑوں کے احاطے اب بھی کھنچے ہوئے ہیں۔

(۲) بقیع میں کسی قبر کے آزو بازو سلیں نہیں ہیں صرف پتھروں کے ٹکڑوں کی بندش ہے۔ معلی میں سلیں موجود ہیں۔

(۳) بقیع میں کسی قبر کے سرھانے کھی گوار نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ معلی میں بعض بعض بزرگوں کے سرھانے کھی گوار کھڑا تسبیح خوانی کر رہا ہے۔

زیارت معلی کی نسبت ۱۳۴۴ھ میں اہل نجد نے زیادہ تشدد سے کام لیا تھا حج سے قبل جن حاجیوں نے زیارت کرنا چاہی اُن کو سپاہیوں نے روک دیا کہ تم کو فاتحہ پڑھنی نہیں آتی تم قبروں کو پوجنے لگتے ہو۔ چند روز بعد زیارت کی اجازت مل گئی اور حج کے بعد جو لوگ معلی گئے انھوں نے سلام و فاتحہ پڑھی۔ مگر سپاہی ان پر نظر رکھتے تھے کہ کہیں یہ سجدہ تو نہیں کرتے۔ اور قبروں کے پاؤں تو نہیں پڑ رہے ہیں۔

۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار حج کو گیا ہے اُس وقت کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی تھی

جو کچھ سرکار نے ہمیں کہہ دکھا وہ ہم سب کو گر رہے گا کہ مس رہ

اور سلام و زیارت و فاتحہ کی عام اجازت تھی۔ میں خود زیارت سے مشرف ہوا اور میں نے دیکھا کہ اکثر حاجیوں کو ان کے مطوف سلام پڑھا رہے تھے۔ بعض حاجی خود کتاب میں دیکھ کر یا زبانی سلام پڑھ رہے تھے۔ انتظام و نگرانی کے لیے دروازے پر سپاہیوں کا پہرا تھا۔ میں نے کسی سپاہی کو سختی کرتے یا کسی حاجی کو قبروں کی غیر معمولی تعظیم کرتے نہیں دیکھا۔ تاہم اس سال بھی بعض حاجی وہابیوں کے سابقہ طرزِ عمل کے خوف سے احتیاطاً یا نجدی سپاہیوں کے ایماء سے علی کے اندر نہیں گئے۔ باہر سے ہی فاتحہ پڑھکر واپس ہو گئے۔ میرے مکرم دوست الحاج پروفیسر مولوی محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے کو بھی یہی واقعہ پیش آیا اور نجدی سپاہیوں نے ان کو مشورہ دیا کہ اس وقت وہابی یہاں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں کہیں ان سے تکرار نہ ہو جائے مناسب ہے کہ ان کے چلے جانے کے بعد آپ یہاں آکر فاتحہ پڑھیں۔ (صراط الحمید صفحہ ۲۶۶)

قبرستان کی تعظیم وہابی تو کیا کریں گے عام اہلِ عرب بھی نہیں کرتے۔ گورستان میں خیمے لگا کر اسے اپنا قیام گاہ بنا لیتے ہیں۔ جوتے پہنے بے تکلف قبروں کو کھندلتے پھرتے ہیں دوسرے ملکوں کے حاجی بھی ان کی دیکھا دیکھی اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ میں نے جنت المعلیٰ میں ہندوستانی حاجیوں کی بھی بہت سی بے عنوانیاں دیکھیں ✤

---

(۲) جنت المعلّیٰ میں اس گنہگار کا گزر

(✤)

۱۳۴۵ھ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے زیارتِ جنت المعلیٰ کی توفیق دی مگر افسوس ہے کہ علالت کی وجہ سے اکیس روز کے قیام مکہ میں صرف دو مرتبہ وہاں کے خفتگانِ خواب راحت کی خدمت میں سلام عرض کر سکا۔ پہلی مرتبہ ۲۷ ذیقعدہ کو صبح کے وقت اور دوسری مرتبہ ۵ ذیحجہ کو بعد نمازِ مغرب۔ اس قبرستان میں جس اطمینانِ قلبی کی مجھے ضرورت تھی وہ حاجیوں کی کثرت اور دائروں کے شور و غل کی وجہ سے دن میں نصیب نہ ہوا۔ البتہ رات کے وقت جب میں قندیل کی دھیمی روشنی میں ایک مطوف کے پیچھے پیچھے معلی کی مختلف گھاٹیوں میں سے گزر رہا تھا اس وقت

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انوار الٰہی و تجلیات ربانی میرے قلب پہ نازل ہو رہی ہیں۔ میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ بہت سے بزرگوں کی زیارت پڑھی اور سلام و فاتحہ کے بعد رخصت ہوا۔ دن کے وقت میں نے دیکھا کہ اس قبرستان کے گرد اب بھی ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کھنچی ہوئی ہے۔ چھ سیڑھیاں چڑھکر ہم اس کے دروازے میں داخل ہوئے جس میں کواڑ نہ تھے۔ سیڑھیوں کے ادھر اُدھر دو کھمبے کھڑے تھے یہاں ہم نے جس وقت کہا اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْر (اے قبر میں بسنے والو تم پر سلام) ہمارے جسم میں سردی پیدا ہو گئی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے ہم نے قدم بڑھایا اب ہم کوئی پانسو گز لمبے دو سو گز چوڑے ایک ناہموار قطعۂ زمین پہ پہنچ گئے جس میں جا بجا ملبے۔ اینٹ پتھر اور مٹی کے انبار لگے ہیں۔ چاروں طرف کچی قبروں کے ڈھیر اور نیم پختہ قبروں کے کہنہ و شکستہ چبوترے دکھائی دے رہے ہیں۔ قبوں کے حالیہ انہدام نے اس کی ویرانی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ پتھر کے قدرتی ٹولوں کے ساتھ ٹوٹے ہوئے گنبدوں کے ٹیلے مختلف جگہ بن گئے ہیں۔ کتبوں کے پتھر خس و خاشاک میں دبے نظر آتے ہیں۔ حجاج و زائرین کے گروہ کے گروہ سلام و فاتحہ پڑھتے گشت کر رہے ہیں۔ یہاں کی اُداسی کو ان کی کثرت نے رہل پہل سے بدل دیا ہے پھر بھی سنّاٹا غالب ہے۔ دنیا کے بکھیڑوں سے دل یہاں دور بھاگ رہا ہے۔ نئی قبریں ہمارے لیے کوچ کا نقارہ بجا رہی ہیں یہ وہی لوگ تھے جو ہماری طرح حج کے لیے آئے تھے اور اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ گئے۔ خوش نصیب ہیں کہ گھر سے جنت کی سیر کے لیے نکلے تھے مگر جنت پہ قبضہ ہی کر لیا۔ اس وقت ہمارے ساتھ بھی بعض حاجی معلیٰ کی زیارت کو آئے ہیں مگر اپنے پاؤں سے نہیں بلکہ چار کے کندھوں پہ۔ دوسرے کی سواریاں معلیٰ کے دروازے پہ چھوٹ گئیں ان کی سواریاں اندر تک آئی ہیں۔ جا بجا تابوت رکھے ہوئے ہیں قبریں کھد رہی ہیں۔

مسلمانوں کا گورستان معلیٰ ہو یا بقیع اس کی نسبت یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ عیسائیوں کے قبرستانوں کی طرح سیرگاہ ہو گا۔ معلیٰ عبرت کدہ ہے عبرت کی درسگاہ ہے۔ یہ دنیا سے دل لگانے کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسے دیکھ کر انسان کو اپنا اصلی ٹھکانا یاد آتا ہے۔ آدمی اپنی حقیقت پہچاننے لگتا ہے اور خدا کو منہ دکھانے اور شہر خموشاں میں بسنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

کسی شاعر نے گورِ غریباں کی تصویر اِن الفاظ میں کھینچی ہے۔

خشک گل۔ افسردہ سبزہ شمع چپ۔ بالیں اُداس
دل بھر آیا عالم گورِ غریباں دیکھ کر

مگر یہاں سوکھے ہوئے پھول اور مرجھایا ہوا سبزہ بھی نہیں ہے۔ یہاں نہ کوئی چراغدان ہے نہ بجھا ہوا چراغ۔ جنت المعلیٰ اِن تمام تکلفات سے بری ہے۔ اس کی رونق اُن جوانانِ بہشت سے ہے جو اس کی خاک میں سو رہے ہیں۔ اِس کی آرائش وہ جواہر بے بہا ہیں جو یہاں کے خزانے میں مدفون ہیں۔ اس کی زینت اسلام کے اُن جگمگاتے ستاروں سے ہے جن کی وجہ سے یہاں کی زمین آسمان پر فخر کرتی ہے۔ میری آنکھیں یہاں ظاہری نمایش تلاش کر رہی ہیں میرا دل مجھے ملامت کر رہا ہے کہ :-

اے کوتاہ بیں!! تو یہاں قبّے۔ چبوترے۔ لوح۔ کتبے۔ غلاف کیا ڈھونڈھ رہا ہے؟ کسی اور جگہ عالیشان روضے میں پاؤں پھیلانے سے یہاں گِل درگِل ہو جانا بہتر ہے

او ظاہر پرست!! اگر تو چاہتا ہے کہ تیری قبر پر مولسری کے پھولوں کا مینہ برسے تو کہیں اور جاکے مر۔ تونے ادھر کا کیوں رخ کیا؟ الا اللہ!!

(۳) مقبرہُ اجدادِ رسُول

جنت المعلیٰ کے جس حصے میں حضرت عبدِ مناف و حضرت عبد المطلب و حضرت ابی طالب کی قبریں ہیں اُس کو میں نے "مقبرہُ اجدادِ رسول" کے نام سے موسوم کیا ہے تاکہ اس قبرستان کی مقدس ہڑواڑوں میں خلط بحث نہ ہو جائے۔ یہ مقبرہ جبل حجون کے دامن میں حضرت خدیجہ کی قبر سے آگے ہے۔ آنحضرت کے اجداد کے حالات تاریخوں میں تفصیل سے مرقوم ہیں یہاں بقدرِ ضرورت اُن کا تذکرہ اور اُن کی قبروں کی تاریخی حالت درج کرتا ہوں۔

الف۔ قبر حضرت عبد مناف۔

آنحضرت ان کی پانچویں پشت میں ہیں یعنی آنحضرت کے جدِ امجد حضرت عبد المطلب تھے اُن کے والد ہاشم اور اُن کے والد عبد مناف۔ ان کا اصلی نام مغیرہ تھا اور کنیت ابو عبد شمس تھی۔ قریش اِن کو حسن و جمال کی وجہ سے قمر کہا کرتے تھے۔

مورخین مکہ اُن کی قبر کے متعلق کچھ نہیں لکھتے ابن جبیر و ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرناموں میں مدفونین معلی کے ضمن میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ فرنگی سیاح برکھارٹ جو تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں مکہ معظمہ گیا تھا اور مشہور و معروف سیاح برٹن جس نے ۱۲۶۹ھ میں مکے کا سفر کیا تھا دونوں ان کی قبر کی نشاندہی نہیں کرتے البتہ چودھویں صدی ہجری کے ہندوستانی سیاحانِ حجاز معلی میں ان کی قبر کا وجود بتاتے ہیں۔ ۱۳۲۹ھ میں حاجی عبد الرحیم صاحب بنگلوری نے حج کیا تھا وہ اپنے سفرنامہ "سفر حرمین" میں حضرت عبد مناف اور حضرت عبد المطلب کی قبر ایک ہی قبہ کے اندر تحریر کرتے ہیں۔ مگر مولوی قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری نے اپنے سفرنامۂ حجاز "الہاد" میں ان کی قبر ایک علٰحدہ قبے میں بیان کی ہے۔ اور اس کی صحت کے متعلق یہ فرماتے ہیں:۔

"اس قبر کی اصلیت کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا" (الہاد صفحہ ۱۰۱)

۱۳۴۴ھ میں اہلِ نجد نے مکہ فتح کرنے کے بعد دوسرے قبوں کے ساتھ حضرت عبد مناف کا قبہ بھی توڑ ڈالا۔ ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے ایک قبر کی زیارت کی جو زمین سے بالشت بھر اونچی تھی اس کے چاروں طرف پتھر کی سلیں رکھی ہوئی تھیں۔ کتبہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ اہل مکہ نے کہا کہ یہ مزار حضرت عبد مناف کا ہے۔

ب۔ قبر حضرت عبد المطلب۔

حضرت عبد المطلب آنحضرت کے دادا تھے۔ حضور سرورِ عالم کے والد ماجد حضرت عبد اللہ کا انتقال آنحضرت کی ولادت سے قبل ہو چکا تھا[1]۔ حضرت عبد المطلب نے آنحضرت کا نام محمدؐ رکھا اور ولادت کے ساتویں روز قربانی کر کے قریش کی دعوت کی۔ آنحضرت کی عمر جس وقت چھ سال کی تھی۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ نے بھی رحلت فرمائی اور اب آنحضرتؐ کی پرورش بالکلیہ حضرت عبد المطلب کے ذمہ ہو گئی یہاں تک کہ جب آنحضرت کا سن شریف

---

[1] ایک روایت یہ ہے کہ اُس وقت آنحضرتؐ اٹھائیس دن کے تھے ایک روایت ہے کہ دو مہینے کے تھے۔

آٹھ برس[1] کا تھا۔ اس بزرگ کا سایہ بھی آپ کے سر سے اُٹھ گیا۔

حضرت عبد المطلب تجارت کیا کرتے تھے قریش کے سردار اور کعبے کے متولی بھی تھے چاہِ زمزم کا انکشاف اور حجر اسود کی برآمدگی انھیں کے زمانہ تولیت میں ہوئی تھی[2]۔ حضرت عبد المطلب کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ مورخین مکہ ان کی قبر کے متعلق بالکل خاموش ہیں قدیم سیاحوں نے بھی اس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ البتہ زمانۂ حال کے سیاح جنت المعلیٰ کے مزارات میں اس کا بھی شمار کرتے ہیں۔ ۱۳۲۹ھ میں حاجی عبد الرحیم صاحب بنگلوری نے ان کی قبر اور حضرت عبد مناف کی قبر ایک ہی قبے میں بیان کی ہے مگر قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری ان کا قبہ علاحدہ بتاتے ہیں۔ اس قبر کی نسبت بھی قاضی صاحب ممدوح کا وہی فقرہ ہے کہ:-

"اس کی اصلیت کی نسبت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

۱۳۴۴ھ میں یہ قبہ بھی منہدم ہوچکا ہے۔ میں نے ۱۳۴۵ھ میں جبل حجون کے دامن میں ایک قبر کی زیارت کی۔ جو حضرت عبد المطلب کے نام سے منسوب تھی۔ اس پر کوئی کتبہ نہ تھا پتھر کی چار سلیں چار طرف رکھی ہوئی تھیں۔

---

[1]۔ بعض روایتوں میں حضرت عبد المطلب کی وفات کے وقت آنحضرتؐ کا سن دس سال بیان کیا گیا ہے۔

[2]۔ اس واقعہ کی کیفیت یہ ہے کہ جب بنو بکر نے جو اولادِ اسماعیل سے تھے۔ کعبے کے حکمراں قبیلہ جرہم کو یہاں سے نکال دیا تو جرہم کے رئیس عمرو بن حارث نے اس خیال سے کہ کعبے کی بیش قیمت چیزیں دشمنوں کے ہاتھ نہ پڑیں اور جب کبھی کعبے پر دوبارہ اُن کا قبضہ ہوجائے تو وہ انھیں کو مل جائیں۔ حجر اسود کو کعبے سے اکھاڑ کر اور بہت سے ہتیار جو مختلف لوگوں نے کعبے پر چڑھائے تھے اور شاہانِ فارس کے چڑھائے ہوئے دو طلائی ہرن یہ سب چیزیں چاہِ زمزم میں چھپادیں اور مٹی وغیرہ ڈال کر کنوے کو زمین کی برابر کردیا۔ یہاں تک کہ مدت گزر گئی اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ کعبے کے پاس کوئی کنواں بھی اس طرح دبا پڑا ہے۔ جب آنحضرت کے ظہور کا زمانہ قریب ہوا تو حضرتؓ عبد المطلب نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص اُن سے چاہِ زمزم کھودنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ چونکہ اُن کو زمزم کا علم نہ تھا۔ بڑی حیرت ہوئی۔ آخر تین مرتبہ جب یہی خواب دیکھا اور زمزم کا مقام اور جگہ بصراحت خواب میں دکھائی دی تو کنواں کھود کر حجر اسود اس میں سے نکال کر کعبے میں نصب کیا۔

ج۔ قبر حضرتِ ابی طالب۔

حضرتِ ابی طالب آنحضرت کے شفیق چچا اور حضرت علی کے والد ماجد ہیں۔ ان کا نام عبد مناف تھا۔ اِن کے بڑے فرزند طالب کی وجہ سے ان کی کنیت ابی طالب مشہور ہے[ل۱]
حضرت عبد المطلب نے مرتے وقت آنحضرت کی پرورش کے لیے بطور خاص ان سے وصیت کی تھی جس کو اُنھوں نے بڑی خوبی سے پورا کیا۔ آنحضرتؐ آٹھ سال کی عمر سے تقریباً پچاس سال کی عمر تک انکی زیرِ کفالت رہے اور حضرت ابی طالب مدت العمر آنحضرت سے کے ساتھ بڑی شفقت کرتے رہے۔ ہر بات میں اپنے بچوں سے زیادہ اِن کی خبر گیری کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت کی عمر نو سال تھی حضرت ابی طالب نے بغرضِ تجارت شام جانے کا ارادہ کیا آنحضرت بھی اُن کے ساتھ چلنے کے لیے کہنے لگے۔ مہربان چچا کا دل بھر آیا اور معصوم بھتیجے کی فرمایش پوری کی۔ آنحضرت کو ان سے بڑی تقویت تھی اور چونکہ یہ بہت با اثر شخص تھے اس لیے اِن کی زندگی تک کفار کی ہمت نہیں پڑی کہ کھلم کھلا آنحضرتؐ کو ایذا دیں۔ کئی مرتبہ قریش مکہ نے حضرت ابی طالب کو مختلف قسم کی ترغیب و تحریص اور دھمکی دی اور طرح طرح سے دباؤ ڈالا کہ وہ اپنے بھتیجے کا ساتھ چھوڑ دیں مگر شفیق چچا نے جیتے جی اپنی محبت میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت اسد[ل۲] بھی آنحضرت پر شفقت کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ منجملہ اور وجوہ کے حضرت ابی طالب کی محبت کا بھی اثر تھا کہ حضرت سرورِ کائنات اُن کے فرزند حضرت علی کے ساتھ بے انتہا محبت فرماتے تھے مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ حضرت ابی طالب کے ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کا قائل نہیں ہے مگر ان کے بعض اشعار سے جو تاریخ ابو الفدا میں درج ہیں اور نیز اُس خطبہ سے جو اُنھوں نے آنحضرتؐ کے عقد خدیجۃ الکبریٰ کے وقت پڑھا تھا ثابت ہوتا ہے کہ یہ مومن تھے۔ نیز بعض اور روایتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم از کم وقتِ مرگ ایمان لے آئے تھے اور کلمۂ شہادت اُن کی زبان پر جاری ہو گیا تھا۔
حضرت ابی طالب نے کچھ اوپر اسی برس کی عمر میں ہجرت سے تین سال قبل یا بروایت مشہور ہجرت سے ایک برس پیشتر ماہ شوال میں بمقام مکہ معظمہ انتقال فرمایا۔ حضرت ابی طالب کی قبر کا ذکر مورخین مکہ مطلق نہیں کرتے۔ ازرقی۔ فاسی۔ فاکہی

ل۱۔ حضرت ابی طالب کے چار فرزند تھے (۱) طالب (۲) جعفر طیار (۳) عقیل (۴) علی۔ ل۲۔ ان کا ذکر مد فونین بقیع کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

قطب الدین اور ابن ظہیرہ وغیرہ سب خاموش ہیں۔ ابن جبیر و ابن بطوطہ بھی ان کا نام تک نہیں لیتے البتہ فرنگی سیاح برکھارٹ نے جو ۱۲۳۲ھ میں مکے گیا تھا اپنے سفرنامے میں ان کی قبر کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"شریف کے مکان سے آگے معلے کے سرے پر حضرت ابی طالب کا مزار ہے۔ وہابیوں نے اُس عمارت کو جو ان کی قبر پر بنی ہوئی تھی ڈھا کر مٹی کا ڈھیر کر دیا ہے۔ محمد علی پاشا نے بھی اس کو دوبارہ بنوانا مناسب نہ سمجھا۔ یہ قبر اب بنائی بھی نہ جائیگی۔ مکے والے حضرت ابی طالب کو اپنے شہر کا سرپرست سمجھتے ہیں اور مکے میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جو خدا کی قسم توڑ ڈالنا ایک بات سمجھتے ہیں مگر حضرت ابی طالب کی جھوٹی قسم کھانے سے ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ پردیسیوں کو دھوکا دینے کے لئے بات بات پر بیت اللہ اور کعبے کی قسم کھا لیتے ہیں مگر ابی طالب کی قسم سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر پھٹکار ہو جائے گی۔ دھوکا دھڑی کے موقعوں پر بھی یہ قسم شاذ و نادر ہی سُننے میں آتی ہے۔"

(سفرنامہ برکھارٹ مترجمہ خاکسار شبیر صفحہ ۱۲۴ و ۱۲۹ مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد دکن)

میں نے بھی مکہ معظمہ میں بعض لوگوں سے سُنا کہ عوام حضرت ابی طالب کی درگاہ سے بڑا عقیدہ رکھتے تھے ان کی قبر پر منتیں مانتے تھے اور قربانیاں چڑھاتے تھے۔ اگرچہ برکھارٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کا قبہ بنوایا بھی نہ جائیگا مگر قبہ تیار کر دیا گیا تھا۔ یہ نہیں معلوم کہ کب بنا اور کس نے بنوایا۔ چودھویں صدی کے سیاحانِ حجاز ان کی قبر و قبہ کا ذکر کرتے ہیں ۱۳۴۴ھ میں اہلِ نجد نے پھر اس قبہ کو منہدم کر دیا۔ ۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار جنت المعلی میں حاضر ہوا تو جبل حجون کے دامن میں ایک کچی قبر دیکھی جو اس بزرگ کے نام سے موسوم تھی۔

(۴) مزار حضرت آمنہ رضہ

حضرتِ آمنہ بنتِ وہب آنحضرت صلعم کی والدۂ ماجدہ ہیں۔ اِن کا میکا مدینے میں تھا

اور یہ سال کے سال اپنے عزیزوں سے ملنے اور اپنے شوہر حضرت عبداللہ کی قبر کی زیارت کے واسطے بمقام ابوا جو مکہ و مدینہ کے درمیان ہے تشریف لیجایا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت چھ برس کے تھے وہ حضرت عبدالمطلب و حضرت ابی طالب[1] کے ساتھ حسب عادت مدینے گئیں اور اس دفعہ آنحضرت کو بھی اپنے بھائیوں سے ملانے کے لیے اپنے ہمراہ لے گئیں۔[2] اتفاقاً بقضائے الٰہی ابوا میں اُنھوں نے رحلت فرمائی اور وہیں دفن کی گئیں۔

اگرچہ تمام مورخ اس پر متفق ہیں اور صحیح روایتوں سے بھی یہی ثابت ہے کہ حضرت آمنہ کا انتقال ابوا میں ہوا ہے مگر بعض اہل مکہ کا زمانہ قدیم سے یہ خیال بھی چلا آرہا ہے کہ ان کا مزار جنت المعلیٰ میں ہے۔ چنانچہ ازرقی نے اپنی تاریخ اخبار مکہ میں جو تقریباً دوسری صدی ہجری کی تالیف ہے۔ حضرت آمنہ کی قبر کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے:۔

"بعض مکے والوں کا زعم ہے کہ حضرت آمنہ بنت وہب والدۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اسی مقبرۂ (معلیٰ) میں ہے۔"

اس بحث میں ازرقی نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس پر اہل مکہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت آمنہ کی قبر جنت المعلیٰ ہی میں ہے۔ خلاصہ اس حدیث کا یہ ہے:۔

"ایک روز آنحضرت چند صحابہ کے ساتھ معلیٰ کے قبرستان میں تشریف لے گئے اور بہت سی قبروں سے گزرتے ہوئے معلیٰ کے آخری کنارے تک پہنچکر ایک قبر کے پاس بیٹھ گئے اور دیر تک طلب نجات فرماتے رہے۔ اس کے بعد آواز سے رونے لگے اس پر تمام صحابہ بھی رونے لگے۔ آنحضرت صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کس وجہ سے آبدیدہ ہوئے آنحضرت نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کیا میرے رونے کی وجہ سے تم بھی روئے! اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ قبر آمنہ بنت وہب کی ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے اس

---

[1] حضرت ابی طالب آنحضرت کے حقیقی چچا تھے ان کے علاوہ حضرت عبدالمطلب کے اور بھی آٹھ فرزند تھے جو آنحضرت کے والد کے حقیقی بھائی نہ تھے۔

[2] آنحضرت کے کوئی حقیقی ماموں نہ تھے۔ حضرت آمنہ کے رشتے کے بھائی مدینے میں رہا کرتے تھے۔

قبر کی زیارت کیلئے اجازت چاہی اس کی مجھے اجازت مل گئی اس کے بعد میں نے آمنہ کے لیے طلب مغفرت کی اجازت چاہی مگر اس کی اجازت نہ ملی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ

یعنی نبی اور مسلمانوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کیلئے خواہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں دعائے مغفرت کریں[۱]

(اخبار مکہ ازرقی عربی مطبوعہ جرمنی ص ۴۳۴)

اس کے بعد ایک دوسری جگہ ازرقی لکھتا ہے:۔

"بعض مکے والوں کا یہ زعم ہے کہ حضرت آمنہ بنت وہب والدۂ رسول اللہ کی قبر شعب ابی دُب (واقع جنت المعلیٰ) میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دار نابغہ میں ہے اور بعض مدنی کہتے ہیں کہ اُن کی قبر ابوا میں ہے اور کئی حدیثیں بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کی قبر ابوا میں ہے۔"

(اخبار مکہ عربی مطبوعہ جرمنی صفحہ ۴۸۱ و ۴۸۲)

ازرقی نے یہ نہیں لکھا کہ اُس کے زمانہ میں حضرت آمنہ کی قبر کی علامت معلیٰ میں موجود تھی یا نہ تھی۔ خیر بیانِ مذکورۂ بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرتِ آمنہ کی قبر تین جگہ خیال کی جاتی ہے۔

(الف) قبرستانِ معلیٰ میں ۔ (مکے میں)

(ب) دار نابغہ میں = (مدینے میں)

(ج) ابوا میں = (مکہ و مدینہ کے درمیان)

دار نابغہ یا نابغہ کا مکان مدینہ منورہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ تاریخ ابو الفدا جلد دوم میں ہے کہ نابغہ قبیلۂ بنی نجار کا کوئی شخص تھا۔ اس مکان میں آنحضرت کے والد کا مدفن بھی خیال کیا گیا ہے۔

---

[۱] ۔ یہ فقیر حضرت خاتم النبیین کے والدین کو اس آیت کا مصداق نہیں سمجھتا وہ مومن تھے۔ اب یہی حضرت آمنہ کی قبر کے متعلق حدیث اس کا ضعیف ہونا دوسری روایتوں سے ظاہر ہے۔

تاریخ کامل ابنِ اثیر جلد ششم میں حضرت عبد اللہ کے مدفن کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ دار النابغۃ الصغریٰ اور ایک مقام پر دار نابغۃ الجعدی تحریر ہے۔ خلاصہ یہ کہ نابغہ کوئی خاتون تھیں جن کا مکان مدینۂ منورہ میں تھا۔

مقام ابوا کے وقوع میں بھی اختلاف ہے۔ بعض مورخ اس کو مدینہ سے (۲۳) میل بتاتے ہیں۔ بعض بلا تعیین فاصلہ مکہ و مدینہ کے درمیان لکھتے ہیں۔ سید سمہودی مدینے کے قرب وجوار میں اس کی نشاندہی کرتے ہیں (وفا الوفا عربی جلد دوم صـ۲۴۰) ابن اثیر مولف تاریخ کامل اس کو اُحد کے قریب بتاتا ہے جو مدینہ سے جانب شمال تین میل پر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

> جب قریش نے مدینے پر چڑھائی کر کے اُحد کے نواح میں ڈیرے ڈالے تو انھوں نے چاہا کہ حضرت آمنہ کی قبر کھود کر لاش نکال ڈالیں۔ لیکن کسی نے اُن سے کہا کہ محمدؐ نے تمہاری عورتوں کے ساتھ کبھی بدسلوکی نہیں کی۔ تم کو بھی عورتوں کی پردہ پوشی لازم ہے اس کہنے سے وہ لوگ اپنے ارادہ سے باز رہے۔
>
> (تاریخ کامل ابن اثیر جلد ششم)

جنرل ابراہیم رفعت پاشا مراۃ الحرمین میں لکھتے ہیں کہ ابوا رابغ[1] سے جانب مدینہ تیرہ میل کے فاصلہ پر ہے (مراۃ الحرمین عربی جلد اول صـ۳۱) اس حساب سے ابوا مدینۂ منورہ سے (۱۴۷) میل دور ہوا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت آمنہ کا مزار مقام ابوا میں سب بتاتے ہیں مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے قبر شریف دیکھی اور وہ اس ہیئت اور اس شکل کی تھی۔

اب رہی قبر حضرت آمنہ واقع جنت المعلیٰ اس کا ذکر ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں اور ابن بطوطہ نے ۷۲۶ھ میں کچھ نہیں کیا۔ مکۂ معظمہ کے مورخین فاسی ۸۱۰ھ فاکہی (۹۰۰ ہجری)

---

[1] رابغ بحر احمر کا مشہور بندرگاہ اور قافلۂ حجاج کی سب سے بڑی منزل ہے۔ جدے سے ایک سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے یہاں سے مدینہ (۱۶۰) میل ہے۔ رابغ میں ایک قلعہ ہے کچھ فوج رہتی ہے۔ پچاس ساٹھ مکان پختہ و نیم پختہ ہیں۔ عربوں کی کچھ جھونپڑیاں بھی ہیں۔ بازار میں ہر قسم کی ضروریات مل جاتی ہیں۔ بہت بڑا چائے خانہ ہے جس میں بہت سی چارپائیاں مسافروں کے لیے پڑی ہیں۔ موضع رابغ سے بندرگاہ تین چار میل ہے۔

قطب الدین مکی (۹۶۱ھ ہجری) اور ابن ظہیرہ (۹۱۹ھ ہجری) بھی اس قبر کی نسبت کچھ نہیں لکھتے اس لیے معلوم نہیں ہوتا کہ اُس زمانہ میں موجود تھی یا نہ تھی۔

تیرھویں صدی کے فرنگی سیاح حجاز برکھارٹ نے ۱۲۳۲ھ ہجری میں مزار حضرت آمنہ واقع معلیٰ کی یہ کیفیت لکھی ہے:۔

"مغربی سلسلۂ کوہی کے نشیب میں حضرت خدیجہ کی قبر سے تھوڑی دور حضرت آمنہ کی قبر ہے۔ اِس پر سنگِ مرمر کی عمدہ لوح نصب ہے اور خطِ کوفی میں کتبہ کندہ ہے۔ وہابیوں نے اس لوح کو بھی توڑ کر دو ٹکڑے کر دیے تھے اور اُن ٹکڑوں کو بھی یہاں سے علیحدہ کر دیا تھا۔"

(سفرنامہ برکھارٹ مترجمہ خاکسار شبیر مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد دکن ص۱۲۵)

۱۲۶۹ھ ہجری میں انگلستان کا مشہور سیاح کپتان برٹن مکہ معظمہ گیا تھا اُس نے بھی حضرت آمنہ کی قبر اور اس کے قبے کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے۔

حضرت خدیجہ کی قبر سے ذرا آگے بڑھ کر ہم ایک دوسرے قبے پر پہنچے جو سیدہ آمنہ کی قبر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں ایک نہایت بدشکل بڑھی عورت دروازے پر آئی اور ہم سے فاتحہ کے لیے کہا۔ جب تک ہم فاتحہ پڑھتے رہے وہ ہماری صورت گھورتی رہی۔ اس کے بعد اُس نے ہمارے منہ پر گلاب چھڑکا۔ اس عورت کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ قبر بلا شرکتِ غیرے صرف ایک عورت کی جائداد ہے۔ وہ ہر روز یہاں جھاڑو دینے آتی ہے اور چڑھاوا لیکر چلی جاتی ہے۔"

(سفرنامہ برٹن انگریزی جلد دوم صفحہ ۲۵۰)

چودھویں صدی ہجری کے تمام سیاح اس قبر کا ذکر اپنے سفرناموں میں کرتے ہیں۔ اِن میں سے یہاں صرف دو شخصوں کا بیان لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جنرل ابراہیم رفعت پاشا کہتے ہیں:۔

"لوگوں کا زعم ہے کہ یہاں حضرت آمنہ کی قبر ہے مگر یہ افترا ہے وہ ابواء میں مدفون ہیں۔" (مراۃ الحرمین عربی جلد اول ص۳۱)

قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ :-

تعجب خیز یہ ہے کہ سیدہ آمنہ والدۂ رسول پاک کا روضہ بھی یہاں بنا ہوا ہے حالانکہ روایاتِ صحیحہ وقطعیہ سے واضح ہے کہ اُن کا انتقال بمقام ابوا ہوا۔ اور اُسی جگہ اُن کا مدفن ہے۔ (الہاد صفحہ ۱۰۱)

اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ اہلِ نجد کی پہلی فتوحات حجاز کے وقت حضرت آمنہ کے مزار پر قبہ موجود تھا یا نہ تھا اور اگر تھا تو وہ کب بنا تھا اور کس نے بنوایا تھا۔ محمد علی پاشا نے وہابیوں کے حجاز سے چلے جانے کے بعد جو قبہ تعمیر کرایا تھا اور جس کا ذکر زمانہ حال کے سیاح کرتے ہیں وہ ۱۳۴۴ھ میں اہلِ نجد نے حجاز پر دوبارہ تسلط حاصل کرنے کے بعد مسمار کر دیا۔ ۱۳۴۵ھ میں اس قبر کی زیارت میں نے کی۔ معمولی چار سلوں کی زمین سے بالشت بھر اونچی قبر ہے۔

---

(۵) مزارِ امّ المومنین حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ

امّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ آنحضرتؐ کی زوجہ محترمہ جنابہ خاتون جنت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کی والدۂ ماجدہ اور جناب حسنین علیہم السلام کی جدّہ بزرگوار ہیں۔ عموماً مورخ اس پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے یہی ایمان لائیں اور اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ عورتوں میں سب سے اول انہیں نے تصدیقِ رسالت کی۔ یہ نہایت مالدار اور ایک معزز خاندان کی بی بی تھیں عقد سے قبل آنحضرت صلعم ان کا مالِ تجارت لے کر ملکِ شام تشریف لے گئے تھے بعثت سے پندرہ برس قبل آنحضرت نے ان سے نکاح کیا اور ان کی زندگی تک کوئی اور عقد نہیں فرمایا۔ آنحضرت کو ان کے روپیہ سے بہت مدد ملی تھی۔ ان کا اثر بھی قریش مکہ پر بہت تھا۔ سوائے حضرتِ ابراہیم کے آنحضرت کی باقی تمام اولاد انھیں کے بطن سے پیدا ہوئی۔ باختلافِ روایت ہجرت سے تین سال قبل یا ایک سال پیشتر حضرت خدیجہ نے (۶۸) برس کی عمر میں وفات پائی اور مقبرۂ معلیٰ کے اُس حصے میں جو شعب بنی ہاشم کہلاتا ہے دفن ہوئیں۔

حیرت ہے کہ ازرقی نے اپنی تاریخ مکہ میں حضرت خدیجہ کی قبر کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ ابن جبیر و ابن بطوطہ قدیم سیاح بھی اس کی نشاندہی نہیں کرتے۔ البتہ قطب الدین مکی نے اس کا ذکر کیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"مقبرۂ معلیٰ میں مقام مقبول بیت دعا مقبرۂ خدیجہؓ ہے جو شعب بنی ہاشم میں ہے"۔

(الاعلام عربی مطبوعہ مصر ص۱۹۸)

ابن ظہیرہ کی بھی یہی رائے ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"یہاں کی وادیوں میں افضل ترین وہ وادی ہے جس میں حضرت خدیجہؓ کی قبر ہے"

(جامع اللطیف عربی مطبوعہ مصر ص۳۴۷)

حضرت خدیجہ کی قبر پر پہلی مرتبہ غالباً دسویں صدی ہجری میں قبہ تیار ہوا تھا جیسا کہ قطب الدین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"اس پر لکڑی کا ایک تابوت تھا۔ اس کی زیارت کی جاتی تھی۔ سنہ ۹۵۰ھ میں امیر کبیر محمد بن سلیمان چرکز دفتر دار مصر نے سلطان سلیم خاں کے زمانہ میں سنگین قبہ تعمیر کرایا۔ اور تابوت شریف پر لباس فاخرہ کا غلاف ڈالا اور یہاں خادم مقرر کیے جن کی تنخواہیں خزانہ صدقات سلطانیہ عثمانیہ سے مقرر کیں جو اب تک (سنہ ۹۸۵ھ) جاری ہیں"۔

(الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام عربی مطبوعہ مصر ص۱۹۸)

سنہ ۱ ۔ قطب الدین کہتے ہیں کہ یہ شخص بڑا فیاض و سخی تھا۔ اس نے حج کیا تھا۔ قافلہ شامی کا امیر حج ہو کر آیا تھا۔ علماء و صلحا کی بڑی خاطر کرتا تھا۔ پھر مظلوم قتل ہوا۔

سنہ ۲ ۔ سلطان سلیم خاں اول کا عہد حکومت سنہ ۹۲۶ھ میں ختم ہو گیا تھا۔ یہ تعمیر سلیم ثانی کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر سنہ ۹۵۰ھ میں وہ بادشاہ نہیں ہوا تھا اس کا عہد سلطنت سنہ ۹۷۴ھ سے سنہ ۹۸۲ھ تک ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ قبہ سلطان سلیمان خاں کے زمانہ میں جس کا عہد حکومت سنہ ۹۲۶ھ سے سنہ ۹۷۴ھ تک ہے اس کے ولی عہد سلیم ثانی کے حکم سے محمد بن سلیمان چرکز نے بنوایا ہوگا۔

محمد بن سلیمان کا بنوایا ہوا قبہ غالباً تیرھویں صدی ہجری کے آغاز تک رہا۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۸ھ میں اہلِ نجد نے مکے پر قبضہ کرکے دوسرے قبوں کے ساتھ اسے بھی منہدم کردیا۔ بارہ تیرہ برس بعد جب ترکوں کا حجاز پر دوبارہ قبضہ ہوگیا تو تخمیناً ۱۲۳۳ھ ہجری میں محمد علی پاشا والی مصر نے از سرِ نو قبہ تعمیر کرادیا۔ بر کھارٹ فرنگی سیاح جو اس زمانہ میں مکۂ معظمہ گیا تھا لکھتا ہے:۔

اس قبر کے گرد چار دیواری کھچی ہوئی ہے۔ اس میں سوائے لوح کے جس پر خطِ کوفی میں آیت الکرسی کندہ ہے اور کوئی دستکاری قابلِ دید نہیں ہے۔ اس کتبے کا رسم الخط قدیم کوفی وضع کا نہیں ہے جس سے مجھے شبہ ہوا کہ یہ پتھر اصل میں اس قبر کا نہیں ہے۔ کتبہ پر کوئی تاریخ بھی نہ تھی۔

شریف سرور[1] نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اس کو حضرت خدیجہ کی قبر کے پاس دفن کریں۔ چنانچہ اس کی قبر بھی اسی چار دیواری میں موجود ہے۔"

(سفرنامہ برکھارٹ مترجمہ خاکسار شبیر مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد ص۱۲۴)

برٹن جو ۱۲۶۹ھ ہجری میں مکے گیا تھا وہ اس قبر کی نسبت یہ لکھتا ہے:۔

"ہم حضرت خدیجہ کے گنبد کے دروازے پر پہنچے۔ ان کی قبر پر سبز غلاف پڑا ہوا تھا اور اس مختصر عمارت کی دیواروں پر مدحیہ اشعار لکھے تھے۔"

(سفرنامہ برٹن انگریزی جلد دوم ص۲۵۰)

جنرل ابراہیم رفعت پاشا لکھتے ہیں کہ:۔

"اس قبے پر میں نے ایک طرف ۱۲۹۸ھ لکھا ہوا دیکھا جس سے ظاہر ہے کہ ۹۵۰ھ کے بعد بھی اس کی تعمیر ہوئی۔"

(مراۃ الحرمین عربی تالیف ۱۳۲۱ھ جلد اول ص۳۱)

میں عرض کرتا ہوں کہ ۹۵۰ھ کا تعمیر شدہ قبہ اہلِ نجد نے ۱۲۱۸ھ میں منہدم کردیا تھا اس کے بعد ۱۲۳۳ھ میں محمد علی پاشا نے قبہ بنوایا جو ۱۲۶۹ھ تک موجود تھا جس کا ذکر برٹن نے

[1] شریف سرور بن مساعد شجاعت، علو ہمت، اور محاسنِ اخلاق میں مشہور ہیں۔ ۱۱۸۶ھ میں شریف مقرر ہوئے ۱۲۰۲ھ میں وفات پائی۔

کیا ہے اس کے بعد ۱۲۹۸ھ میں بزمانۂ سلطان عبدالحمید[1] خاں اس کی تعمیر کی ضرورت ہوئی ہوگی۔
زمانۂ حال کے سیاحوں میں حاجی عبدالرحیم بنگلوری سفر حرمین تالیف ۱۳۲۹ھ ہجری میں لکھتے ہیں:۔

"کسی نیک دل خوشنویس نے نہایت خوشخط لکھ کر ایک سلام[2] فریم میں آئینہ کے ساتھ رکھدیا ہے جس کسی کو مطوف نہ ملے تو اسی سلام کو پڑھ لے۔ سرھانے سنہری حرفوں میں کلمۂ طیبہ خالص سونے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ غلاف پر زرین کام کیا ہے۔ رنگ سبز ہے تین غلاف ہیں۔ پہلوئے مبارک میں ایک اور قبر کسی شریف عبدالمطلب[3] نامی کی ہے۔ یہ آلِ رسول ہے ورنہ اسے یہاں جگہ نہیں ملتی"

(سفر حرمین ص ۱۸۸)

۱۲۹۸ھ ہجری کا تعمیر شدہ قبہ اہلِ نجد نے دوبارہ کے پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ۱۳۴۴ھ میں منہدم کر دیا۔

اس گنہگار نے ۱۳۴۵ھ ہجری میں قبر شریف کی زیارت کی۔ باب معلی سے جانب شمال کوئی ڈیڑھ سو قدم چلنے اور بہت سی قبروں سے گزرنے کے بعد دائیں جانب پہاڑ کے دامن میں یہ قبر ہے اور غالباً عہد اسلامی کی سب سے آخری قبر ہے۔ اس کے بعد اُن صاحبوں کے مزار ہیں جو حضور سرور عالم کی بعثت سے قبل وفات ہوئے معلی میں جب قبے تھے تو پہلا قبہ

---

[1] ان کا زمانہ حکومت ۱۲۹۳ھ سے ۱۳۲۰ھ تک رہا۔

[2] حضرت خدیجہ کے مزار پر عموماً یہ سلام پڑھا جاتا ہے۔ ضرورتاً اس میں کمی بیشی بھی ہو جاتی ہے۔
السّلام علیك یا سیّدتنا یا خدیجۃ الکبریٰ السّلام علیك یا زوجۃ المصطفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنك وارضاك احسن الرضا وجعل الجنۃ مسکنك وماواك ۔ اودعت عندك شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان سیّدنا محمداً عبدہ ورسولہ یعنی اے ہماری آقا خدیجۃ الکبریٰ آپ پر سلام۔ اے محمد مصطفیٰ کی زوجہ محترمہ آپ پر سلام۔ اللہ آپ سے خوش ہو اور آپ کو خوش کرے۔ میں آپ کے سامنے گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور ہمارے سردار محمد اُس کے رسول ہیں۔

[3] شریف عبدالمطلب ۱۲۲۸ھ میں چند روز کے لئے شریف مقرر ہوئے تھے۔ یہ کھارٹ ذیۃ شریف شہر کی تباہی ہے

انھیں کا آتا تھا اس کے بعد حضرت عبد مناف و حضرت عبد المطلب و حضرت ابی طالب کے قبے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت خدیجہ کی قبر کے اطراف دو بڑی اور دو چھوٹی تراشیدہ پتھروں کی سلیں جمی ہوئی تھیں اور ایک تراشیدہ پتھر سرھانے نصب تھا جس پر کوئی کتبہ نہ تھا موجودہ تسلط نجدی سے قبل بھی اس قبر کی یہی حالت تھی۔ حرمین کے تمام مزاروں میں سب سے زیادہ اچھی حالت میں نے اسی قبر کی دیکھی۔

(۶) مزارِ حضرت قاسم ابن رسول اللہ

جناب رسالت مآب کے فرزند قاسم حضرت خدیجہ کے بطن سے مکہ معظمہ میں قبل بعثت تولد ہوئے تھے۔ انھیں کے نام پر آنحضرت صلعم کی کنیت ابو القاسم ہے۔ ان کی وفات زمانہ شیر خوارگی میں ہوئی۔

مورخین مکہ ان کے مدفن کا کچھ ذکر نہیں کرتے اور ان کے مزار کی نشاندہی کسی نے نہیں کی۔ فاکہی نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ آنحضرت کی اولاد ذکور[1] سب بحالت شیر خوارگی مکے میں فوت ہوئی۔ قدیم سیاح بھی ان کے مدفن کے ذکر اور ان کی علامت قبر کے اظہار سے ساکت ہیں۔ زمانہ حال کے سیاح مدفونین معلی میں صرف ان کا شمار ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا نشان قبر بھی بتاتے ہیں۔ مگر اس قبر پر کبھی قبہ نہیں بنایا گیا۔ میں نے معلی میں ۱۳۴۵ھ میں ایک قبر

---

[1] عام طور پر یہ مشہور ہے کہ حضرت خدیجہ کے بطن سے آنحضرت کے چار فرزند ہوئے۔ طیب۔ طاہر۔ قاسم اور عبد اللہ۔ اگرچہ فاکہی ان سب کی وفات مکہ معظمہ میں بتاتا ہے مگر ان میں سے دو صاحبزادوں (طیب و طاہر) کا مزار طائف میں بنا ہوا ہے۔ حیرت ہے کہ ان کی قبر وہاں کس طرح بن گئی۔ آنحضرت دو مرتبہ طائف تشریف لے گئے تھے مگر اس وقت ان صاحبزادوں کے ہمراہ ہونے کے متعلق کوئی روایت دیکھنے میں نہیں آئی۔ آنحضرت کے فرزند حضرت ابراہیم جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ان کا مدفن جنت البقیع میں ہے بعض محققوں کی یہ رائے بھی ہے کہ آنحضرت کے دو ہی صاحبزادے تھے قاسم و ابراہیم اور طیب و طاہر انھیں دونوں کے لقب ہیں ایک کا طیب دوسرے کا طاہر۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ ہی کے یہ دونوں

(بقیہ بر صفحہ ۳۱)

دیکھی تھی جو اس معصوم سے منسوب ہے۔ کتبہ وغیرہ اس پر کچھ نہیں ہے۔ صرف چار سلوں کا بالشت بھر اونچا ایک چبوترہ ہے۔

(۷) مقبرۂ آلِ ابوبکر

وسطِ معلی میں ایک مقام جو حجون کہلاتا ہے اور محلہ حجون کے محاذی واقع ہے۔ وہاں حضرت ابوبکر کے خاندان کی کچھ قبریں ہیں اس وجہ سے میں نے اس مقبرہ کو مقبرۂ آلِ ابوبکر سے موسوم کیا ہے اور گو یہاں حضرت ابوبکر کے والد حضرت ابی قحافہ بھی دفن ہیں۔ مگر آلِ ابوبکر کی کثرت سے یہی نام موزوں معلوم ہوا۔ اس مقبرے کے مشہور ترین مدفونین جن کی قبروں کے آثار اس وقت بھی باقی ہیں ان کا تذکرہ علٰحدہ علٰحدہ کیا جاتا ہے۔

(الف) عبد الرحمان بن ابوبکر۔

یہ حضرت ابوبکر کے بڑے فرزند تھے۔ ہجرت کے وقت غار میں آنحضرت کو کفار کی خبریں پہنچاتے تھے مگر ۳ھ میں کفار قریش کے ہمراہ مسلمانوں کے مقابلہ پر جنگِ اُحد میں بھی شریک تھے۔ حضرت ابوبکر نے جنابِ رسالت مآب سے ان کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کی اجازت چاہی تھی لیکن آنحضرت نے اُن کو روک دیا تھا کہ کسی اور موقع پر اپنی تلوار استعمال کرنا۔ ۸ھ میں یہ ایمان لائے۔ بڑے بہادر اور صاف گو تھے یزید پلید کی ولیعہدی کے متعلق جب امیر معاویہ لوگوں سے بیعت لے رہے تھے تو ایک بڑے مجمع میں انھوں نے ان کو یہ جواب دیا تھا کہ یہ کوئی کسریٰ کا تخت نہیں ہے کہ ایک کسریٰ مرا اور اُس کا بیٹا جانشین ہوگیا۔ ہم یزید کی بیعت ہرگز نہ کریں گے۔ ۵۳ھ میں اِن کی وفات بمقام جبل حبشی ہوئی۔ یہ مقام بقول ازرقی مکۂ معظمہ سے بجانب اسفل یعنی جنوب کی طرف جدھر ڈھلاؤ ہے بارہ میل ہے۔ ازرقی کے بیان سے یہ بھی واضح ہے کہ حضرت عبد الرحمان جبل حبشی ہی میں دفن کیے گئے۔ اِن کی لاش منتقل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لقب ہیں اور چونکہ وہ بعد بعثت پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کو طاہر وطیب کہا گیا ہے۔

کرکے جنت المعلیٰ میں نہیں لائی گئی۔

(اخبار مکہ عربی مطبوعہ جرمنی صـ۳۳۲ و صـ۳۳۴)

مگر تاریخ فاکہی میں ہے کہ ان کا جنازہ مکے لایا گیا اور اذاخر[1] میں دفن کیے گئے۔

(تاریخ فاکہی عربی مطبوعہ لیزک صـ۱۷)

تاریخ ازرقی میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عائشہ ان کی زیارت کے لیے جبل حبشی تشریف لے گئی تھیں۔

(اخبار مکہ عربی مطبوعہ جرمنی صـ۳۳۴)

اس کے خلاف قاضی مولوی محمد سلیمان صاحب اپنے سفرنامے میں فرماتے ہیں کہ:۔

"ان کا جنازہ کندھوں پہ مکے لایا گیا اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اگر میں ان کی رحلت کے وقت موجود ہوتی تو ان کو وہیں دفن کرتی۔ جہاں اُن کی وفات ہوئی تھی"۔ (الہادی صـ۱۰۴)

قدیم سیاح و مشہور مورخ مکہ قطب الدین و ابن ظہیرہ وغیرہ ان کی قبر کی کچھ نشاندہی نہیں کرتے کہ کہاں ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے سیاحوں میں کپتان برٹن نے ان کا ذکر مدفونین معلیٰ کے ضمن میں کرکے یہ لکھا ہے کہ:۔

"یہ وہ بزرگ ہیں جن کی تعظیم شیعہ، سُنّی دونوں کرتے ہیں[2]"۔

زمانۂ حال یعنی چودھویں صدی ہجری کے سیاح ان کا مزار حضرت عبداللہ بن زبیر وغیرہم کی قبروں کے پاس بیان کرتے ہیں۔ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ان کی قبر پر کبھی قبہ تعمیر ہوا ۱۳۴۵ھ میں

---

[1]۔ اذاخر جمع ہے اذخر کی جس کی معنی خوشبودار گھاس کے ہیں، معلیٰ میں ایک جگہ ثنیۃ الاذاخر تھی۔ یعنی اداخر کا ٹیلہ۔

[2]۔ امام جعفر صادق علیہ السّلام کی ننھیال حضرت ابوبکر سے دو جگہ ملتی ہے۔ ایک طرف محمد بن ابوبکر سے دوسری طرف عبدالرحمان بن ابوبکر سے۔ حضرت ابوبکر کے پوتے قاسم بن محمد جناب صادق آل محمد کے نانا تھے یعنی قاسم کی صاحبزادی خود امام جعفر صادق علیہ السّلام کی والدہ تھیں اور قاسم کی بیوی اسما بنتِ عبدالرحمان نانی تھیں۔

تقریباً وسطِ معلیٰ میں ایک قبر میں نے بھی دیکھی جس کے حاشیہ میں پتھر کی سلیں لگی تھیں کتبہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔

(ب) قبر ابو قحافہ۔

یہ حضرت ابو بکرؓ کے والد ہیں۔ اِن کا نام عُثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی ۸ھ میں ایمان لائے تھے۔ ۱۴ھ میں اِن کی وفات ہوئی۔

مورخین مکہ ازرقی، قطب الدین و ابن ظہیرہ نے ان کے مدفن و مقام وفات کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ البتہ محمد اسحاق فاکہی نے ان کا شمار اُن صحابہ میں کیا ہے جن کی وفات مکہ معظمہ میں ہوئی۔ چونکہ ان تمام صحابہ کا مدفن جنھوں نے مکے میں رحلت کی معلیٰ ہی ہے اس لیے غالباً ان کی قبر بھی یہیں ہو گی۔ قدیم سیّاح ان کے مزار کی نشاندہی نہیں کرتے۔ زمانۂ حال کے سیاح معلیٰ میں ایک قبر کا پتہ بتاتے ہیں جو حضرت ابو قحافہ کے نام سے منسوب ہے۔ اس پر کبھی قبّہ تعمیر نہیں ہوا۔ ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے بھی مقبرۂ آلِ ابو بکر میں ایک قبر دیکھی جسے میرے رہنما نے کہا کہ یہ حضرت ابو بکرؓ کے والد کا مزار ہے۔ یہ معمولی بالشت بھر اونچا کچا چبوترہ تھا۔

ج۔ قبر عبد اللہ ابن زبیر۔

عبد اللہ حضرت ابو بکرؓ کے نواسے ہیں۔ ان کی والدہ اسما بنت ابو بکر تھیں۔ ان کی دادی صفیہ بنت عبد المطلب تھیں۔ اس حساب سے زبیر آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد بھائی اور حضرت حمزہ کے بھانجے تھے۔ عبد اللہ بن زبیر پہلے مولود ہیں جن کی ولادت ہجرت کے بعد پہلے سال مدینۂ منورہ میں ہوئی۔ مدینے کے یہودیوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے۔ اب ان کے ہاں اولاد نہ ہو گی۔ اس وجہ سے ان کی ولادت پر مسلمانوں نے خوشی سے نعرۂ اللہ اکبر بلند کیا۔ یہ اُن صحابہ میں ہیں جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی۔ ابن اسحاق نے ان کی نسبت اِن الفاظ میں رائے ظاہر کی تھی کہ ان میں شیر کی بہادری اور لومڑی کی مکاری ہے۔ معرکۂ کربلا کے بعد اہلِ حجاز و یمن و عراق نے ان کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا اور یہ مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ ۶۴ھ میں یزید نے بسر کردگی حصین بن نمیر ایک فوج ان کو مطیع کرنے کے لیے روانہ کی۔ عبد اللہ بن زبیر کے ساتھی کعبے کے گرد خیموں میں پڑے ہوئے تھے اور یزید کی

فوج کوہِ ابو قبیس پر تھی۔ وہاں سے منجنیق کے ذریعہ سے پتھر اور جلتی ہوئی رال کی ہانڈیاں پھینکی گئیں۔ جن سے غلافِ کعبہ کو آگ لگ گئی اور کعبے کی دیواریں جل کر راکھ ہوگئیں۔ یہ واقعہ سہ ربیع الاول ۶۴ھ کا ہے۔ اسی اثناء میں یزید کے مرنے کی خبر پہنچی اور حصین یہاں سے واپس ہوگیا۔ عبد اللہ نے کعبہ از سر نو تعمیر کیا۔

جب حکومت شام آلِ یزید سے منتقل ہوکر آلِ مروان میں آئی تو عبد الملک بن مروان نے ۷۲ھ میں تین ہزار کا ایک لشکر بہ ماتحتی حجاج بن یوسف[1] ان کو مطیع کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اس کے بعد پانچ ہزار فوج بسر کردگی طارق اور بھیجی۔ غنیم نے ابو قبیس پر منجنیق لگائی اور کعبے کا محاصرہ کرلیا۔ جب محاصرہ نے طول کھینچا اور ان کے لشکر میں سامان خورد و نوش کی کمی ہوگی اور داد و دہش میں بھی انھوں نے کوتاہی کی تو ان کے بہت سے ساتھی ان کو چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔ یہاں تک کہ ان کے دو لڑکے حمزہ و حبیب بھی حجاج کے ساتھ ہوگئے۔ چھ مہینے سترہ دن محاصرہ رہا۔ کئی مرتبہ بڑے خونریز معرکے ہوئے۔ خاص بیت اللہ میں سخت جنگ ہوئی۔ آخر سہ شنبہ کے دن ۱۷ جمادی الاول ۷۳ھ کو ابن زبیر مرنے پر مستعد ہوکر باہر نکلے۔ دشمن پر زبردست حملہ کیا۔ اس کو ڈھکیلتے ہوئے حجون تک لے گئے اور خود اپنے ہاتھ سے بہت لوگوں کو مارا۔ شامی لشکر ان پر اینٹ پتھر اور تیروں کا مینہ برسا رہا تھا۔ ایک پتھر ان کے سر پر لگا جس نے ان کا خاتمہ کردیا۔ اور اس طرح تہتر برس کی عمر میں نو برس کی پر آشوب خلافت کے بعد میدان جنگ میں مارے گئے۔ اہلِ شام ان کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس لائے اس نے سجدۂ شکر ادا کیا اور شامیوں نے بہ آواز بلند تکبیر کہی۔ حجاج نے ان کا سر عبد الملک کے پاس دمشق بھیجدیا اور ان کی لاش کو معلّے کے حصہ حجون میں بمقام ثنیۃ المدنیین صلیب پر الٹا لٹکا دیا۔ جو بہت دن تک لٹکی رہی بالآخر ان کے بھائی عروہ ابن زبیر نے عبد الملک سے ملکر اس کے دفن کی اجازت حاصل کی اس بوسیدہ لاش کو ان کی والدہ نے غسل دیا۔ عروہ بن زبیر نے نماز جنازہ پڑھائی اور غالباً اسی جگہ جہاں ان کو صلیب دی گئی تھی سپرد خاک کردیا۔ (توضیحاً ان کی والدہ کی قبر کے حالات ملاحظہ ہوں)۔ مکہ معظمہ کے مورخ فاکہی وغیرہ یہ تو کہتے ہیں کہ وہ مکے میں دفن ہوئے مگر ان کی قبر کی کوئی صراحت نہیں کرتے

[1] حجاج بن یوسف خلیفہ عبد الملک کا فوجی افسر تھا۔ عالم اسلام میں بہت بڑا ظالم گزرا ہے ایک لاکھ ۲۰ ہزار آدمیوں کا خون اسکی گردن پر ہے اور [illegible]

زمانۂ قدیم میں ان کی صلیب گاہ پر ایک عمارت بنی ہوئی تھی جس کا ذکر ابن جبیر نے ۵۷۹ھ میں اور ابن بطوطہ نے ۷۲۶ھ میں کیا ہے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ عمارت کیا تھی قبہ تھا یا اور کچھ۔ اور وہ کس نے بنوائی تھی۔ اُس وقت بھی وہ عمارت ثابت نہ تھی۔ صرف ایک نشان باقی رہ گیا تھا۔ عمارت کو اہل طائف نے منہدم کردیا تھا کہ لوگ اُس کو دیکھ کر حجاج پر لعنت کرتے تھے اور حجاج اہل طائف سے تھا۔

(ترجمۂ سفرنامہ ابن جبیر ص ۸۴)

مکۂ معظمہ کی تاریخوں میں اس کا پتہ مجھ کو نہ ملا کہ ان کی قبر پر کس زمانہ میں قبہ بنایا گیا۔ مورخین مکہ تو ان کی قبر کی نشاندہی بھی نہیں کرتے۔ البتہ چودھویں صدی کے سب سیاح اُن کی قبر معلی میں بتاتے ہیں۔ عباس حلمی پاشا خدیو مصر کے سفر نامۂ حجاز تالیف ۱۳۲۷ھ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قبر پر بھی قبہ تھا جو شریف عون الرفیق نے منہدم کردیا۔ غالباً یہ قبہ محمد علی پاشا کا بنوایا ہوا ہوگا۔ اس کے بعد پھر کوئی قبہ تعمیر نہیں ہوا۔ اور ۱۳۴۴ھ میں اہل نجد کو ان کی قبر کی تراش خراش کی تکلیف گوارا نہیں کرنی پڑی۔ ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے جنت المعلیٰ کی زیارت کے وقت تقریباً وسط میں بمقام حجون ایک قبر دیکھی۔ جو زمین سے بالشت بھر اونچی تھی۔ اس کے اطراف سلیں رکھی ہوئی تھیں کوئی کتبہ نہ تھا۔ یہ قبر انھیں کے نام سے موسوم تھی۔

(د) اسما بنتِ ابو بکر۔

اسما حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی اور عبداللہ ابن زبیر کی والدہ ہیں۔ یہ ہجرت سے ستائیس سال قبل مکے میں پیدا ہوئی تھیں۔ اور ہجرت سے قبل ایمان لائی تھیں۔

ان کے فرزند عبداللہ بن زبیر کے حالات اوپر لکھے جاچکے ہیں۔ میدانِ جنگ میں جاتے وقت جو گفتگو ان ماں بیٹوں میں ہوئی ہے وہ عرب کی تاریخوں میں یادگار ہے کہ کس طرح سو برس کی ایک ضعیف ماں اپنے لڑکے کو مرنے کے واسطے میدان کارزار میں بھیجتی ہے۔ جب عبداللہ دشمنوں کے نرغے میں بُری طرح پھنس گئے تو مرنے پر تیار ہوکر مقتل میں جانے کے واسطے اپنی ماں سے ملنے گئے۔

اور کہا اے ماں۔ مجھے لوگوں نے دھوکا دیا۔ یہاں تک کہ میرے لڑکوں نے بھی دشمن سے مل کر مجھے ذلیل کر دیا۔ اگر میں چاہوں تو دشمن مجھے دنیا دے سکتے ہیں۔ اِس میں تمھاری کیا رائے ہے؟

آسمانے جواب دیا اگر تم حق پر ہو اور حق کے لئے لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہو تو جو کچھ کر رہے ہو کیے جاؤ۔ تم اپنی گردن ایسی رسی میں مت پھنساؤ جس سے بنی امیہ کے چھوکرے کھیلیں۔ اگر تمھارا خیال دنیا حاصل کرنے کا تھا تو تم نے اچھا کام نہ کیا۔

عبداللہ نے کہا میرا خیال ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر کے میری کھال کھینچیں گے۔ اور صلیب پر چڑھائیں گے۔

اسمانے جواب دیا جب بھیڑ ذبح کر ڈالی گئی تو پھر اُس کو پروا نہ کرنی چاہیئے۔ خواہ قسائی اُس کی کھال کھینچے یا اُس کا قیمہ کر ڈالے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو ہمت کے ساتھ کیے جاؤ اور خدا سے مدد کے طالب رہو۔

عبداللہ نے اپنی ماں کی پیشانی کو چوما اور کہا یہی میری رائے ہے۔ میں صرف آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت جب آسمانے ان کو گلے لگایا تو ان کے جسم میں زرہ معلوم ہوئی۔ پوچھا یہ کیوں پہن رکھی ہے کہا اطمینان کے لئے۔ ماں نے کہا دل قوی ہونا چاہیئے۔ ایسی چیزوں سے کیا اطمینان ہوتا ہے۔ معمولی لباس کافی ہے۔

عبداللہ نے زرہ اتار دی۔ آستینیں چڑھائیں۔ عبا کے دامن کمر سے باندھ لیے۔ بسم اللہ کہکر گھر سے نکلے۔ اور میدانِ کارزار میں عربی شجاعت کا ایک نمونہ دکھا دیا۔

عبداللہ کے قتل کے بعد حجاج بن یوسف نے اسما کو بلایا تھا کہ طعنے دے کر اپنے دل کا بخار نکالے گر یہ نہیں گئیں۔ حجاج نے کہلا بھیجا کہ اگر تم نہ آؤ گی تو میں ایسے لوگوں کو بھیجونگا جو سر کے بال پکڑ کر تمکو گھسیٹتا ہوا لائیں گے۔ یہ اب بھی نہ گئیں۔ آخر حجاج خود ان کے پاس گیا اور ازراہ طعن پوچھا تم نے دیکھا تمھارے بیٹے کا کیا حشر ہوا؟ بڑی بی نے جواب دیا ہاں تم نے اُس کی دنیا خراب کر دی۔ اُس نے تمھارا دین بگاڑ دیا۔

عبداللہ کے مصلوب ہونے کے تین دن بعد اسما کا گزر اُن کی صلیب گاہ پر ہوا۔ اپنے

بیٹے کی لاش لٹکی ہوئی دیکھکر کہا:-

"کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ یہ شہ سوار اپنی سواری سے اُترے"!

اسما کی دعا تھی کہ بیٹے کی لاش دفن کرنے کے بعد وہ مریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بروایت مشہور عبداللہ کی لاش دفن ہونے کے دس دن بعد، ۲۷ رجمادی الاول ۷۳ھ کو انھوں نے وفات پائی۔ میرے خیال میں اسما کی تاریخ وفات جو عام مورخ بتاتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ عبداللہ ۱۷ رجمادی الاول ۷۳ھ کو قتل کیے گئے۔ ان کے بھائی عروہ نے دمشق جا کر ان کے دفن کی اجازت حاصل کی۔ عروہ کے مکہ معظمہ سے دمشق تک جانے آنے میں کم سے کم ایک مہینہ صرف ہوا ہوگا۔ اس کے بعد اور دس دن شمار کیے جائیں تو ۲۷ رجمادی الثانی ۷۳ھ حضرت اسما کی تاریخ وفات قرار پاتی ہے۔

مورخین مکہ اور قدیم سیاح حجاز حضرت اسما کی قبر کا ذکر نہیں کرتے۔ محمد اسحاق فاکھی نے ان کے دادا اور ان کے بھائیوں کی وفات کا ذکر تو کیا ہے کہ مکے میں ہوئی مگر ان کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ چودھویں صدی ہجری کے سیاح ان کا مدفن معلی میں بتاتے ہیں اور ان کی قبر کی نشاندہی کرتے ہیں مگر اس پر قبے کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے مقبرۂ آل ابو بکرؓ میں عبداللہ بن زبیر کی قبر کے پاس ایک قبر دیکھی جس کو میرے رہنماؤں نے کہا کہ اسما بنت ابو بکر کا مزار ہے۔ اس قبر کی بھی وہی شکل تھی۔ جس کی صراحت دوسری قبروں کے ضمن میں کیجا چکی ہے۔

(۸) عبداللہ ابن عمرؓ

کثرتِ شہرت کے باعث اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب کے حالات تفصیل سے بیان کیے جائیں۔ اہلِ سنت کی کتبِ احادیث میں دو ہزار سے زاید حدیثیں ان سے روایت کی گئی ہیں۔ ۷۴ھ میں حجاج بن یوسف کے

اشارہ سے کسی شخص نے ان کو زہر آلود خنجر سے زخمی کیا تھا جس سے یہ جاں بر نہ ہو سکے اور چوراسی برس کی عمر میں بمقام مکہ وفات پائی۔ ان کے مدفن کے متعلق اختلاف ہے۔ ازرقی کہتا ہے :-

"وہ اُس وقت اپنے دوست خالد بن اُسید کے مکان میں مقیم تھے۔ وقت وفات انھوں نے اپنے دوست کو وصیت کی کہ ان کی نماز جنازہ حجاج بن یوسف نہ پڑھائے۔[1] چنانچہ خالد نے رات کے وقت اپنے مکان کے دروازے کے پاس نماز جنازہ پڑھائی اور اُس مقبرے میں جو ثنیۃ الاذاخر کے متصل ہے کھجوروں کے احاطے میں دفن کر دیا۔"

(اخبار مکہ عربی مطبوعہ جرمنی صـ۲۲۳)

جاراللہ محمد ابن ظہیرہ کہتے ہیں کہ :-

"رات کے وقت چونکہ ان کی تدفین ہوئی تھی۔ اس وجہ سے ان کی قبر پوشیدہ ہے"

(جامع اللطیف عربی مطبوعہ مصر صـ۳۴۸)

تقی الدین فاسی کہتا ہے :-

اُن کی قبر محصب کی جانب مشرق ثنیۃ الاذاخر[2] میں ہے۔ بعضوں کا یہ زعم ہے کہ ان کی قبر حجون[3] میں ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ان کی قبر اُس ٹیلے پر ہے جو حجون کے محاذی ہے" (شفاء الغرام عربی مطبوعہ لزک صـ۸۲و۲۱)

---

[1] آنحضرت کے زمانہ سے یہ دستور تھا کہ نماز جنازہ والی شہر پڑھاتا تھا۔ اس دستور کے بموجب بعض نالائق بھی اچھے اچھے صحابہ کی نماز جنازہ پڑھا دیتے تھے۔ چنانچہ امام حسن علیہ السلام کی نماز جنازہ سعید بن مروان والی مدینہ نے پڑھائی تھی اور اس کو امام حسین علیہ السلام نے بکراہت اجازت دی تھی۔

[2] ثنیہ۔ ٹیلا۔ اذاخر۔ خوشبودار گھاس۔ جمع اذخر کی ہے۔

[3] قبرستان معلی کا وہ حصہ جو قبرستان معلی میں داخل ہونے کے بعد زائر کے بائیں جانب نظر آتا ہے وہ حجون ہے وادی محصب یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اس طرف کچھ مکانات بھی ہیں جن کی وجہ سے اس آبادی کا نام محلہ حجون ہے

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ میں ان کا مدفن باختلاف روایات حسب ذیل چار جگہ بیان کیا گیا ہے:۔

(۱) محصب

(۲) ذی طوی

(۳) فخ

(۴) سرف

(مراۃ الحرمین عربی مطبوعہ مصر جلد اول صد ۲۹)

محصب ایک وادی ہے جو مکے کی طرف معلی سے شروع ہوتی ہے اور منیٰ کی جانب سبیل الست[۱] پر ختم ہوتی ہے۔ آنحضرت نے منیٰ سے مکے واپس ہوتے وقت محصب میں قیام فرمایا تھا اس لیے حاجیوں کے لیے یہاں قیام کرنا مستحب ہے۔

ذی طویٰ مکے کے جانب غرب تین چار میل کے فاصلہ پر ایک بلند مقام ہے۔ آجکل اس کو آبار الزاہر کہتے ہیں۔ اس کا یہ نام زاہر کے کنوؤں کی وجہ سے پڑ گیا ہے فخ مکہ معظمہ سے تین چار میل کہا جاتا ہے۔ مورخ اس کو مسجد تنعیم سے آگے بتاتے ہیں۔ جہاں سے عمرہ کا احرام باندھا جاتا ہے۔ میرے رہناؤں نے اس کے نام سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ موضع سرف مکہ معظمہ سے جانب شمال و مغرب مدینے کے رستے میں درب سلطانی پر واقع ہے۔ مورخین و سیاح مکے سے اس کا فاصلہ دس پندرہ میل تک بتاتے ہیں۔ کم سے کم سات آٹھ میل کہا جاتا ہے۔ یہاں ام المومنین حضرت میمونہ کا مزار ہے توضیحاً سرف کے حالات حضرت میمونہ کی قبر کے ذکر میں ملاحظہ ہوں۔

مذکورہ بالا چار پانچ مقامات کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی قبر مقام شہدا میں بھی معہود ہے۔ یہ جگہ مکہ معظمہ سے جانب شمال مدینے کی راہ سلطانی پر کوئی تین میل ہے۔ مگر مورخین مکہ

---

[۱] منیٰ کے پاس ایک بڑا سنگین حوض ہے جو سبیل الست کہلاتا ہے۔ حج کے زمانہ میں اسے نہر زبیدہ کے پانی سے بھر دیتے ہیں۔ سبیل ایک چھوٹی سی عمارت ہوتی ہے جو اکثر حوض کے کنارے بنا دی جاتی ہے۔ مسافر یہاں پانی پینے، نماز پڑھنے، اور آرام لینے کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ "ست" مخفف ہے سیدہ کا۔

اس جگہ ان کی قبر نہیں بتاتے تفصیل کے لیے فصل دوم میں حالاتِ قبرستان شہدا ملاحظہ فرمائے جائیں۔

مذکورۂ بالا سات مقامات میں سے جو عبداللہ بن عمرؓ کے مدفن بیان کیے جاتے ہیں۔ تین مقام (۱) ثنیۃ الاذاخر (۲) محصب (۳) حجون تو قبرستان معلیٰ ہی کے مختلف حصے ہیں۔ اور حضرت عبداللہ کی قبر جو معلیٰ میں موجود ہے وہ ان تینوں مقامات پر حاوی ہوسکتی ہے۔ لیکن بقیہ چار مقامات (۴) ذی طویٰ (۵) فخ (۶) سرف (۷) شہدا۔ جنت المعلیٰ سے اور نیز ایک دوسرے سے کئی کئی میل کے فاصلہ پر ہیں۔ ذی طویٰ فخ اور سرف میں علامتِ قبر بھی نہیں ہے۔ سرف کے متعلق جمال الدین محمد بن جار اللہ ابن ظہیرہ کہتے ہیں کہ وہاں بجز حضرتِ میمونہ کے اور کسی صحابی کی قبر نہیں ہے۔

۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے معلیٰ میں ایک قبر دیکھی جو حضرت عبداللہ بن عمر سے منسوب تھی۔ آجکل اس جگہ کو محصب کہتے ہیں۔ اس پر قبہ پیشتر بھی نہ تھا۔ تقریباً بالشت بھر اونچی قبر ہے جس کے چار طرف پتھر رکھے ہیں۔ کتبہ نہیں ہے۔ یہی حالت ان کی قبر واقع میدانِ شہدا کی ہے۔

(۹) معلیٰ کے بعض دوسرے مزار

مزاراتِ معلیٰ میں ہم نے صرف اُن قبروں کا ذکر کیا ہے جن کی زیارت بطور خاص حجاج وزائرین کرتے ہیں اور چونکہ مدفونین معلیٰ میں وہ زبردست شخصیت رکھتے ہیں اس لیے اُن کے مختصر حالات بھی درج کردیے ہیں۔ اگر اُن تمام صحابہ وتابعین کا تذکرہ کیا جائے جو بہ قیاس غالب یہاں دفن ہیں۔ اور جن کی قبروں کا اب کوئی اثر آثار بھی نہیں ہے تو ایک بڑی بھاری کتاب بن جائے تاہم اُن علماء فقہاء و مشائخین وغیرہ کے نام یہاں ہم بھی لکھ دیتے ہیں جن کو بعض مورخوں اور سیاحوں نے معلیٰ کے سونے والوں میں گنایا ہے۔

(۱) الفضیل بن عیاض، (۲) شیخ تقی الدین المکی (۳) شیخ عبداللہ بن عمر المعروف بہ طواشی

(۴) شیخ عبداللطیف نقشبندی رومی (۵) سفیان بن عیید (۶) شیخ ابوالحسن شولی (۷) شیخ خلیل المالکی۔

(الاعلام ص ۱۹۸)

(۸) امام الحرمین عبدالمحسن بن عبدالحمید (جامع اللطیف ص ۳۴۷)

(۹) ابوجعفر منصور خلیفہ بغداد[1] (۱۰) ابی لہب[2] (سفرنامۂ ابن بطوطہ جلد اوّل)

(۱۱) محمد علی پاشا والی مصر کی بیگم (۱۲) شریف محمد بن عون (رحلۃ الحجازیہ خدیو عباس حلمی پاشا)

(۱۳) ملا علی قاری (۱۴) سید احمد رفاعی (۱۵) ابوالبرکات شیخ عثمان ہارونی (۱۶) حضرت طاؤس

(رفیق الحجاج وسفر حرمین)

مکۂ معظمہ کے مطوف مذکورہ بالا اشخاص میں سے بلحاظ اپنے عقیدے اور معلومات کے بعض کی قبروں پر فاتحہ پڑھا دیتے ہیں۔ ان میں سے نمبر (۲) سے نمبر (۸) تک کی قبریں زائد دراد سے لاپتہ ہیں۔

(۱۰) معلیٰ میں قبروں کیلیے زمین

جس طرح ہندوستان کے مشہور قبرستانوں اور درگاہوں کی زمینیں قبروں کے لیے فروخت ہوتی ہیں اور تکیہ دار کھلم کھلا یہ بیوپار کرتے ہیں۔ اسی طرح مکۂ معظمہ میں بھی قبرستان معلی بعض لوگوں کی املاک بن گیا تھا۔ ہر متبرک قبر کے مجاور اس کے آس پاس کی زمین پر قابض ہو گئے تھے اور یہاں کے گڑنے والوں سے خاطر خواہ رقمیں وصول کیا کرتے تھے۔ جنت کے اس ٹکڑے میں زمین کا مفت ملنا دشوار تھا۔ غریب غربا اور لاوارث مُردے یا تو ادھر اُدھر کہیں دفن کر دیے جاتے تھے یا معلی ہی میں مقدس قبروں سے دور کہیں دبا دیے جاتے تھے۔ زمین کی قیمت مرنے والے کی حیثیت اس کے وارثوں کی وجاہت اور اس بزرگ کی عظمت کے لحاظ سے لی جاتی تھی جس کے

[1] اس کا ذکر کتاب ہذا کے باب دوم فصل دوم میں حضرت نفس زکیہ کے حالات میں ملاحظہ ہو۔

[2] ابی لہب کی قبر حجون میں پتھروں کا ایک ڈھیر ہے۔ جو زائر ادھر سے گذرتا ہے۔ لاحول پڑھ کر ان پتھروں میں اضافہ کر جاتا ہے۔

جوار میں دفن ہونے کی کوئی وصیت کرتا تھا جہاں مُردے کے وارث اپنے عزیز کو تہ خاک کرنا چاہتے تھے۔ سادات حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے روضۂ مبارک کے قریب دفن ہونے کی تمنا کرتے تھے شیعوں کی قبریں اکثر حضرت عبد المطلب کے مقبرے کے حوالی میں ہوتی تھیں فاروقی عموماً حضرت عبد اللہ بن عمر کی پائینتی گڑنا پسند کرتے تھے اور صدیقی مقبرۂ آل ابوبکر میں جگہ ملنے کے خواہشمند رہتے تھے۔ اب سے چالیس پچاس برس قبل معمولی زمین میں ایک ایک قبر کی قیمت دس دس روپیے اور حضرت خدیجہ کے قرب و جوار میں بیس بیس روپیے تھی۔ ضروریاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ قبروں کی زمین بھی بھاری قیمت پر جانے لگی تھی اور موقع و محل کے لحاظ سے ایک ایک قبر کی قیمت سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیے تک چڑھ گئی تھی معلیٰ میں بنی بنائی قبریں بھی پہلے سے تیار رکھی جاتی تھیں۔ یہ ایک قسم کے تہ خانے تھے جو بعض مشہور بزرگوں کی قبروں کے متصل یا اور کہیں مناسب مقام پر کھود دیے گئے تھے۔ ان میں ایک دروازہ ہوتا تھا جس پر پتھر کی سل ڈھکی رہتی تھی۔ جب کوئی میت ان میں رکھنے کے لیے لائی جاتی تو دروازے کا پتھر ہٹا کر ایک شخص میت کا سر اپنے ہاتھوں میں سنبھالے اندر اُتر جاتا۔ دو آدمی قبر کے باہر مردے کی ٹانگیں پکڑے اوپر سے آہستہ آہستہ چھوڑتے جاتے۔ تہ خانے والا شخص مُردے کو سنبھال کر اندر لٹا دیتا اور کافور و نمک چھڑک کر باہر نکل آتا تھا۔ چند روز میں زمین کی شوریت اور مکے کی گرم آب و ہوا کے اثر سے گوشت پوست سب گل گلا کر مٹی ہو جاتا تھا۔ بچی کھچی ہڈیاں معلیٰ کے پہاڑوں میں پھینک دی جاتی تھیں اور پھر یہ بچھونا نئے آنے والوں کے لیے تیار کر دیا جاتا تھا۔ معلیٰ میں ایسے کئی تہ خانے تھے جو ہمیشہ کام دیا کرتے تھے اور مجاوروں کی نیت کی برکت سے ان میں اس قدر گنجائش تھی کہ دنیا جہاں کا مردہ وہاں گڑ سکتا تھا۔

بعض مالدار مصری و ہندوستانی حاجی اس خیال سے کہ ان کا عزیز خوابگاہ معلیٰ میں چین کی نیند سوتا رہے اور کوئی اُس کے آرام میں خلل انداز نہ ہو۔ قبر یا تہ خانے کی قیمت ادا کرنے کے بعد قبر کی بقا کے لیے تکیہ داروں کی سالانہ تنخواہیں مقرر کر دیتے تھے۔ جب تک تنخواہ پہنچتی رہتی تھی وہ قبر اُسی مردے کے نام سے موسوم رہتی تھی۔ کتبے پر نام بھی اُسی کا کندہ رہتا تھا مگر دوسرے مُردے بھی اُس میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اِدھر تنخواہ موقوف ہوئی۔ اُدھر کتبہ اکھاڑ دیا پھر وہی

قبر کسی اور نام سے منسوب ہوجاتی تھی۔ اور دوسرا کتبہ لگا دیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک ایک قبر میں کئی کئی مُردے آتے تھے اور چلے جاتے تھے اور ایک ہی قبر پر کبھی کسی کا اور کبھی کسی کا کتبہ نصب ہو جاتا تھا۔

اب حکومتِ نجد نے معلیٰ کو تکیہ داروں کے ہاتھ سے چھڑا کر وقف کر دیا ہے۔ قبر کی زمین اور تہہ خانوں کی خرید و فروخت موقوف ہو گئی ہے۔ کفن کھسوٹ تکیہ دار اگرچہ کھلے خزانے اب یہ بیوپار نہیں کرتے مگر میں نے سنا کہ غسّال و گورکن مُردے کو کسی اچھی جگہ لیجا کر رکھنے اور کسی بزرگ کے پڑوس میں قبر کھودنے کی اُجرت کچھ زیادہ ہی وصول کر لیتے ہیں اور چھپا چوری اُس میں سے تکیہ داروں کو بھی کچھ مل ہی جاتا ہے تاہم اب یہ ناجائز تجارت قریب قریب بند ہو گئی۔

لے۔ پردیسی حاجیوں کے غسلِ میت کا انتظام عموماً مطوّف کرتے ہیں اور ورثائے میت کی حیثیت کے اعتبار سے غسّالوں کو رقم دلائی جاتی ہے۔ کم سے کم چار پانچ روپیہ دینے پڑتے ہیں۔ اس میں مطوفوں کا بھی حصّہ ہوتا ہے۔ تختہ غسل و تابوت کرایہ سے ملتا ہے۔ یہ بھی حیثیت پر منحصر ہے۔ مگر دو ڈھائی روپیہ اس کے بھی لے لیتے ہیں۔ میت کی قبرستان تک پہنچائی کا حساب عموماً اُس فاصلہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جہاں سے جنازہ لے جاتے ہیں۔ یہ نظرِ ثواب نمازِ جنازہ کے لیے بیت اللہ میں میت کا لے جانا ضروری ہے۔ یہاں سے پھر معلیٰ پہنچاتے ہیں اور اس طرح غسّالوں کو کم سے کم ڈیڑھ میل تو چلنا ہی پڑتا ہے۔ اس کی مزدوری اقل درجہ پانچ چھ روپیے دینی ہوتی ہے۔ مفلس حاجیوں کے دفن کا انتظام سرکار سے ہو جاتا ہے۔ میں نے سنا کہ حکومتِ نجد نے حاجیوں کی تجہیز و تکفین وغیرہ کے متعلق قواعد مقرر کر دیے ہیں اور اب غسّالوں اور مطوفوں کو اس مد میں وہ موقعے حاصل نہیں رہے جو پہلے تھے۔ شیعوں کی نمازِ جنازہ شیعہ طریق پر اول مکان میں پڑھا دیتے ہیں۔ پھر بیت اللہ میں لیجا کر اہلِ سنت کے طریق پر پڑھاتے ہیں۔ اگر بیت اللہ میں نہ لے جائیں تو کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہے۔ میں ایک مرتبہ ایرانی مطوف مرزا طاہر کے پاس بیٹھا ہوا تھا اُس وقت ایک ایرانی حاجی کا جنازہ اُن کے مکان سے باہر آیا۔ اور نمازِ جنازہ وہیں پڑھائی گئی۔ میں نے پوچھا کیا بیت اللہ میں بھی نماز کے لیے میت کو لے جائیں گے۔ کہا میت کے ورثار اتنی مزدوری دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اس لیے پاس کے پاس معلیٰ میں پہنچائے دیتے ہیں۔

(۱۱) مزاراتِ معلیٰ کی صحت و عدم صحت

اگرچہ تیرھویں چودھویں صدی ہجری کے عام سیاحانِ حجاز جنت المعلیٰ میں حضرت عبد مناف و حضرت عبد المطلب اجداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ حضرت ابی طالب عمِ رسول اللہ حضرت آمنہ بنتِ وہب والدۂ ماجدۂ سرور کائنات۔ حضرت خدیجہ زوجۂ رسول اللہ۔ حضرت قاسم ابنِ رسول اللہ۔ حضرت ابو قحافہ والد حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عبد الرحمان بن ابوبکر و اسما بنت ابوبکر و حضرت عبد اللہ بن زبیر و حضرت عبد اللہ بن عمر وغیرہم اصحاب کی قبروں کی نشاندہی کرتے ہیں مگر مورخین مکہ اور قدیم سیاح اِن میں سے اکثر و بیشتر اصحاب کی قبروں کی صراحت سے ساکت ہیں۔ مذکورۂ بالا قبروں میں سے بہت سے اصحاب کی قبروں کا پتہ تیسری صدی ہجری سے گیارھویں صدی ہجری کے اوائل تک نہ تھا۔ ابن جبیر جنھوں نے ۵۷۹ھ میں حج کیا تھا جنت المعلیٰ کے مدفونین کے متعلق لکھتے ہیں :-

"مزار کہنہ و بے مرمت ہو گئے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو اہل مزار کے نام تک یاد نہیں"۔

ابن بطوطہ نے بھی ۷۲۶ھ میں یہی رائے ظاہر کی ہے :-

"اس جبانہ میں صحابہ و تابعین و علماء و صلحا کے جم غفیر کا مدفن ہے۔ مگر ان کے مشاہد کہنہ و بے نشان ہو گئے ہیں کہ اہلِ مکہ کو ان کا علم نہیں رہا۔ الا چند مشاہد کے"

مزاراتِ معلیٰ کی عدم صحت کے بارے میں جمال الدین بن محمد جار اللہ ابن ظہیرہ مؤلفِ کتاب جامع اللطیف کی رائے قابلِ غور ہے۔ یہ کتاب ۹۵۰ھ ہجری میں تالیف ہوئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

"مقبرۂ معلیٰ میں سادات و صحابہ و تابعین و اکابر علما و صالحین دفن ہیں لیکن صحابہ میں سے اِس وقت کسی کی قبر کا صحت کے ساتھ یقین نہیں کہ کہاں ہے"۔

(جامع اللطیف عربی مطبوعہ مصر ص۳۲۷)

معلیٰ کی قبروں کی صحت یا عدم صحت کی بحث مزارات کے ضمن میں کی جا چکی ہے۔ زمانہ قدیم میں قبروں کے لاپتہ ہو جانے کے وجوہ جنت البقیع کے حالات میں درج کیے جائیں گے یہاں صرف اس قدر عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن صحابہ کے مقبرے اس وقت جنت المعلیٰ میں بنے ہوئے ہیں گو وہ فرضی ہی سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے اکثر کا مدفن جنت المعلیٰ ضرور ہے۔ خواہ وہ مدفن موجودہ قبریں ہوں یا معلیٰ کا کوئی اور گوشہ۔ ایسے بڑے قبرستانوں میں ہم کو کسی بزرگ پر سلام و فاتحہ پڑھنے کے لیے کوئی خاص قبر یا قبے کی تلاش نہ کرنی چاہیے۔ جنت المعلیٰ ہو یا جنت البقیع۔ یہ گنج شہیداں ہیں یہاں کی خاک کا ایک ایک ذرہ ایک ایک بزرگ کی قبر ہے ۔
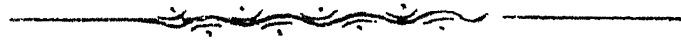
فصلِ دُوّم

مکّے کے بعض دُوسرے قبرستان

(۱) قبرستان منےٰ

منےٰ مکہ معظمہ سے کوئی دو کوس جانبِ شمال واقع ہے۔ یہ ایک وادی (گلی) ہے جس کی لمبائی میل بھر ہوگی۔ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے خشک بنجر اور جھلسے ہوئے پہاڑ ہیں۔ اس کے بیچ میں عرفات[۵] کو سڑک جاتی ہے۔ وادی منےٰ میں دونوں طرف مکے والوں کے

۵۔ عرفات مکہ معظمہ سے جانبِ شمال نو کوس ہے۔ یہاں ایک بڑا میدان اور ایک پہاڑی ہے۔ جسے جبل عرفات کہتے ہیں اور اس کے متصل ایک اور پہاڑی چوٹی ہے جو جبل رحمت کہلاتی ہے۔ نویں ذیحجہ کو تمام حاجی یہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ حالتِ نزع میں بھی یہاں پہنچا دیا جاتا ہے۔ وقوفِ عرفات حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ جس کے بغیر حج کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ زوالِ آفتاب کے وقت سے غروب آفتاب تک یہاں حاجی ٹھہر کر توبہ و استغفار میں مصروف رہتے ہیں۔ پہاڑی کے نزدیک ایک مسجد ہے جسے مسجد ابراہیمی کہتے ہیں۔ یہاں امام خطبہ پڑھتا ہے جو تین بجے شروع ہوکر سر مغرب ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن حاجیوں کا مجمع چونکہ دور دور تک پھیلا رہتا ہے اس لیے صرف قریب ہی کے حاجی سُن سکتے ہیں۔ دور والے دعا و توبہ کرتے رہتے ہیں اُس روز تمام حاجی ننگے سر ننگے بدن حالتِ احرام میں ایک چادر باندھے ایک چادر اوڑھے ہوتے ہیں۔ قیامِ عرفات کے بعد ہر شخص حاجی کے مقدس خطاب سے سرفراز ہوجاتا ہے۔ عرفات کی مفصل کیفیت سفرنامے میں عرض کی گئی ہے۔

سو ڈیڑھ سو دو منزلہ وسہ منزلہ مکان ہیں۔ راستے سے ہٹے ہوئے اور بھی چھوٹے بڑے مکان ہیں اور ان سب کی مجموعی تعداد ایک ہزار ہوگی۔ یہ برس بھر تک خالی پڑے رہتے ہیں[۱] اور صرف حج کے دنوں میں پانچ چھ دن کے لیے کرایہ پر اٹھا دیے جاتے ہیں[۲]

زمانۂ حج میں وادی منٰے ایک بازار بن جاتی ہے اور خورد و نوش کی تمام ضروریات اور ممکنہ سامان یہاں مل جاتا ہے۔ ذیحجہ ۱۳۴۵ ہجری میں یہاں میں نے خربوزے۔ تازہ شیریں آلو بخارے اور اعلیٰ درجہ کے آڑو خریدے تھے[۳]۔ منٰے میں حاجی ۸ ذی حجہ کی سہ پہر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور پانچ نمازیں یہاں ادا کرنے کے بعد نویں کی صبح کو عرفات روانہ ہو جاتے ہیں۔ واپسی میں پھر دس تاریخ سے تیرہ تک یہاں ٹھہرنا مستحب ہے۔ رمی الجمرات[۴] (شیاطین پر کنکریاں مارنا)

۱۔ اگرچہ منٰے میں کوئی مستقل آبادی نہیں ہے اور حفاظت و نگرانی کے سامان بھی یہاں مہیا نہیں ہیں۔ نہ کوئی پولیس کا تھانہ ہے نہ چوکی۔ مگر یہ مکانات بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ ان کی لکڑیاں دروازے وغیرہ کوئی چرا کر نہیں لے جاتا۔ عرب کے لوگ نقدی پر زیادہ ہاتھ مارتے ہیں۔ نقب زنی کے عادی نہیں۔ اور کاٹ کباڑ چرانا اپنے لیے ذلت سمجھتے ہیں۔

۲۔ اس زمانہ میں یہاں کے مکانوں کا کرایہ بہت گراں ہو جاتا ہے۔ میں ایک بنگلے میں جو سر راہ واقع تھا مقیم ہوا تھا اور بھی حاجی اس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہر شخص سے ایک ایک اشرفی لی گئی تھی اور اس کے معاوضہ میں ایک بستر کی جگہ مل گئی تھی۔

۳۔ خربوزے تربوز اور کھیرے یہاں وادی فاطمہ سے آتے ہیں جو مکہ معظمہ سے پانچ کوس ایک زرخیز مقام ہے۔ آلو بخارے۔ انار۔ آڑو۔ انگور وغیرہ میوے طائف سے لائے جاتے ہیں۔ یہ شہر حجاز میں بہترین شاداب سبز جگہ ہے۔ مکے سے کوئی چالیس کوس ہے۔

۴۔ رمی۔ پھینکنا۔ جمرات۔ کنکریاں۔ حضرت ابراہیمؑ جب اسماعیلؑ کی قربانی کی شرعی تکمیل کر کے عرفات سے واپس ہو رہے تھے تو منٰے میں تین جگہ شیطان نے ظاہر ہو کر ان کے دل میں کچھ وسوسہ ڈالنا چاہا۔ آپ نے کنکریاں اٹھا کر اور یہ کہہ کر کہ رجم الشیطان برضاء الرحمٰن (شیطان کو سنگسار کرنے کے اور خدا کی خوشنودی کے لیے) کنکریاں اس طرف پھینکیں۔ سنت ابراہیمی کی تقلید کے لیے ان مقامات پر ڈھائی ڈھائی گز اونچی تین برجیاں بنا دی گئی ہیں اور ان کے گرد تھالے کے طور پر ڈیڑھ گز اونچی دیوار حلقہ کیے ہوئے ہے۔ حاجی (بقیہ بر ص۴۷)

حلق[۱] (سر منڈانا) اور قربانی ۔ یہ تین مناسکِ حج یہاں ادا کیے جاتے ہیں۔ منےٰ کی زیارت گاہیں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ)

کوئی دو گز کے فاصلہ سے ان برجیوں پر کنکریاں مارتے ہیں۔ پہلی برجی کو جمرۃ الاولیٰ۔ دوسری کو جمرۃ الاوسط اور تیسری کو جو منےٰ کی گلی میں سب کے آخر مکے کی جانب ہے جمرۃ العقبہ ہیں۔ یہ برجی ایک دیوار میں آگئی ہے ۔ عام لوگ ان برجیوں کو شیطان کبیر (بڑا شیطان) شیطان وسطیٰ (منجھلا شیطان) اور شیطان صغیر (چھوٹا شیطان) کہتے ہیں۔

کنکریاں چنے برابر ہوتی ہیں جو مزدلفہ سے چن کر حاجی اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ مزدلفہ کو مشعر الحرام بھی کہتے ہیں۔ یہ مقام منے سے کوئی پانچ کوس اور عرفات سے کوئی ڈیڑھ کوس ہے۔ ۱۰ ذیحجہ کو صرف جمرۃ العقبہ پر سات کنکریاں پھینکتے ہیں۔ اور گیارہ بارہ تاریخ کو تینوں برجیوں پر سات سات کنکریاں مارتے ہیں اور اس طرح عموماً کنکریوں کی تعداد (۴۹) ہوتی ہے بعض اس میں کمی بیشی بھی کر دیتے ہیں۔ کنکریاں برجی کو لگ کر تھالوں میں گر جاتی ہیں۔ جن میں موریاں بنی ہیں اور برسات میں وہ ان میں سے سب بہہ جاتی ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کنکریوں کو فرشتے اٹھا کر مزدلفہ میں پہنچا دیتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو منےٰ میں کنکریوں کے پہاڑ بن جاتے۔ میں نے دیکھا کہ یہ برجیاں فصیل کے سے کنگورے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وقتاً فوقتاً ان برجیوں کی تعمیر و ترمیم بھی ہوتی رہی ہے۔ بعض لوگ خلاف احکام دوسروں کی پھینکی ہوئی کنکریاں اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ بعض حاجی بجائے چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے بڑے بڑے پتھر اٹھا کر مارتے ہیں۔ بعض بیوقوف برجیوں کو سچ مچ شیطان سمجھ کر جوتے بھی رسید کرتے ہیں۔ جنرل ابراہیم رفعت پاشا مراۃ الحرمین میں لکھتے ہیں کہ مصری فوج کے ایک لفٹنٹ نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ان برجیوں پر اس طرح حملہ کیا جیسے کوئی دشمن پر کرتا ہے ۔ اور گولیوں کی باڑھ ماری۔ پیشتر بعض حاجی اونٹوں پر سوار ہو کر رمی الجمرات کرتے تھے جس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی تھی۔ اب حکومت نجد نے اونٹ گھوڑوں کو اس رسم کی ادائی کے وقت لانے کی ممانعت کر دی ہے۔ جس سے عام حاجی تکلیف سے محفوظ ہو گئے۔

[۱]۔ عام حکم سر منڈانے کا ہے جو بہت سی دینی و دنیوی مصلحتوں پر مبنی ہے۔ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ چوٹی کی ذراسی نوک کاٹ دیتی ہیں۔ مردوں کو بھی اگر کوئی عذر ہو تو بجائے پورا سر منڈانے کے تھوڑا سا حصہ منڈا سکتے ہیں یا بال کترا سکتے ہیں۔ میں نے بعض حاجیوں کو دیکھا کہ انھوں نے اس خیال سے کہ سر منڈانے سے ان کی صورت بگڑ جائے گی۔ انگریزی بال کتروا لیے۔ عموماً ۱۰ ذیحجہ کو رمی الجمرات اور قربانی کے بعد حجامت بنوائی جاتی ہے (بقیہ برصفحہ ۴۸)

مسجد خیف۔ غار مرسلات۔ مسجد نحر۔ اور مقام کبش ہیں۔ ان کی مختصر کیفیت درج ذیل کی جاتی ہے۔

(الف) مسجد خیف۔

خیف ڈھلوان مقام کو کہتے ہیں۔ حجاز میں بعض اور وادیوں کا نام بھی خیف ہے۔ آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع میں جس جگہ منٰے میں مقیم ہو کر پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ جو مسجد خیف کے نام سے موسوم ہے۔ پہلی دوسری صدی ہجری میں یہاں مسجد تھی یا نہ تھی۔ اس کی صراحت سے تاریخیں ساکت ہیں۔ البتہ تیسری صدی سے اس کی نشاندہی مسلسل ہو رہی ہے۔ سنہ ۲۵۶ھ میں خلیفہ معتمد بن متوکل عباسی نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔ اس کے بعد سنہ ۵۵۹ھ میں وزیر جمال الدین محمد بن علی اصفہانی نے جو جواد کے نام سے مشہور ہے اس کی تجدید کرائی۔ پھر الناصر لدین اللہ خلیفہ بغداد نے جس کا زمانہ سلطنت سنہ ۵۷۵ھ سے سنہ ۶۲۲ھ تک ہے۔ اس کی مرمت کرائی۔ بعد ازاں الملک منصور عمر بن رسول سلطان یمن نے سنہ ۶۷۴ھ میں اسے بنوایا۔ جس کے نام کا کتبہ مسجد کی مشرقی دیوار میں چار گز کی بلندی پر ابھی تک موجود ہے۔ سنہ ۷۲۰ھ میں دمشق کے ایک مشہور تاجر احمد بن عمر نے جو ابن مرجانی کے نام سے مشہور تھا۔ اس مسجد کے اخراجات کے لیے بیس ہزار درہم سالانہ مقرر کیے۔ سنہ ۸۲۰ھ ہجری میں شیخ علی البغدادی نامی کسی شخص نے اس کی مرمت کرائی۔ سنہ ۸۷۴ھ میں ملک الاشرف سلطان قائتبائی مصری نے اسے ازسرِ نو بنوایا۔ مسجد کے باب شمالی پر اس بادشاہ کا نام اور سنِ تعمیر اس وقت تک کندہ ہے۔ اور موجودہ مسجد اگرچہ اس کی ترمیم بعد میں ہوئی۔ مگر اصل میں قائتبائی کی بنائی ہوئی ہے۔ سنہ ۱۰۷۲ھ میں سلطان محمد قزلار آغا نے اور سنہ ۱۰۹۲ھ میں سلیمان آغا سے مرمت کرائی تھی۔ یہ دونوں ترکی عہدہ دار تھے۔ مسجد کے دو دروازے ہیں ایک مشرق میں دوسرا شمال میں۔ ایک کھڑکی جانب جنوب ہے۔ شمالی دروازے کے پاس ایک مینار ہے۔ جس کی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) منٰے میں سیکڑوں حجام بیٹھے رہتے ہیں۔ چار آنہ سے کم اُجرت نہیں لیتے میں نے اپنی قیام گاہ پر ایک آدمی حجام کو بلایا اس نے بہت اطمینان سے میرا سر مونڈا اور ایک روپیہ لیکر خوشی سے چلا گیا۔ مکے مدینے۔ اور جدے میں حجاموں کی دکانیں نہایت آراستہ موجود ہیں اور ہر طرح کے بال صفائی سے کاٹ دیتے ہیں۔

بلندی کوئی (۱۴) گز ہے۔ مسجد کی سنگین عمارت ہے۔ اس کے چار دالان ہیں ہر دالان کی لمبائی (۹۰) گز اور چوڑائی چار گز ہے۔ مسجد کا صحن (۹۰ × ۹۰) گز ہے اس کے گرد ایک پختہ بلند دیوار چونہ گچی کی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مسجد کے وسطی دالان میں ایک جگہ قبہ ہے اسے مقام النبی کہتے ہیں یعنی آنحضرتؐ کے نماز پڑھنے کی جگہ۔ حکومت نجد سے قبل صحن میں ایک اور قبہ تھا جو اُس جگہ تعمیر کیا گیا تھا جہاں آنحضرتؐ نے قیام منیٰ کے وقت اپنا سرخ چرمی خیمہ نصب فرمایا تھا اس قبے کے پاس ایک مینار بھی تھا وہ بھی اب نہ رہا مسجد کے اندر چار حوض ہیں جن میں برسات کا پانی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ شرقی و شمالی دروازے کے درمیان کچھ حجرے بنے ہوئے ہیں جن میں زمانہ حج میں بعض امیر آدمی قیام کرتے ہیں۔ شمالی دروازے کے باہر ایک حجرے میں کسی بزرگ کا مزار ہے۔ اسے بعض لوگ حضرت علیؑ کے فرزند محمد کا بتاتے ہیں[۱] مسجد خیف میں حضرت آدمؑ کی قبر کی بھی ایک روایت ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس مسجد کے صحن میں چالیس نبیوں کی قبریں ہیں مگر کسی کا نشان مزار نہ پہلے یہاں تھا اور نہ اب ہے۔

ب۔ مسجد خیف کے پیچھے جانب جنوب پہاڑوں میں ایک غار ہے جو غار مرسلات کے نام سے مشہور ہے کہتے ہیں کہ سورہ مرسلات یہاں نازل ہوئی تھی۔ یہ غار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑے پتھر کے نیچے زمین کھود کر بیٹھنے کی جگہ بنادی گئی ہے۔ پتھر میں اوپر کی طرف ایک نشان سا بنا ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ آنحضرتؐ کے ٹیکا لگانے سے ہو گیا ہے۔ تبرکاً زائرین اس سے اپنا سر لگا کر بیٹھتے ہیں اور دو رکعت نماز نفل ادا کرتے ہیں۔ اہل نجد آثار کی تعظیم کو آثار پرستی کہتے ہیں۔ اس لیے آج کل یہاں جانے والوں کی حرکات پر نظر رہتی ہے۔

(ج) مسجد نحر۔

منیٰ کے بازار میں ایک گلی کے اندر چھوٹی سی مسجد ہے۔ کوئی دو سو آدمی سما سکتے ہیں اس مسجد کو مسجد کوثر بھی کہتے ہیں۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سورہ کوثر یہاں نازل ہوئی تھی

---

[۱]۔ حضرت علیؑ کے کئی صاحبزادوں کا نام محمد تھا۔ ان میں محمد بن حنفیہ بہت مشہور ہیں۔ ان کا مختصر تذکرہ حالات جنت البقیع میں ملاحظہ ہو۔

اور اس کی تعمیل میں آنحضرت صلعم نے حجۃ الوداع میں (۶۳) اونٹ اور حضرت علی نے (۳۷) جملہ ایک سو اونٹ نحر (ذبح) کیے تھے۔

(۷) مقام کبش۔

کبش مینڈھے کو کہتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے لیے لٹایا تھا اور عین وقت ذبح ان کی جگہ ایک مینڈھا حاضر کر دیا گیا تھا پیشتر اس مقام پر ایک چو کھنڈی سی بنی ہوئی تھی یعنی چار ستونوں پر ایک گنبد استادہ تھا اب وہ نہ رہا۔ اہل نجد ایسی چیزوں کی عظمت کے قائل نہیں ہیں۔ مقام کبش کو مسجد کبش و منحر اسماعیلؑ و مذبح اسماعیل بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک شق شدہ بڑے پتھر کی بھی اہل مکہ زیارت کراتے ہیں صحیح روایتیں اگرچہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت اسماعیل کی گردن پر چھری چلنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ لیکن مقامی روایتیں یہ کہہ رہی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے دو مرتبہ چھری پھیری مگر کارگر نہ ہوئی تو غصے میں آکر اس پتھر پر ماری جو شق ہو گیا۔ اگرچہ تمام وادی منیٰ مذبح اسماعیل کا حکم رکھتی ہے اور ہر جگہ قربانی کی جا سکتی ہے مگر اس زمانہ میں ایک عرصہ سے حکومت کی جانب سے یہ انتظام چلا آ رہا ہے کہ بستی سے دور کچھ حصۂ زمین مسلخ قرار دیدیا گیا ہے۔ اس کے گرد تاروں کا احاطہ ہے اور اندر بہت سی نالیاں کھدی ہوئی تیار رہتی ہیں۔ ۱۰ ذیحجہ سے تین دن تک یہاں قربانی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے اور لاکھوں بھیڑ بکری۔ دنبے اور اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں[۵۱]۔ جانوروں کا معائنہ ڈاکٹر کرتے ہیں اور صرف موٹے تازے تندرست جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ باقی سب گوشت ان نالیوں میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ کھالیں حکومت لے لیتی ہے جس زمانہ میں مسلخ کی جگہ معین نہ تھی اور ناقص گوشت کے دفن کرنے کا انتظام نہ تھا اس وقت حاجی جہاں جی چاہتا تھا ذبح کر ڈالتے تھے۔ خون۔ گوشت۔ پوست۔ فضلہ اوجھڑی پیٹے جابجا پڑے ہوئے سڑا کرتے تھے۔ بہت سے حاجی اناپ شناپ گوشت کھا جاتے تھے۔ جو اس سے

۵۱۔ میں نے ۱۳۴۵ھ میں تیرہ روپیے میں دو اچھے دنبے لیے تھے۔ بھیڑ۔ بکری کی قیمت تین چار روپیہ فی راس تھی معمولی قربانی کا اونٹ پچیس تیس روپیہ میں تھا۔

پرہیز کرتے تھے۔ اُن کی قربانیوں پر غریب غربا ٹوٹ کر گرتے تھے۔ یہ بھی آخر کتنا کھاتے۔ دوسرے دن کے لیے اُٹھا رکھتے تھے اور پھر قربانی کرنے والے اور یہ مساکین اپنے اپنے گھروں کو تبرک لے جانے کے لیے گوشت کی دھجیاں بنا بنا کر سکھاتے تھے۔ منےٰ کے در و دیوار میں گوشت کی الگنیاں لٹکی نظر آتی تھیں۔ مرلی جانوروں کا گوشت بے حساب کھانے۔ سڑے ہوئے گوشت و خون کی عفونت اور سوکھے ہوئے گوشت کی بساندھ سے ہوا بگڑ جاتی تھی۔ منےٰ میں اسہال و پیچش وغیرہ مختلف بیماریاں پھیلتی تھیں اور بعض اوقات خدا کی رحمت ہیضے کی شکل میں نمودار ہو جاتی تھی اور پھر حاجیوں کا ستھراؤ ہوتا تھا اور اس کثرت سے اموات ہوتی تھیں کہ گور کن و غسال کا ملنا غیر ممکن ہو جاتا تھا۔ خدا واسطے مُردوں کے اٹھانے والے باقی نہ رہتے تھے سرکاری ملازم خود موت کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایک ایک قبر میں دس دس مُردے دفن ہوتے تھے۔ آج ایک قبر بنی کل اُسی میں دوسرے کو دفن کر دیا۔ پرسوں اُسے پھر کھولا اور ایک تیسرا مردہ بھی اُسی میں دبا دیا۔ آخر یہ نوبت آجاتی تھی کہ رشتہ دار اپنے عزیزوں کو سکرات میں چھوڑ چھوڑ کر بھاگے تھے اور تمام وادی منےٰ لاشوں سے پٹ جاتی تھی اس قسم کے واقعات یہاں بہت دفعہ گزر چکے ہیں چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ھ کے ہیضے نے بھی حاجیوں کا صفایا کر دیا تھا۔

منےٰ کی گرمی۔ یہاں کی سخت دھوپ اور خوفناک لو ہمیشہ کمزوروں ضعیفوں اور بیماروں کے لیے مہلک ثابت ہوئی ہے۔ ہر سال حاجیوں کی ایک تعداد یہاں پہنچ کر ہمیشہ کے لیے یہیں کی ہو رہتی ہے۔ سالِ گزشتہ بھی ڈھائی لاکھ حاجیوں میں سے ڈیڑھ ہزار بیمار و ضعیف جن میں سے اکثر مرتے وقت حاجی بننے کے لیے یہاں آگئے تھے لقمۂ اجل ہوئے تھے ان کو دو گہری لمبی لمبی خندقوں میں دفن کیا گیا تھا۔ ایک نالی مردوں کے لیے تھی دوسری عورتوں کے لیے۔ ان میں اولاً مُردے لٹائے گئے اوپر سے چونا ڈالا گیا پھر ایک تہہ مُردوں کی پھر چونا۔ اس طرح چار چار پانچ پانچ تہہ مُردوں کی رکھی گئیں اور سپردِ خاک کیا گیا[1]

[1] اسی موضوع پر میرا ایک بسیط مضمون جس کا عنوان یہ ہے کہ "کیا گزشتہ حج میں بمقام منیٰ سات ہزار حاجی ہلاک ہو گئے" حیدر آباد کے مشہور روزانہ اخبار صحیفہ میں اور ہندوستان کے بعض اخبارات میں سال گزشتہ شائع ہو چکا ہے۔

منٰی کی تنگ گلی میں سے ۔ اہر دیکھو کو بے شمار اونٹوں کے گزرتے وقت شغدفوں[لہ] اور شبریوں[لہ] کے ٹکرانے ، الجھ کر گرنے اور الٹ جانے کے حادثے بھی ہمیشہ سے یہاں ہوتے آئے ہیں ۔ مثلاً خان بہادر حاجی عبد الرحیم صاحب بنگلوری کے سفرنامہ سے ۱۳۲۹ھ کی بدنظمی کی کیفیت جبکہ حجاز پر ترک حکمراں تھے یہاں درج کی جاتی ہے ۔

"شغدفوں کی ٹکریں ایک دوسرے کو لگتی تھیں ۔ کوئی شغدف گرتا تھا کوئی شبری ٹکر سے الٹ جاتی تھی مگر کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ کیوں ایسی بد انتظامی تھی .... چند ترکی افسر و سپاہی زرق برق لباس پہنے ہوٹل خانے میں بیٹھے اس افراتفری کو دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے ...... آدمی اونٹوں پر سے گرتے ہیں لوگ اُن پر سے روندتے گزر جاتے ہیں نہ سپاہی پوچھتا ہے نہ افسر ضعیف العمر عورات و بچے اونٹوں سے گرتے ہیں روتے ہیں چلاتے ہیں ۔ ادھر شبری الٹ گئی اُدھر شغدف اوندھا ہو گیا ہے لوگ چلا رہے ہیں ۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا عجب معاملہ ہے ۔"

(سفر حرمین صـ ۲۵۱)

۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار حج سے مشرف ہوا تھا حکومتِ نجد نے منٰی میں یہ انتظام کیا تھا کہ اونٹوں کی صرف ایک قطار ادھر سے گزر رہی تھی ایک اُدھر سے آ رہی تھی ۔ یہ

[لہ] ۔ شغدف ایک چارپائی ہوتی ہے جس پر لکڑی کی شاخوں سے ٹپ بنا کر اُس کو ٹاٹ اور شطرنجی وغیرہ سے منڈھ دیتے ہیں ۔ دو شغدف باہم ملا کر بندھے رہتے ہیں اور چلتے وقت اِن کو اونٹ کی پیٹھ پر رکھ کر کس دیتے ہیں ۔ یہ ایک میگہ ڈبنر سا ہو جاتا ہے ۔ اس میں دو آدمی بیٹھتے ہیں اور اپنے اپنے شغدف میں بہ آرام لیٹ سکتے ہیں سو سکتے ہیں ۔ البتہ ہر وقت جھوک سنبھالنی پڑتی ہے ۔ بعض لوگوں کو شغدف میں چکر آنے لگتا ہے ۔ مگر مجھے یہ سواری بہت آرام دہ ثابت ہوئی ۔

[لہ] ۔ شبری بچوں کے گہوارے کی شکل کی ہوتی ہے اسے اونٹ پر آڑا باندھ دیتے ہیں ، اس پر کوئی سایہ نہیں ہوتا ۔ بیٹھتے اس میں بھی دو ہیں مگر نہ سو سکتے ہیں نہ پاؤں پھیلا سکتے ۔

تانتا صبح سے شام تک بندھا رہا اور اس کی وجہ سے گو حاجیوں کو گھنٹوں تک راستہ صاف ہونے کے انتظار میں اونٹوں پہ دھوپ میں ٹھہرنا پڑا مگر شغدفوں کے وہ الجھاوے جو ہمیشہ ہوا کرتے تھے اس سال بہت کم ہوئے اور اگرچہ شغدفوں کے ٹکرانے یا ڈھیلے بندھنے یا توازن قائم نہ رکھنے کی وجہ سے اِن کے اُلٹ جانے کے واقعات پیش آئے۔ مگر اموات بہت ہی کم واقع ہوئیں۔

منےٰ میں نہر زبیدہ کے حوض موجود ہیں۔ جن پہ بالعموم عرب و حبشی قابض ہو جاتے ہیں جو صبح سے شام تک پانی بھرتے رہتے ہیں۔ کچھ تو ان کی دھینگا مشتی کی وجہ سے اور کچھ اپنے مشاغل کے باعث حاجی خود پانی نہیں بھرتے بلکہ انھیں لوگوں سے خرید لیتے ہیں قلتِ آب و گرانی آب کی منیٰ میں عموماً شکایت رہا کی ہے بعض بیمار و ضعیف حاجی جو پانی تک نہیں پہنچ سکتے یا بعض ایسے مسکین جو پانی خرید نہیں سکتے وہ بصد حسرت جان دیتے ہیں ۱۳۴۵ھ میں اگرچہ منےٰ میں پانی بہت تھا اور بعض اشخاص نے سبیلیں بھی لگا دی تھیں تاہم اِس قسم کی اموات کا امکان تھا ۱۳۴۶ھ میں حج کر کے جو حاجی آئے ہیں اُن کا بیان ہے کہ تمازتِ آفتاب و بادِ سموم کی وجہ سے اس سال بھی بہت سے حاجی ہلاک ہوئے مگر پانی کا انتظام اچھا تھا۔ حکومتِ نجد نے بھی کئی آبدار خانے لگا دیے تھے اس لیے اب کی دفعہ اس امر کے باور کرنے کے وجوہ نہیں ہیں کہ تشنگی سے کوئی ہلاکت واقع ہوئی ہو۔ تاہم منجملہ دوسرے اسباب مرگ کے منےٰ میں پانی کی قلت بھی حاجیوں کے اتلاف کا باعث ہوتی رہی ہے اور بحیثیت مجموعی یہ سب اسباب ایسے ہیں جو زمانۂ ابراہیم علیہ السلام سے جس کو تقریباً تین ہزار برس گزرے۔ خفتگان منےٰ کی تعداد میں اضافہ کرتے آ رہے ہیں اور ہر سال کچھ نہ کچھ نئے مرنے والے اس شہر خموشاں میں آباد ہو جاتے ہیں۔

---

[۵۱] دہلی کے مشہور تاجر عبدالستار و عبدالجبار صاحب ساکن مکہ کی طرف سے کئی سبیلیں منےٰ میں تھیں۔ بعض اور لوگوں نے بھی آبدار خانے قائم کر دیے تھے۔ جن سے ہزاروں آدمی سیراب ہو رہے تھے اس فقیر نے بھی ایک چھوٹی سی سبیل لگا دی تھی منےٰ میں۔ ۱۰ ذیحجہ کو ایک کنستر بھر پانی کی قیمت دو روپیہ چھ آنے تک پہنچ گئی تھی دوسرے دن کچھ گھٹی اور تیسرے دن بارہ آنے میں ایک کنستر پانی آنے لگا۔

منےٰ کا قبرستان جو مسجد خیف سے ملحق ہے اس کو میدانِ کارزار تصور کرنا چاہیے۔ ممکن ہے
کہ یہاں بہت سے صحابہ و بزرگ بھی دفن ہوں مگر ان کے مزارات کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ یہاں جو
مرتا ہے وہ عالمِ غربت ہی میں مرتا ہے اور عموماً پردیسی ہی یہاں کی خاک کا پیوند ہوتے ہیں
اس لیے قبرستانِ منےٰ کو گورِ غریباں کہنا بہت موزوں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زمانۂ حج میں
جو مستطیع حاجی یہاں شربتِ اجل نوش کرتے ہیں ان کے جنازے جنت المعلیٰ میں دفن کرنے کے
لیے پہنچا دیے جاتے ہیں اور اس طرح صرف مفلس و مسکین ہی یہاں کے قبرستان کے لیے
رہ جاتے ہیں۔

قبرستان

مدفونین کی تعداد کے اعتبار سے مقبرۂ منےٰ بڑے بڑے قبرستانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے
مگر یہاں قبریں اتنی نظر نہیں آتیں۔ پختہ قبریں بنانے کا نہ یہاں موقع ہے نہ محل۔ منےٰ نہ کوئی
مستقل آبادی ہے اور نہ بارہ مہینے قائم رہنے والا میلا۔ اس لیے یہاں تجہیز و تکفین کا انتظام
ہو جانا بھی غنیمت ہے۔ کفن اکثر حاجی اپنے ساتھ لاتے ہیں یہاں مل بھی جاتا ہے۔ کچھ نہیں
تو احرام کی دونوں چادریں راہ خدا کے ان شہیدوں کے لیے بالکل کافی ہو جاتی ہیں۔ گورکن
و غسال اجرت پر مل جاتے ہیں۔ خدا کے بعض نیک بندے ثواب کے خیال سے بھی یہ خدمت
انجام دے دیتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے بھی اس بارے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ۱۳۴۵ھ
میں حکومتِ نجد نے بہت سے غریب حبشی حاجیوں کو اس کام پر مامور کر دیا تھا وہ چارپایوں پر
شغدفوں میں۔ تابوتوں میں اور اونٹ پر چڑھنے کی سیڑھیوں[1] پر لاشوں کو رکھ رکھ کر قبرستان
پہنچا رہے تھے۔ عبیر و گلاب، شامیانہ و مولود خواں ان تمام تکلفات سے محبت کے قتیل آزاد ہیں۔

گورستانِ منےٰ کی کچی قبریں یا وہ گڑھے جو گنج شہیداں کی حیثیت رکھتے ہیں چند روز
میں ہوا کے جھونکوں اور پانی کے سیلابوں سے مٹ مٹا کر زمین کے برابر ہو جاتے ہیں صرف
کہیں کہیں مٹی کے بے ترتیب ڈھیر اور کچھ مٹے مٹے آثار ادھر سے گزرنے والے عدیم الفرصت
حاجیوں کو فاتحہ پڑھنے کے لیے مجبور کرتے رہتے ہیں۔

---

[1] یہ سیڑھی کوئی ڈیڑھ گز اونچی ہوتی ہے اور چار ڈنڈے ہوتے ہیں اس پر سے مردے کی ٹانگیں لٹکتی رہتی ہیں۔

(۲) قبرستان شبیکہ

یہ قبرستان مکۂ معظمہ کے مشہور محلۂ جرول سے جہاں روانگی کے وقت قافلوں کی ترتیب ہوتی ہے ملاہوا ہے۔ کسی زمانہ میں قبیلۂ بنو شبیکہ کے مُردے یہاں دفن ہوتے تھے۔ بعض صحابہ کے دفن کے متعلق بھی مقامی روایتیں ہیں۔ مورخین مکہ اس قبرستان کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی زیارت مستحب بتاتے ہیں مگر یہاں کے مدفونین میں سے بصراحت کسی کا نام نہیں لیتے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت ؐ نے اس قبرستان کی زمین خرید فرماکر مسلمانوں کے لیے وقف کردی تھی۔ کئی صدیوں سے یہ قبرستان آبادی میں آگیا ہے اور اب اس کا نام ہی محلہ شبیکہ مشہور ہے۔ بستی کی وجہ سے یہاں مردے دفن ہونا بھی موقوف ہے اس محلے میں بہت اچھے اچھے مکانات ہیں۔ جدّے کے بہت سے مالدار تاجر یہاں رہتے ہیں۔ یہ مکے کے ہوادار محلوں میں سے ہیں۔ شبیکہ کے مغربی جانب پہاڑ کی طرف قبرستان ہے۔ ۱۳۴۵ھ میں جب اس فقیر نے یہاں کی زیارت کی تو بجز کچی قبروں کے منتشر ڈھیروں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ مدت سے یہاں کوئی دفن بھی نہیں ہوتا۔ جن صاحبوں کے مزاروں پر قبے تھے یا جو قبریں پختہ بنی ہوئی تھیں وہ سب گردش روزگار نے منہدم کردیں۔ کچھ دن اور گزرے تو نام ہی نام رہجائے گا کہ یہاں بھی کبھی قبرستان تھا اب بھی قریب قریب یہی حالت ہے۔ زمانہ حج میں یہاں بدویوں کے ڈیرے پڑے ہوئے تھے ایک طرف تھوڑی سی جھونپڑیاں بھی ہیں جن میں غریب عرب سکونت رکھتے ہیں۔

(۳) قبرستانِ شہداء

قبرستانِ شہدا جسے شہدا یا مقامِ شہدا بھی کہتے ہیں۔ مکۂ معظمہ سے کوئی تین میل جانب شمال مدینے کی راہِ سلطانی پر واقع ہے۔ یہ مقام ایک محلہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ مکے سے شہدا تک

قریب قریب آبادی ہے کہیں کہیں سلسلہ ٹوٹ گیا ہے۔ یہاں بہت سے مکان ہیں مختصر سا بازار ہے جس میں تمام ضروری اشیا مل جاتی ہیں۔ اس جگہ کی آب و ہوا بہت اچھی ہے مکے والے سیر و تفریح و ہواخوری اور کھیل تماشے کے لیے یہاں آجاتے ہیں۔ کھانے پینے کے جلسے کرتے ہیں اور صبح سے شام تک ٹھہر کر چلے جاتے ہیں بعض لوگ کئی کئی دن تک بھی قیام کرتے ہیں۔ بیمار بھی تبدیل آب و ہوا کے لیے یہاں آتے رہتے ہیں اور اپنے عزیزوں کے یا کرایہ کے مکانوں میں ٹھہر کر شہدا کی صاف ہوا کا لطف اٹھاتے ہیں۔

یہاں ایک میدان ہے جس میں بہت سی قبریں ہیں۔ کہتے ہیں کہ ۶۳ھ میں عبداللہ بن زبیر اور یزید پلید کے سپہ سالار حصین بن نمیر کی فوجوں کا یہاں مقابلہ ہوا تھا۔ عبداللہ کے ساتھی جو یہاں کام آئے ان کی وجہ سے یہ جگہ شہدا کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مقامی روایت ہے کسی تاریخ میں نظر نہیں پڑی۔ اس وادی کے ایک گوشہ میں پہاڑ کے نیچے حضرت عبداللہ بن عمر کی قبر ہے۔ اس کے آس پاس اور بھی قبریں ہیں جو حضرت عمرؓ کے اہل خاندان کی بیان کی جاتی ہیں۔ ۱۳۴۵ھ میں اس فقیر نے یہ مقام دیکھا ہے۔ دوران قیام مکہ میں ایک دن میرے دل میں آگیا تھا کہ وادی فاطمہ تک جو مکے سے دس بارہ میل ہے۔ ٹہلتا چلا جاؤں مگر ملالت و کمزوری کی وجہ سے شہدا پہ پہنچ کر پڑ گیا۔ یہاں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی جو قبر موجود ہے اس پر کبھی قبہ نہیں بنایا گیا۔ زمین سے بالشت بھر اونچا چبوترہ ہے جس کے گرد پتھر رکھے ہیں۔ کتبہ نہیں ہے۔ شہدا کے رہنے والے اس کو حضرت عبداللہ بن عمر کی اصلی قبر بتاتے ہیں۔ مگر مورخین مکہ میں سے کسی نے ان کا دفن یہاں نہیں بتایا۔ البتہ زمانہ حال کے بعض سیاحوں نے اس کی نشاندہی کی ہے محلہ شہدا کے باشندے اور گردونواح کے بدوی عرب اب بھی اپنے مردے اسی قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی جنازہ وصیت کے بموجب یا ہجوم میں شریک ہونے کے لیے یہاں سے جنت المعلیٰ میں بھی پہنچا دیا جاتا ہے۔

(۴) مقبرۂ ام المومنین حضرت میمونہ رضؓ

ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث کی وفات ۵۱ھ میں ہوئی تھی۔ ان کا مدفن حوالی مکۂ معظمہ میں موضع سیرف بیان کیا جاتا ہے۔ یہ مقام مکۂ معظمہ سے جانب شمال و مغرب مدینے کی اُس سڑک پر جو درب سلطانی کہلاتی ہے واقع ہے۔ بیت اللہ سے اس جگہ کا فاصلہ بعض مورخوں اور سیاحوں نے دس پندرہ میل تک بتایا ہے۔ لیکن ابن ظہیرہ کی رائے میں ۷۔۸ میل ہے اگرچہ عام طور پر مورخین ان کا مزار سرف میں بتاتے ہیں اور مدینۂ منورہ کے مورخین بھی اس پر متفق ہیں کہ ان کا مدفن سرف میں ہے اور باقی امہات المومنین کی قبور جنت البقیع میں لیکن مکۂ معظمہ کے سب سے قدیم مورخ ازرقی نے ان کی قبر کی کوئی صراحت نہیں کی قطب الدین مکی بھی خاموش ہیں۔ فاکہی نے بھی ان کا شمار اُن صحابہ میں نہیں کیا۔ جن کی وفات مکہ یا حوالی مکہ میں ہوئی۔ ابن جبیر و ابن بطوطہ نے بھی مزارات مکہ کے ضمن میں حضرت میمونہ کی قبر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ البتہ ابن ظہیرہ نے ان کا مدفن موضع سرف میں لکھا ہے اس طرح گیارھویں صدی ہجری سے اس کے وجود کی شہادت ملتی ہے۔ اس کے بعد تیرھویں اور چودھویں صدی کے سیاحانِ حجاز عموماً اس مقبرے کا ذکر کر رہے ہیں لیکن یہ بات بھی تعجب سے خالی نہ ہوگی کہ بعض سیاحوں نے ان کا مزار دمشق میں بھی بتایا ہے مثلاً میرے مکرم عنایت فرما الحاج پروفیسر مولوی محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے نے ۱۳۴۵ھ میں حضرت میمونہ کی قبر کی زیارت قبرستان دمشق میں کی تھی۔ (صراط الحمید ص۳)

موضع سرف میں حضرت میمونہ کی قبر کے پاس کچھ آبادی ہے اور قبر سے متصل مسجد و مسافر خانہ ہے۔ عرب خصوصاً بدوی اس موضع کو المیمونہ کہتے ہیں۔ فرنگی سیاح برکھارٹ جو ۱۲۳۲ھ میں مدینے جاتا ہوا ادھر سے گزرا تھا لکھتا ہے:۔

"مکے سے اونٹوں پر چلکر ۵ گھنٹے میں ہم میمونہ پہنچے۔ یہ کسی بزرگ کا مزار ہے اس کے قریب میٹھے پانی کا ایک کنواں ایک سنگین حوض اور مقبرے سے

ملی ہوئی ایک چھوٹی سی عمارت ہے جسے خان کہتے ہیں۔ اس میں مسافر ٹھہرتے ہیں۔ قبر کا گنبد وہابیوں نے توڑ دیا ہے۔"

(سفرنامۂ برکھارٹ مترجمہ شبیر)

برکھارٹ جیسے محقق سے حیرت ہے وہ سمجھا نہیں کہ میمونہ کون بزرگ ہیں۔

حضرت میمونہ کے مزار پر نجدیوں کی سابقہ فتوحات حجاز کے وقت جو قبہ تھا اس کی نسبت پتہ نہیں چلتا کہ کس نے تعمیر کرایا تھا۔ ۱۲۱۸ھ میں مکہ معظمہ کے دوسرے قبوں کے ساتھ اہل نجد نے اسے بھی منہدم کر دیا تھا اور ۱۲۳۲ھ تک یہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔ جیساکہ برکھارٹ کے بیان مذکورہ بالا سے ظاہر ہے۔ اس کے بعد سے چودھویں صدی ہجری کے سیاح اس قبے کا وجود ظاہر کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں محمد علی پاشا والی مصر نے اس کو بھی بنوا دیا ہو جنرل ابراہیم رفعت پاشا مصری اور حاجی عبدالرحیم صاحب بنگلوری کا بیان ہے کہ حضرت میمونہ کی قبر پہاڑی کے ڈھلوان میں واقع ہے۔ اس کے اردگرد اور بھی بہت سی قبریں ہیں۔ یہ ان بدویوں کی ہیں جو آس پاس کے پہاڑوں میں بکثرت آباد ہیں۔ سرف میں ایک مختصر بازار بھی ہے اور چائے پانی وغیرہ ضروریات مل جاتی ہیں۔ پیشتر اہل مکہ کی عادت تھی کہ وہ وسط ماہ صفر میں حضرت میمونہ کا عرس جسے وہاں مولد کہتے ہیں۔ بڑی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے۔ عرس ۱۲ صفر سے شروع ہو کر ۱۴ صفر کو ختم ہوتا تھا اور ان دنوں میں مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و اکناف میں بڑی ریل پیل رہتی تھی۔ ایک روز خاص مزار پر جمگھٹ ہوتا تھا اور نعتیہ قصائد اور بالخصوص حضرت میمونہ کی مناسبت سے کسی یہودی کی لونڈی میمونہ نامی کے ایمان لانے کا واقعہ اور آنحضرت کا معجزہ جسے کسی عرب شاعر نے منظم کر دیا ہے۔ پڑھا جاتا تھا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ کسی یہودی کی لونڈی میمونہ مذہب اسلام کی خوبیاں اور آنحضرت صلعم کے حالات سنکر غائبانہ مسلمان ہو گئی تھی۔ اس قصور پر اس کا مالک اس کو بڑی بڑی ایذائیں دیتا تھا یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اس کو گھر سے باہر پھینکدیا۔ اتفاقاً ادھر سے آنحضرت صلعم کا گزر ہوا اور آپ کی دعا سے وہ بالکل صحیح و سالم ہو گئی اور یہودی یہ معجزہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ دوسرے دن میلا برخاست ہو جاتا تھا اور سب لوگ یہاں سے لوٹ کر مسجد تنعیم کے

پاس جو مکے سے تین میل ہے اور جہاں سے عمرہ کا احرام باندھا جاتا ہے۔ ڈیرے ڈالتے تھے اور ایک دن یہاں سیر و تفریح و خور و نوش میں گزارتے تھے۔

۱۳۴۴ھ میں اہلِ نجد نے حجاز پر قبضہ کر کے حضرت میمونہ کے گنبد کو بھی منہدم کر دیا۔ ۱۳۴۵ھ میں یہ گنہگار چونکہ براہِ جدہ موٹر میں مدینے گیا تھا۔ اس وجہ سے اس مزار کی زیارت سے محروم رہا۔ علالت کے باعث اتنی ہمت نہ پڑی کہ وہاں تک کسی اور طرح پہنچ جاتا۔ ناچار بیت اللہ میں سرف کی جانب منھ کر کے ام المومنین کی خدمت میں سلام عرض کر دیا۔

اہلِ مکہ سے مجھے معلوم ہوا کہ معمولی شکل کی ایک قبر اب بھی سرف میں موجود ہے جو حضرت میمونہ کے مزار سے موسوم ہے اور چونکہ اہلِ نجد بلا کسی خاص ضرورت شرعی کے عورتوں مردوں کا ایک جگہ جمع ہونا جائز نہیں سمجھتے اور عرس کے بھی وہ قائل نہیں ہیں اس لیے اب وہ میلا جو ماہ صفر میں یہاں ہوا کرتا تھا اُکھڑ گیا۔

(۵) مقبرۂ مہاجرین

مکۂ معظمہ کے قدیم مقبروں میں مقبرۂ مہاجرین بھی ہے۔ ازرقی کہتا ہے کہ یہ قبرستان مقام حصحاص میں موضع فخ اور جبل مقلع کے درمیان واقع ہے۔ ابن ظہیرہ جبل مقلع کا نام جبل بکا اور زاہر بھی لکھتے ہیں۔ تقی الدین فاسی جبلِ بکا کی وجہ تسمیہ یہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت کی ہجرت کے بعد مسلمان یہاں آکر گریہ وزاری کیا کرتے تھے اور فاسی کے زمانہ یعنی نویں صدی ہجری تک اس جگہ کا یہی نام مشہور تھا۔ ابن ظہیرہ نے مقبرۂ مہاجرین کی وجہ تسمیہ ایک تو یہ لکھی ہے کہ جندع ابن ضمرہ ابن ابی العاص مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کے لیے نکلے تھے۔ اس مقام پر ان کا انتقال ہو گیا اور اس وجہ سے یہ جگہ مقبرۂ مہاجرین کے نام سے موسوم ہو گئی۔ دوسری وجہ یہ کہ یہاں ۱۶۹ھ میں علویوں کی ایک جماعت اور ہادی خلیفہ عباسی کے لشکر کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ علویوں اور ان کے انصار کے دفن کی وجہ سے اس قبرستان کا نام مقبرۂ مہاجرین

ہوگیا۔ (جامع اللطیف عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۳۴۷ تا صفحہ ۳۵۱)

ابن ظہیرہ نے سنہ غلط لکھا ہے۔ یہ واقعہ ۱۶۹ھ کا ہے۔ خلیفہ ہادی کی سلطنت اسی سنہ میں شروع ہوکر ایک برس چند مہینے میں ختم ہوگئی تھی۔ وجہ تسمیہ بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ قطب الدین مکی نے اس مقبرے کا وقوع اور علویوں کی جنگ کا واقعہ عمرہ کی سڑک پر موضع فخ میں تحریر کیا ہے۔ (الاعلام صفحہ ۹۸)

ابو الفدا نے ہادی خلیفۂ بغداد اور علویوں کی جنگ موضع وج میں جو طائف کے رستے میں ہے بیان کی ہے اور ایسے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں جن میں وج کا نام آیا ہے۔ منجملہ اُن کے دو شعر علویوں کے امام حضرت ابی عبد اللہ الحسین بن علی بن حسن مثلث بن حسن مثنیٰ بن امام حسن علیہ السّلام کے مرثیہ کے ہیں۔ جنھوں نے ہادی کے زمانہ میں خروج کیا تھا اور اس جنگ میں شہید ہوئے تھے۔

اِس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ فج۔ فخ اور وج تینوں میں صحیح نام کون سا ہے۔ اِن میں سے کوئی نہ کوئی ایک نام تو صحیح ہے۔ باقی دو نام سہو کتابت سے مسخ شدہ صورتیں ہیں اور چونکہ یہ تینوں ہموزن ہیں اس لیے ابو الفدا کے نقل کردہ اشعار سے بھی اس بارے میں کچھ مدد نہیں مل سکتی۔ اور آئندہ میں قطب الدین مکی کا استعمال کردہ لفظ فخ اختیار کرتا ہوں۔

ابن خلدون نے عہد ہادی کے واقعات میں حضرت حسینؑ کی شہادت مقام ذی طویٰ میں تحریر کی ہے۔ ذی طویٰ کی تشریح سابق میں کیجا چکی ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے ذی طویٰ کی جو صراحت کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبرۂ مہاجرین ذی طویٰ کے قریب ہے وہ لکھتا ہے:۔

"ذی طویٰ ایک میدان ہے جو ثنیۃ الکدیٰ کے نیچے اُس قبرستان سے جاملا ہے جو مقام حصحاص میں مقبرۂ مہاجرین کے نام سے موسوم ہے تنعیم جو عمرہ کے رستے میں مکے سے تین میل ہے۔ اُس کے دونوں طرف کا حصہ زاہر کہلاتا ہے۔ یہاں کے کنوؤں کا پانی نہایت شیریں ہے۔ ذی طویٰ مقام زاہر سے قریب ہے"۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول حالات مکۂ معظمہ)

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فخ تنعیم کے قریب جہاں سے عمرہ کا احرام باندھتے ہیں ذی طوی سے ملی ہوئی کوئی جگہ ہے ۱۳۴۵ھ میں میرے رہنماؤں نے مقام ذی طوی کی جسے آج کل آبار زاہر یعنی زاہر کے کنویں کہتے ہیں نشاندہی کی۔ مگر اس قبرستان کے وجود کا کچھ پتہ اور مقام فخ کے کوئی آثار اور حسین کے مزار کی علامت نہ بتا سکے۔ عرب میں مقامات کے نام جس طرح وقتاً فوقتاً بدل جاتے ہیں اور قبروں کی غیر پختگی کی وجہ سے قبرستان جیسے جلد جلد بنتے بگڑتے رہتے ہیں اُس کے لحاظ سے اس وقت اس مقبرے کا پتہ چلنا دشوار ہے۔ حضرت حسین کی جنگ ۱۶۹ھ میں ہوئی تھی جس کو اس وقت تخمیناً بارہ سو برس گزر گئے اور اس مدت میں کوئی پانسو برس عباسیوں کی سلطنت کے بھی شامل ہیں جن سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ وہ اپنی سلطنت کے باغیوں کی قبروں کی نگہداشت کرتے۔

چونکہ موضع فخ یا وادی ذی طوی کو حضرت ابی عبد اللہ الحسین کے مدفن و مشہد ہونے کا شرف حاصل ہے اس لیے اس بزرگ کی جنگ کے مختصر حالات لکھدینا ضروری معلوم ہوتا ہے:۔

حضرت حسین کا سلسلۂ نسب امیر المومنین علی ابن ابی طالب سے چھٹی پشت میں ملتا ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ یہ بڑے بہادر و فیاض تھے اور عموماً اُن صفات سے جو اہل بیت یا اولاد علیؑ میں پائی جاتی ہیں متصف تھے۔ ہادی خلیفہ بغداد کے عامل مدینہ سے اُس کے ناگوار طرز عمل کے باعث ان کی اَن بن ہو گئی اور انھوں نے چند انصار کے ساتھ اُس پر حملہ کیا اور اُس کو مدینے سے نکال دیا۔ مدینۂ منورہ پر قبضہ کرنے کے بعد حسین مکے کی طرف بڑھے ان کے ساتھ قبیلۂ بنی حسن کے شیعوں کی ایک جماعت تھی اور کتاب اللہ و کتاب الرسول پر عمل پیرا ہونے کے وعدے پر مسلمانوں سے یہ بیعت لیتے تھے۔ مکہ معظمہ میں آکر انھوں نے غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا۔ بہت سے غلام اور دوسرے مسلمان بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے مکے کے والی خالد الیزیدی اور اُس کے ساتھی تمام عباسیوں کو قتل کیا اور لشکر عباسی کو شکست دی۔ آخر محمد بن سلیمان عباسی جو ایک بڑے لشکر کے ساتھ بغداد سے حج کرنے آیا تھا۔ ان کی طرف بڑھا فخ پر لڑائی ہوئی حسین اور اُن کے ساتھی مارے گئے۔ ان کا سر اور ان کے ساتھیوں کے ایک سو سر خلیفہ بغداد کے پاس بھیجے گئے۔ ان کا سر پیش کرنے والا طالب انعام ہوا۔ مگر خلیفہ ہادی نے

اُسے جھڑک دیا اور کہا کہ یہ کسی کافر کا سر نہیں ہے بلکہ رسول اللہ کے ایک فرزند کا سر ہے۔ محض سیاست و انتظام قائم رکھنے کے لیے اس کو قتل کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۶۹ھ کا ہے۔

ابوالفرج اصفہانی نے مقاتل الطالبین کے حوالہ سے ایک حدیث روایت کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ مقام فخ پر تشریف فرما ہوئے اور صحابہ کے ساتھ وہاں نمازِ جنازہ پڑھی اور فرمایا کہ یہاں میرے اہلِ بیت سے ایک شخص مع اپنے ساتھیوں کے قتل کیا جائے گا یہ لوگ سروں سے کفن باندھے اور کافور حنوط اپنے جسموں کو لگائے یہاں آئیں گے۔ ان کی روحیں اِن کے جسموں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گی۔

(الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۹۸) تاریخ ابن خلدون و تاریخ ابوالفدا حالات خلیفہ ہادی برادر ہارون الرشید)

مجھے بچپن سے حضرت میر محمد تقی میر کا یہ شعر یاد ہے۔ مگر اس کا مطلب اب بڑھاپے میں اولادِ رسول اللہ کی تاریخ پڑھنے کے بعد سمجھ میں آیا۔

غیرت سے تنگ آکر غیروں سے لڑ مریں گے
آگے بھی میر سیّد کرتے رہے ہیں ساکا[1]

ا۔ ساکا: خوں ریز معرکہ۔ گھمسان۔

باب دُوّم

مدینے کے مزارات

فصلِ اوّل

مزارِ اقدس سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(۱) حجرۂ مزارِ اقدس کی اجمالی حالت

حجرۂ مطہرہ جس میں آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ دفن ہیں۔ مسجد نبوی کے جنوبی و مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ مسجد کی دیوار جنوب میں اس سے (۲۶) فٹ کے فاصلہ پہ ہے اور مشرق میں کوئی (۱۵) فٹ دور۔ اس کے شمال میں جنابہ سیدہ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کا مکان و مزار ہے جو حجرۂ مقدس کی طرح ڈھلی جالی سے محصور ہے۔ مغرب میں مسجد نبوی کا وہ مقدس ترین حصہ ہے جسے مجازاً روضۃ من ریاض الجنۃ یعنی بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ کہتے ہیں حجرۂ شریف کوئی چار گز لمبا اور سوا دو گز چوڑا ہے۔ یہ سب طرف سے بند ہے۔ اس میں کوئی درواز

نہیں ہے۔ اس پر گنبد نما لداؤ کی چھت ہے اور اس کے اوپر قبۂ خضرا یعنی سبز گنبد جو دور دور سے دکھائی دیتا ہے قائم ہے۔

مورخ حجرۂ شریف کو مربع کہتے ہیں مگر بالکل چوکھونٹا نہیں ہے بلکہ غیر مساوی الاضلاع چار ضلع کی ایک شکل ہے۔ حجرۂ شریف کے گردا گرد اور اس سے تقریباً ملحق ایک سنگین مخمس احاطہ اور ہے جس سے حجرۂ شریف بالکل چھپ گیا ہے۔ اس احاطہ میں بھی کوئی دروازہ نہیں ہے اور اس طرح حجرۂ مقدس و بیرونی احاطہ دونوں ملکر گویا ایک ہی حجرہ ہو گیا ہے۔ اس پر سبز اطلس کا غلاف جس میں سفید ریشم سے کلمہ و درود بنا ہوا ہے اوپر سے نیچے تک پڑا ہے۔ کسی طرف سے دیواریں نظر نہیں آتیں۔ حجرے کے گرد سب طرف بطور گردش ایک گیلری یا چھتہ ہے جس کی چوڑائی کہیں دو ڈھائی گز اور کہیں تین چار گز ہے۔ گیلری کی چھت میں قندیلیں آویزاں ہیں اور اس کے سنگ مرمر کے فرش پر عود سوز۔ شمعدان۔ صندوق صندل وغیرہ اشیاء رکھی ہیں۔ اس کے بعد کوئی چھ گز اونچی ڈھلی ہوئی جالی نصب ہے۔ تین طرف یہ لوہے کی ہے۔ سبز رنگ ہے اور جانب قبلہ یعنی جنوب کی طرف چمکدار پیتل کی ہے اسی طرف کھڑے ہوکر زایر سلام عرض کرتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ جالی میں چار طرف چار دروازے ہیں جو عموماً بند رہتے ہیں۔ صرف مشرقی دروازہ شام کو کھلتا ہے۔ اس میں سے خدام گیلری میں پہنچ کر صفائی و روشنی کا انتظام کرتے ہیں۔ حجرے کی دیواروں کو عطر ملتے ہیں اور عود و اگر سلگاتے ہیں۔ خدام بھی حجرۂ شریف کے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ داخلے کے لیے اس میں کوئی دروازہ ہی نہیں ہے۔ البتہ گیلری میں پہنچ کر حجرے کی دیواروں کو صرف باہر سے چھو سکتے ہیں۔ عام زائرین کی یہاں تک بھی رسائی نہیں۔ کبھی کبھی کسی معزز یا مقدس زایر کو گیلری میں داخل ہو جانے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ مجھ جیسے گنہگار باوجود موقع پانے کے اس مقدس زمین پر اپنے ناپاک قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ مشتاقانِ جمال محمدیؐ جالی سے منہ لگائے ٹکٹکی باندھے دربار احمدی کا سماں دیکھتے ہیں۔ ہر طرف سایہ ہونے کی وجہ سے گو بمشکل گیلری کی کچھ کیفیت اور غلاف سے ڈھکی ہوئی دیواریں ہی نظر آتی ہیں۔ مگر اللہ اللہ رے شوق دید دل سیر ہی نہیں ہوتا۔ اس گنہگار نے بغیر دیکھے یہ شعر کہے تھے لیکن جب اس آستانہ اقدس تک

حاضر ہوا تو خبر ہوئی کہ میرے دل کو پہلے ہی سے سب کچھ معلوم تھا۔

عجب کیا ہے جو آنکھیں روزنِ دیوار بنجائیں تمھارے روضے کی باشاہ جب ہم جالیاں دیکھیں
نظر آتا ہے روضے کا ہمیشہ اک نیا عالم نگاہِ شوق سے شبیر جب دیکھیں جہاں دیکھیں

(۲) حجرۂ شریف آنحضرت صلعم کے بنائیں

مسجد نبوی کے آس پاس حضرت حارثہ بن نعمان انصاری کی زمین و مکان تھے۔ جو وقتاً فوقتاً انھوں نے آنحضرت ؐ کے نذر کر دیے اور حضور سرور کائنات نے بہ اوقات مختلف وہاں حجرے تعمیر کرائے۔[۱] حجرۂ شریف جس کا اس وقت ذکر کیا جا رہا ہے حضرت عائشہؓ کے لیے بنوایا گیا تھا اس کی تعمیر کے واسطے حضرت ابو بکرؓ نے ساڑھے بارہ اوقیہ یعنی کوئی ایک سو تین روپیے آنحضرت کو دیے تھے اور مسجد کی تعمیر کے بعد شوال ۲ ؁ھ میں یہ تیار ہوا تھا۔ یہ حجرہ بھی مثل دوسرے حجروں کے کھجور کی ٹٹیوں کا تھا جس پر مٹی لیپ دی گئی تھی اور اس کے احاطہ کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں حجرہ اندر سے ۱۲ فٹ ۶ انچ لمبا اور کوئی ۹ فٹ چوڑا تھا اس کے دو دروازے تھے ایک

[۱] کل نو حجرے تیار ہوئے ان میں سے چار کے اندرونی حجرے کھجور کی ٹٹیوں کے تھے جن پر مٹی لپی ہوئی تھی اور بیرونی دیواریں کچی اینٹ کی تھیں بقیہ پانچ صرف کھجور کی ٹٹیوں کے تھے۔ تمام حجرے شمال و جنوب کے رُخ تھے مسجد کی مغربی جانب کوئی نہ تھا۔ ۸۹ ؁ھ میں ولید بن عبد الملک کے حکم سے عمر بن عبد العزیز نے جو اُس وقت حاکم مدینہ تھے یہ سب مکانات کچھ برضا و رغبت اور کچھ بہ جبر و اکراہ مسجد نبوی میں شامل کر لیے۔ جس دن ان حجروں کو منہدم کیا گیا۔ مدینے میں ایک قیامت برپا تھی کوئی ایسا نہ تھا جو ان کو دیکھکر نہ روتا ہو وہ منظر بہت ہی دردناک تھا جبکہ ان مکانوں کی رہنے والیاں جن میں حضرتِ فاطمہ صغریٰ بنت امام حسین علیہ السلام زوجہ حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ بھی تھیں۔ دن دہاڑے چادریں اوڑھے روتی ہوئی گھروں سے نکلیں۔ مکانوں کا تخلیہ اُن کی خلاف مرضی کرایا گیا اور جس وقت دیواریں گرانی شروع کردیں مجبوراً اُس وقت یہ باہر آئیں (ماخوذ از وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ و جذب القلوب و نزہۃ الناظرین وغیرہ)

جانب مشرق تھا جس میں سے آمد و رفت ہوتی تھی۔ دوسرا چھوٹا سا دروازہ جانب مغرب تھا۔ اس میں سے آنحضرتؐ مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ اب بھی جالی میں موجود ہے اور باب عائشہؓ کہلاتا ہے۔ ایک کھڑکی صحن میں سے جانب شمال حضرت فاطمۃؑ زہرا کے مکان میں کھلتی تھی۔ دروازوں پر کمل کے پردے پڑے رہتے تھے۔ اس حجرے کی چھت اس قدر پست تھی کہ چودہ پندرہ برس کا لڑکا کھڑا ہو کر چھو سکتا تھا۔ رات کو اس میں چراغ بھی روشن نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ کچھ تو اس وجہ سے کہ چھت نیچی اور دیواریں ٹٹیوں کی ہونے کی وجہ سے آگ لگ جانے کا اندیشہ تھا اور کچھ یہی سبب تھا کہ ہمارے آقا تکلیف کو راحت پر ترجیح دیتے تھے۔ یہاں تک کہ روز وفات سے قبل کی رات کو جو سکرات کی رات تھی گھر میں تیل نہ تھا اور حضرت عائشہؓ نے کسی پڑوسن کو چراغ دیکر اس میں تھوڑا سا تیل ڈلوالیا تھا۔ اللہ اکبر!!

حجرۂ شریف کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن بھی تھا جو کوئی چار گز لمبا تین گز چوڑا تھا۔ اسی کے گرد کچی اینٹوں کی دیواریں تھیں جن میں سال کی لکڑی کا ایک پٹ کا کواڑ چڑھا تھا گھر میں داخل ہونے کا یہی دروازہ تھا۔ یہ کل کائنات حضور سرور کائناتؐ کے بیت الشرف کی تھی۔ زمانہ ولید بن عبد الملک میں جب یہ گھر اور آنحضرتؐ کی دوسری ازواج کے حجرے مسجد میں شریک کیلیے جارہے تھے تو اس وقت سعید[۱] بن مسیب صحابی نے یہ فرمایا تھا:۔

"کاش ان حجروں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتے تاکہ آنے والی نسلیں دیکھتیں کہ حضور سرور کونین نے کس طرح دنیا میں زندگی گزاری۔"

زمانہ مرض الموت میں آنحضرتؐ اسی حجرے میں تشریف فرما تھے۔ اسی میں وفات پائی۔[۲] اسی میں غسل[۳] ہوا۔ اسی میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔[۴] اسی میں دفن ہوئے۔[۵] اور قیامت کے دن اسی سے

---

[۱]۔ سعید بن مسیب صحابی و محدث تھے ۹۴ھ میں ان کی وفات مدینے میں ہوئی۔

[۲]۔ آنحضرتؐ کی وفات مشہور روایت کی بنا پر دوشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو ہوئی مگر اس کے علاوہ ۲، ۸، ۱۰ اور ۱۸ ربیع الاول بھی تاریخ وفات بعض روایتوں میں آئی ہے۔ شیعوں کے نزدیک ۲۸ صفر ۱۱ھ صحیح تاریخ وفات ہے۔

[۳]۔ آنحضرتؐ کو امیر المومنین علیؑ نے غسل دیا تھا۔ حضرت عباسؓ عم رسول اور ان کے دو فرزند (بقیہ برص۶۷)

باہر تشریف لائیں گے۔ قیامت کی علامتیں نمودار ہو گئیں! اسلام ضعیف ہو گیا! شاہانِ اسلام کمزور پڑ گئے۔ اب حضور کی تشریف آوری میں کیا دیر ہے!

اے بہ سرا پردۂ یثرب بخواب
خیز! کہ شد مشرق و مغرب خراب

(۳) مزارِ اقدس آنحضرتؐ کے بعد

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد بھی حضرت عایشہؓ اسی مکان میں رہا کیں۔ قبر شریف اور اُن کے سکونتی حصّے میں کوئی آڑ نہ تھی۔ کچھ دن تک یہ طریقہ رہا کہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہو کر آنحضرت پر صلواۃ و سلام پڑھنے کے بعد دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے۔ جب مرقد شریف کی خاک لوگ بطور تبرک اُٹھانے لگے تو حضرت عایشہؓ نے اپنے مسکن اور قبر شریف کے درمیان ایک دیوار اٹھا کر اس گھر کے دو حصّے کر دیئے اس سے آنے والوں کی اگرچہ ایک حد تک روک تھام ہو گئی۔ پھر بھی بعض اصحاب آتے تھے اور دیوار کے ایک سوراخ میں ہاتھ ڈال کر مرقد شریف کی خاک اُٹھا لیتے تھے۔ آخر حضرت عایشہؓ نے اس سوراخ کو بھی ٹھوپ کر بند کر دیا۔

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ عربی مطبوعۂ مصر جلد اول باب ۲ فصل (۲۰) صہ ۳۸۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

فضل و قثم کروٹیں دیتے جاتے تھے اور اسامہ بن زید اور شقران آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلام پانی ڈالتے تھے ۴۔ بغیر امام کے نماز جنازہ پڑھی گئی۔ حجرے کی تنگی کی وجہ سے دس دس آدمی ایک وقت آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے تخمیناً ۳۶ گھنٹے نماز میں صرف ہوئے اور کوئی ۳۲ ہزار آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ سب سے پہلے حضرت علیؑ نے پھر اہل بیت نے پھر انصار و مہاجرین وغیرہ تمام شہ نے نماز پڑھی۔ ۵ دو شنبہ کے دن دوپہر کے وقت رحلت ہوئی تھی۔ منگل اور منگل کی شام کو یعنی شب چہار شنبہ کو دفن کیا [illegible] یہ۔ بعض ابو طلحہ انصاری نے قبر کھودی اور حضرت علیؑ و فضل و قثم فرزندان حضرت عباس نے قبر میں اتارا

(۴) مزار اقدس حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں

حضرت ابو بکر کے زمانۂ خلافت میں اس حجرے میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ حضرت عائشہؓ بدستور اس میں سکونت پذیر رہیں۔ یہاں تک کہ جمادی الآخر ۱۳ھ میں حضرت ابو بکرؓ کی وفات ہوئی۔ اور یہاں دفن کیے گئے۔

(۵) مزار اقدس حضرت عمرؓ کے زمانے میں

۱۷ھ میں جب حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی کی توسیع کی تو حجرہ شریف کی دیواروں کو جو ٹٹیوں کی تھیں کچی اینٹوں سے بنوا دیا۔ جب تک یہاں آنحضرتؐ و حضرت ابو بکرؓ کی قبریں تھیں حضرت عائشہؓ بلا تکلف اِدھر چلی آتی تھیں۔ جب ۲۴ھ میں حضرت عمر یہاں دفن ہوئے تو انھوں نے پہلی طرح مزار اقدس پہ آنا چھوڑ دیا۔ اور بلا حجاب کامل یعنی چادر و برقع اوڑھے بغیر اِدھر نہ آتی تھیں۔

(۶) حجرۂ مزارِ اقدس میں قبروں کی وضع و ہیئت

حجرۂ شریف میں آنحضرت صلعم۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی کچی قبریں ہیں۔ جن پر نہ کوئی تعویذ ہے نہ کتبہ یہ تینوں قبریں پہلے مسطح تھیں۔ عمر بن عبد العزیز کی تعمیر کے وقت جب ان پہ دیوار گر گئی تو وہ کسی قدر ڈھلوان ہو گئیں مگر مسطح ہونے کے بارے میں روایتیں قوی ہیں۔ ایک روایت سے جو امام جعفر صادق علیہ السلام رسولؐ تک پہنچی ہوتی ہے یہ ثابت ہے کہ

آنحضرتؐ کی قبر ایک بالشت اونچی بنائی گئی تھی۔

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ صفحہ ۳۸۶)

متعدد روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرتؐ کی قبر زمین سے چار انگل بلند تھی لیکن اُس پر سرخ رنگ کے سنگریزے بھی بچھائے گئے تھے۔ اس لیے خیال ہو سکتا ہے کہ پہلے صرف چار انگل بلند ہوگی۔ سنگریزے بچھانے سے ایک بالشت اونچی ہو گئی ہوگی۔

(حیات القلوب جلد دوم باب ۶۴)

آنحضرتؐ کی قبر مطہر حجرے کی جنوبی دیوار کے نیچے مغربی دیوار سے دو ہاتھ کے فاصلہ سے ہے۔ قبروں کی وضع وہیئت بروایت صحیحہ اس طرح ہے کہ آنحضرتؐ کے دوشِ مبارک کے محاذی حضرت ابوبکرؓ کا سر اور حضرت ابوبکرؓ کے کندھے کے سامنے حضرت عمرؓ کا سر جن کی صورت یہ ہوتی ہے۔

(۱)

	جنوب	
مغرب	قبر نبیؐ قبر ابوبکرؓ قبر عمرؓ	مشرق
	شمال	
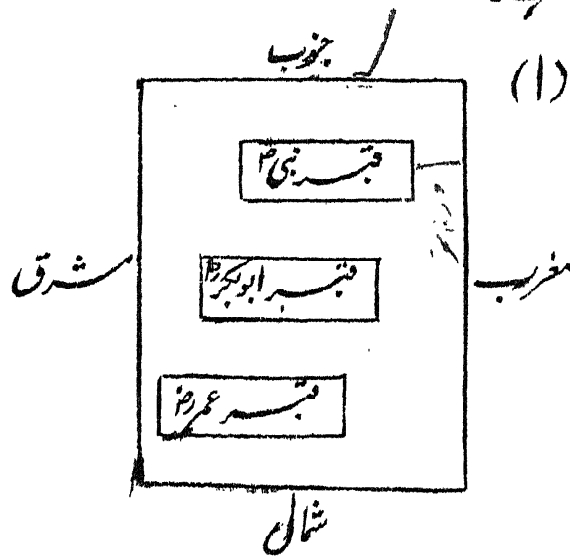
عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں جب حجرۂ شریف تعمیر کیا گیا تو حجرے کا پایہ کھودتے وقت جانب مشرق کسی کے پاؤں نظر آنے لگے۔ لوگ گھبرائے کہ شاید آنحضرتؐ کے قدم مبارک ہوں۔ مگر عروہ صحابی کی تصدیق اور روایتوں کی تائید سے ثابت ہوا کہ وہ حضرت عمرؓ کے پاؤں تھے۔ آخر جانب مشرق تھوڑی سی زمین بڑھا کر پایہ کھودا گیا۔

اسی روایت کی بناء پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ قبروں کی شکل

بہم ہوگی۔

(۲)
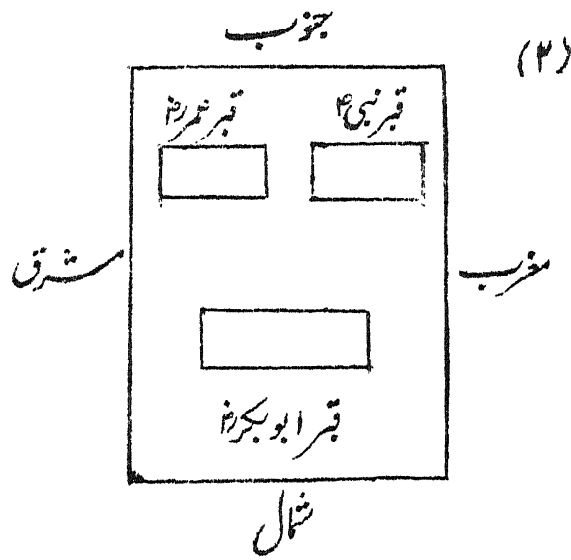
مگر پہلی وضع سے بھی ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاؤں مشرقی دیوار تک پہنچے ہوں۔ اور پہلی ہی شکل زیادہ صحیح مانی گئی ہے۔ اس کا سلسلہ روایت حضرت قاسم[ؒ] بن محمد بن ابوبکر تک پہنچتا ہے خلاصہ روایت یہ ہے کہ جب قاسم نے اپنی پھوپھی حضرت عایشہؓ سے اِن قبروں کی زیارت کے لیے کہا تو انھوں نے حجرۂ شریف کھول دیا اور قاسم نے تین قبریں دیکھیں جو نہ تو زیادہ بلند تھیں اور نہ بالکل ہی زمین سے ہموار اُن پر موضع عرصہ کے سُرخ رنگ کے پتھر کے ٹکڑے بچھے ہوئے تھے اور اُن کی ہیئت اُسی طور پر تھی جیسی کہ شکلِ اول میں دکھائی گئی ہے۔

(خلاصۃ الوفا باب (۴) فصل (۱۰) صفحہ ۱۴۱)

اگرچہ حضرت قاسم کی روایت اس بارے میں بڑی وقعت رکھتی ہے اور اس کے بعد اس معاملہ میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں رہتی تاہم یہ عرض کر دینا بھی ضرور ہے کہ بعض راویوں نے سہو نظری سے یا عالم بیخودی و بے خیالی میں اِن قبروں کی زیارت کرکے اور بھی

۵۱۔ قاسم ایک جلیل القدر تابعی ہیں۔ یہ حضرت ابوبکر کے پوتے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے نانا تھے اِن کی صاحبزادی اُم فروہ امام محمد باقر علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ اور جناب صادق آل محمد کی والدہ ہیں۔ قاسم کی بیوی اسما بنت عبدالرحمان بن ابوبکر حضرت جعفر صادق کی علیہ السلام کی نانی تھیں۔ قاسم کی وفات ۱۰۷ھ میں ہوئی اور مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔

چھ نقشے قایم کرتے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔
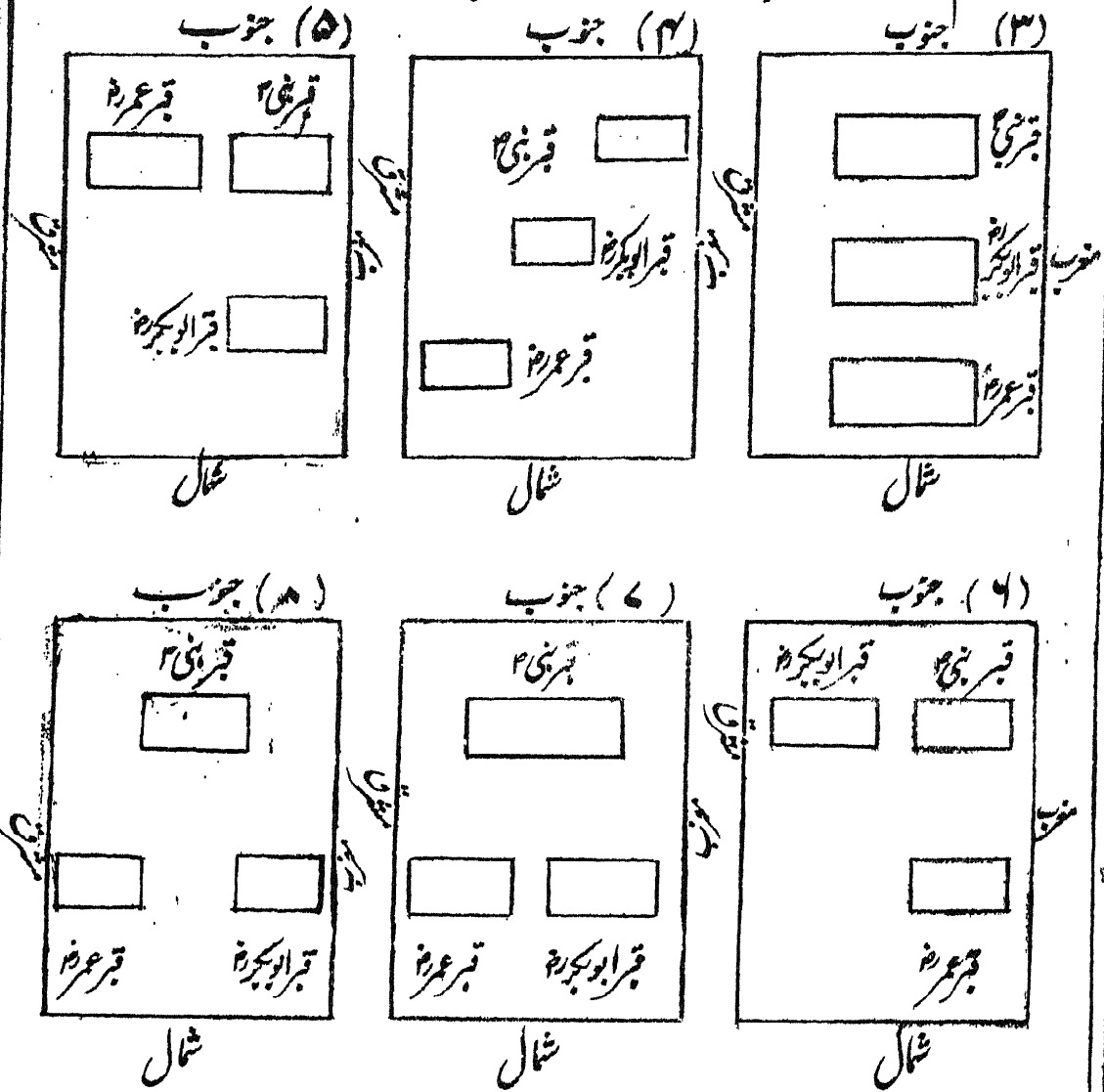
مندرجۂ بالا نقشے اُن لوگوں کے قایم کیے ہوئے ہیں جن کو زیادہ سے زیادہ زمانۂ عمر بن عبدالعزیزؒ کی تعمیر یعنی سنہ ۹۰ھ تک زیارت کا موقعہ ملا تھا یا جنھوں نے زائرین مزارِ اقدس کی زبانی کیفیت سُن کر قبروں کی ہیئت کا بطورِ خود تصور جما لیا تھا۔ اس کے بعد حجرۂ اطہر چاروں طرف سے بند کر دیا گیا اور زائرین کو اپنی آنکھوں سے اِن قبروں کے دیکھنے کا موقع نہ رہا۔ ساڑھے چھ سو برس تک یہی حالت رہی ۶۵۴ھ کی آتش زدگی میں جب حجرۂ شریف کی چھت جل کر قبروں پر گر گئی تھی اُس وقت اس امر کا پتہ نہیں لگتا کہ ملبہ صاف کرنے کے بعد قبریں کس ہیئت و شکل کی نمودار ہوئی تھیں اور وقت تعمیر اُس وقت قبریں بھی کچھ اصلاح طلب تھیں یا نہیں۔

جب سلطان قایتبائی[1] مصری نے ۸۸۱ھ میں حجرۂ شریف کی تعمیر کرائی۔ اُس وقت سید سمہودی کو حجرے کے اندر شرف باریابی حاصل ہوا تھا دیواروں کا ملبہ وغیرہ ہٹا دینے کے بعد حجرۂ شریف میں داخل ہو کر جو کیفیت اُنھوں نے دیکھی وہ ذیل میں درج کیجاتی ہے:۔

اللہ تعالیٰ سے توفیق حسن ادب وتعظیم کے لیے دعا کر کے میں حجرے کی پچھے کی جانب سے اندر گیا اور بعد صلوٰۃ وسلام وتوسل وتشفع میں نے حجرے پر نظر ڈالی اور اس خیال سے کہ اُن مشتاقوں کے لیے بھی جو اس وقت یہاں موجو نہیں ہیں کچھ تحفہ لیجاؤں۔ میں نے اپنی آنکھوں کو اُس متبرک مقام سے متمتع کیا۔ میں نے دیکھا کہ حجرے کی سطح ایک ہموار زمین ہے۔ قبور کے وہاں کوئی آثار نہیں ہیں۔ حجرے کے بیچ میں ایک جگہ کسی قدر بلند تھی۔ لوگوں نے خیال کیا کہ وہی مقام قبر شریف ہے اور بعض لوگوں نے وہاں کی خاک تبرکاً اٹھالی مگر اُن کا یہ خیال غلط تھا کیونکہ آنحضرتؐ کی قبر بروایت معتبر دیوار حجرے کے قریب ہے نہ کہ بیچ میں۔ اس کے بعد جانب مشرق تین ہاتھ اور جانب غرب کوئی ڈھائی ہاتھ زمین اور بڑھا کر حجرے کے آخر تہائی حصے میں حسب روایات واقوال مشہور قبریں بنادیں اور اُن پر سرخ سنگریزے جمادیے"۔

خلاصۃ الوفا عربی مطبوعہ مصر باب (۴) فصل (۱۲) صفحہ (۱۵۰ و ۱۵۱)

مذکورہ بالا بیان میں سید سمہودی کی مُراد روایات مشہورہ سے وہی حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر کی روایت ہے اور چونکہ ۸۸۱ھ سے اب تک کوئی اور موقع حجرۂ شریف اور قبروں کی تعمیر وترمیم کا نہیں ہوا۔ اس لیے بقیاس غالب اس وقت قبریں اُسی ہیئت سے موجود ہیں جو شکل اول میں دکھائی گئی ہے۔

[1] ملک اشرف ابو نصر سلطان قائتبائی مصر وحجاز کا بادشاہ تھا۔ قائیتبائی معرب ہے قایدبے کا۔ یہ سلاطین مملوک چرکسیہ مصر میں نہایت مخیر ونیک گزرا ہے اس کو مسجد نبوی کی تعمیر ودرستی کا دومرتبہ شرف حاصل ہوا۔ ایک دفعہ ۸۸۱ھ ہجری میں دوسری آتشزدگی سے قبل۔ دوسری مرتبہ ۸۸۶ھ ہجری میں آتشزدگی کے بعد سلطان ممدوح ۸۷۲ھ ہجری سے ۹۰۱ھ ہجری تک حاکم مصر وحجاز رہا۔ اہل یورپ اس کو قایدبے کہتے ہیں۔

سنگریزوں کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ غالباً قبر کے گرد حاشیہ کے طور پر جا دیے گئے ہوں گے جیسا کہ آجکل عرب و ہندوستان میں دستور ہے۔ مگر یہاں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں کی بندش ہوتی ہے۔ وہاں چھوٹے چھوٹے سنگریزے رکھے ہوں گے کیونکہ حضور سرورِ عالم کی قبر اطہر کی کل بلندی سنگریزوں سمیت ایک بالشت تھی اور اصل قبر کی بلندی چار ہی انگل تھی۔

(حیات القلوب مؤلفہ ملا باقر مجلسی)

(۷) حجرۂ مزارِ اقدس میں چوتھی قبر کی جگہ

یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ قیامت کے قریب ظاہر ہو کر جب فوت ہوں گے تو آنحضرت صلعم کے حجرے میں دفن کیے جائیں گے۔ اُن کے لیے ایک قبر کی جگہ حجرۂ شریف میں محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یقین ہے کہ صرف ایک ہی قبر کی جگہ حجرے میں ہے اس سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر حجرۂ شریف میں بعض اور صاحبوں نے بھی دفن ہونا چاہا تھا یا لوگوں کو اُن کے یہاں دفن کرنے کا خیال ہوا تھا۔ مثلاً حضرت عثمانؓ خلیفۂ سوم کو حجرۂ شریف میں دفن کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا مگر بعض لوگ مانع ہوئے۔ اور بقیع کے آخری حصے میں دفن کیے گئے۔ اسی طرح امام حسن علیہ السلام کی وصیت تھی کہ نانا کی پائینتی اُن کو دفن کیا جائے اور اگر اہلِ شر مزاحمت کریں تو بقیع میں سپردِ خاک کر دینا۔ چنانچہ مخالفین نے اُن کو یہاں دفن ہونے نہ دیا۔ تیسرے عبدالرحمٰن بن عوف صحابی کو اُن کے مرض الموت میں حضرت عائشہؓ نے کہلا بھیجا تھا کہ اگر تم چاہو تو تم کو حجرے میں جگہ دی جاسکتی ہے مگر اُنھوں نے کہا کہ میں آپ کا مکان آپ پر تنگ کرنا نہیں چاہتا اس کے علاوہ مجھ میں اور عثمان بن مظعون میں یہ اقرار تھا کہ ہم ایک ہی جگہ گڑیں گے۔ اس لیے میں اُن کے پاس بقیع ہی میں دفن ہوں گا۔

واقعات مندرجہ بالا سے قیاس ہوتا ہے کہ حجرۂ شریف میں ایک آدھ قبر کی جگہ اور ہوگی ورنہ حضرت عیسیٰؑ کی جگہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ شاید کوئی نہ کرتا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ حضرت مسیحؑ کے

یہاں دفن ہونے کی روایت ہی ضعیف ہو۔

(۸) مزار اقدس امیر معاویہ کے زمانے میں

کہتے ہیں کہ امیر معاویہ نے حجرۂ شریف کا وہ حصہ جس میں حضرت عائشہؓ سکونت رکھتی تھیں اس شرط سے خرید لیا تھا کہ تاحیات وہ اُس میں مقیم رہیں گی۔

(۹) مزار اقدس عبداللہ بن زبیر کے زمانے میں

حجرۂ شریف کی دیواریں جو حضرت عمرؓ نے بنوائی تھیں وہ زیادہ بلند نہ تھیں۔ اس لیے عبداللہ بن زبیر نے اپنے عہد خلافت میں اُن کو اونچا کر دیا۔

(۱۰) مزار اقدس ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں

۸۹ھ میں ولید[1] بن عبد الملک کے حکم سے عمر[2] بن عبد العزیز نے جو اُس وقت مدینے کے حاکم تھے۔ مسجد نبوی کی توسیع کا کام آغاز کیا[3] اور اس مقصد کے لیے حجرۂ شریف اور آنحضرتؐ کی

---

[1] ۔ ولید بن عبد الملک خاندان بنی امیہ کا چھٹا خلیفہ تھا جو ۸۶ھ میں تخت نشین ہوا اور ۹۶ھ میں مرا۔

[2] ۔ عمر بن عبد العزیز خاندانِ بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے اور اس تمام خاندان میں نیک تھے۔ ڈھائی سال خلیفہ رہے ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

[3] ۔ مسجد کی تعمیر کا کام ۸۹ھ سے شروع ہو کر ۹۱ھ میں ختم ہوا۔

دوسری بیبیوں کے حجرے شریک مسجد کر لیے۔ حضرت عمر کا بنوایا ہوا حجرہ اب تک چلا آرہا تھا۔ عمر بن عبد العزیز نے اس کو ڈھاکر کچی اینٹوں سے بنوایا۔ اور اس کے باہر نقشی پتھروں سے ایک حجرہ یا احاطہ اور تیار کرایا اور ان دونوں کی دیواروں میں سے کسی ایک میں بھی دروازہ نہ رکھا کہ لوگ کہیں قبر شریف کی غیر معمولی تعظیم نہ کریں۔ البتہ حجرے کی چھت میں ایک کھڑکی رکھی تاکہ بوقت ضرورت اس میں سے کسی کو اندر اتارا جاسکے۔ حجرہ شریف کے گرد جو دوسرا حجرہ یا احاطہ تعمیر کرایا اس کو مخمس یعنی پانچ پہلو کا بنوایا۔ مربع اس خوف سے نہ رکھا کہ زائرین کعبے کا ہمشکل سمجھ کر اس کا بھی طواف نہ کرنے لگیں۔

ولید بن عبد الملک نے تعمیر مسجد کے لیے روم سے کاریگر بلوائے تھے چنانچہ چالیس رومی اور چالیس قبطی عیسائی اس کام پر مقرر کیے گئے تھے اور چونکہ مسجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ حجرہ شریف بھی تعمیر کیا گیا تھا اس لیے حجرہ شریف بھی غالباً انہیں عیسائیوں نے بنایا۔

عمر بن عبد العزیز کی تعمیر کے وقت حجرے کی مشرق رویہ دیوار کا پایہ کھودتے وقت ایک پاؤں ظاہر ہوا تھا۔ لوگ گھبرائے کہ آنحضرتؐ کا پائے مبارک تو نہیں ہے مگر حضرت عروہؓ صحابی کے اطمینان دلانے سے جنھوں نے دفن کے وقت آنحضرتؐ کی قبر شریف کو دیکھا تھا ثابت ہوا کہ آنحضرتؐ کی قبر جنوبی دیوار کے نیچے ہے اور یہ پاؤں حضرت عمر کا تھا جو تنگی مکان کی وجہ سے بنیاد میں آگیا تھا میت کے پاؤں دیکھنے اور واقعہ کی صحت کے لیے جو لوگ اس وقت حجرہ شریف میں داخل ہوئے تھے ان میں عمر بن عبد العزیز۔ قاسم بن محمد۔ سالم بن عبد اللہ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز حجرے میں ادباً داخل نہیں ہوئے تھے۔ غرضکہ دیوار کا پایہ تھوڑی دور ہٹا کر کھدوایا۔ اور اس طرح حجرہ شریف جو پہلے تقریباً مستطیل تھا وہ جانب مشرق کچھ زمین شامل ہو جانے سے مربع سا ہو گیا۔ پھر اس کے باہر مخمس احاطہ جسے حضار و حزور بھی کہتے ہیں تعمیر کرایا۔ حجرہ شریف کی اس تعمیر کے وقت عروہ صحابی نے عمر بن عبد العزیز سے کہا تھا کہ اگر حجرہ شریف کو ایسا ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "امیر المومنین ولید بن عبد الملک کا یہی حکم ہے اور بغیر اس کے چارہ نہیں۔" عمر بن عبد العزیز کی تعمیر کے بعد اگرچہ دو تین مرتبہ حجرہ شریف کی تعمیر و ترمیم کی ضرورت ہوئی ہے جس کی صراحت آگے کی جائے گی مگر اسکی

لمبائی چوڑائی میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ ان دونوں اندرونی و بیرونی حجروں کی پیمایش کتاب وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ عربی مطبوعۂ مصر مولفہ سید سمہودی سے اخذ کر کے یہاں درج کی جاتی ہے اور حجروں کا نقشہ بھی دیا جاتا ہے تاکہ اُن کی وضع سمجھ میں آسکے۔ سید ممدوح نے اپنی کتاب میں مختلف مقامات پر یہ پیمایش بیان کی ہے۔ میں نے اس کو ایک جگہ کر لیا ہے اور اندرونی پاکسی اور سمت کی پیمایش جو اُن کی کتاب سے نہ ملی اُس کو حسابی عمل وقاعدہ مساحت ومشاہدہ ومعائنہ سے معلوم کرکے ہر قسم کی پیمایش دریافت کرلی ہے۔ وفاء الوفا میں پیمایش ہاتھوں کے حساب سے ہے میں نے عام فہم ہونے کے خیال سے فٹ اور انچوں میں لکھدی ہے۔ اندرونی حجرہ و بیرونی احاطہ کا نقشہ جو ذیل میں کھینچا گیا ہے اُس میں بھی اسکیل وپیمانہ کا لحاظ رکھا ہے۔
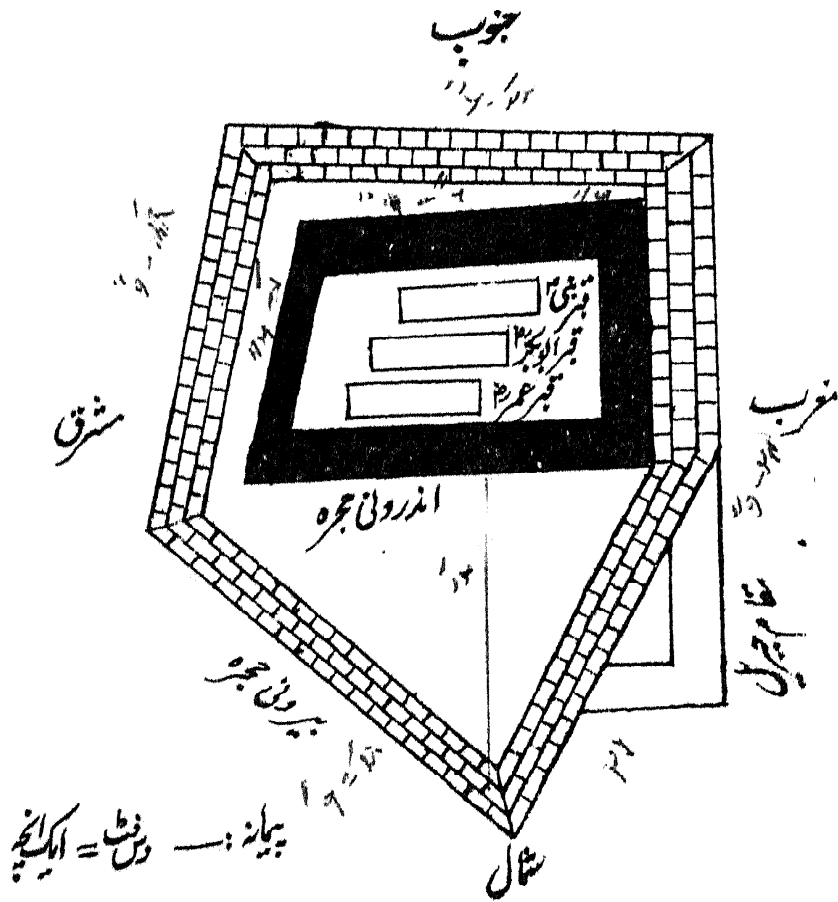
(الف) حجرۂ اندرونی۔

	دیواروں کی اندرونی پیمایش	دیواروں کا آثار	دیواروں کی بیرونی پیمایش
جنوبی دیوار	۱۲ فٹ - ۲-۱ انچ	۲ فٹ - ۳-۱ انچ	۱۵ فٹ - ۶-۱ انچ
شمالی 〃	۱۳ 〃 - ۸ 〃	〃 〃	۱۷ 〃 - ۰
شرقی 〃	۷ 〃 - ۰	۱ - ۱	۱۱ 〃 - ۶ 〃
غربی 〃	۷ 〃 - ۰	۲ - ۳	۱۱ 〃 - ۶ 〃
دیواروں کی بلندی	۲۲ 〃 - ۶ انچ		

حجرے کی سطح سے گنبد نما چھت تک بلندی (۲۷) فٹ (۴) انچ

(ب) بیرونی احاطہ یا مخمس حجرہ۔

اندرونی پیمایش	دیواروں کا آثار	دیواروں کی بیرونی پیمایش	کیفیت
جنوبی دیوار ۱۸ فٹ - ۶ - انچ	۲ فٹ	۲۲ فٹ - ۶ انچ	
مشرقی دیوار ۱۴ فٹ - ۹ - انچ	۲ فٹ	۱۸ 〃 - ۹ - 〃	
غربی دیوار ۲۰ 〃 - ۹ 〃	۲ 〃	۲۴ 〃 - ۹ 〃	...... یہ پیمائش مقام جبرئیل تک کی ہے ورنہ حجرے کی دیوار تک جہاں اسکا الحاق ہوا ہے ۱۴ فٹ ۹ انچ ہے۔
مثلث کا غربی ضلع ۱۷ 〃 - -	۲ 〃	۲۱ 〃 - - ۰	
〃 〃 شرقی ۱۴ 〃 - ۹	۲ 〃	۱۸ 〃 - ۹ 〃	
دیواروں کی بلندی ۱۸ 〃 - - ۰	۲	۲۰ 〃 - - ۰	

(ج) حجرے اور احاطہ کی دیواروں کے درمیان سیری

جنوب میں قریب مواجہ شریفہ (۹) انچ — مشرق میں ایک فٹ چھ انچ

جنوب میں مواجہ شریفہ سے ہٹ کر (۱) فٹ (۶) انچ — مغرب میں دونوں دیواریں چسپاں۔

شمال میں حجرے کی دیوار سے مثلث کے راس تک (۱۲) فٹ۔

اگرچہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی و سید جعفر برزنجی وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ عمر بن عبد العزیز نے حضرت عمرؓ کا کچی اینٹوں کا بنوایا ہوا حجرہ ڈھا کر نقشی پتھر کی دیواروں کا حجرہ تیار کرایا اور اُس کے باہر سنگین حظیرہ (احاطہ) بنوایا مگر اس فقیر کی رائے میں عمر بن عبد العزیز نے اندرونی حجرہ

مٹی کا اور بیرونی احاطہ نقشی پتھر کا تعمیر کرایا تھا۔ چنانچہ سید سمہودی کے بیان سے ایک جگہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عمر بن عبد العزیز کے تعمیر کردہ اندرونی حجرے کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں ۵۴۸ھ میں جب حجرۂ شریف کے اندر ایک دھماکہ کی آواز سنائی دی تو معلوم ہوا کہ غرب رویہ دیوار کی کچھ اینٹیں نکل کر گر گئی ہیں۔ اُن کی بجائے مسجد نبوی کی مٹی سے اینٹیں بنا کر دیوار کی مرمت کی گئی اور مثلِ سابق بنا دیا گیا۔ تفصیل اس واقعہ کی آگے تحریر کی جائے گی۔ اس سے ثابت ہے کہ عمر بن عبد العزیز کا بنوایا ہوا اندرونی حجرہ سنگین نہ تھا بلکہ کچی اینٹوں کا تھا ورنہ پتھر میں خاکِ مسجد کی اینٹوں کا پیوند نہ لگایا جاتا اور یہ نہ کہا جاتا کہ حسب سابق بنا دیا گیا۔

بعض صاحبوں نے اس امر کے تعین کرنے میں بھی غلطی کی ہے کہ اس وقت مزارِ اقدس کے گرد کتنی دیواریں ہیں۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب مہاجر جو سید جعفر برزنجی کے متبع ہیں اپنی کتاب السکینہ باخبار مدینہ میں فرماتے ہیں :-

"کہتے ہیں کہ قبر شریف کے گرد تین دیواریں ہیں۔ ایک دیوار حضور کے اصلی مکان کی۔ دوسری دیوار پتھر کی جس کو عمر بن عبد العزیز نے بنوایا۔ تیسری دیوار حظیرہ (احاطہ) کی۔" (السکینہ ص۱۱۱)

اس ہیچمدان کی رائے میں مولوی صبغۃ اللہ صاحب سے سہو ہوا ہے۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں اندرونی حجرے کی دیواریں ٹٹیوں کی تھیں اُن کی بجائے حضرت عمرؓ نے اینٹ کی دیواریں بنوا دی تھیں۔ ان کی بلندی میں عبد اللہ ابن زبیر نے کچھ اضافہ کیا تھا۔ اِن دیواروں کو ڈھا کر عمر بن عبد العزیز نے کچی اینٹوں سے حجرہ تعمیر کرایا۔ اور اس کے گرداگرد ایک نقشی سنگین حظیرہ یا احاطہ مخمس شکل کا بنوایا پس مزارِ اقدس کے گرد اس وقت دو ہی دیواریں ہیں۔ عمر بن عبد العزیز کا بنوایا ہوا حجرہ و حظیرہ پہلی آتشزدگی کے وقت ۶۵۴ھ تک موجود تھا۔ ابن جبیر نے سنہ ۵۸۰ھ میں اس کی کیفیت لکھی ہے وہ فرماتے ہیں :-

"حجرۂ شریف کے پانچ گوشے یعنی ۵ دیواریں ہیں۔ ہر دیوار کے نیچے کا ایک تہائی حصہ جسے ازار کہتے ہیں خوبصورت ترشے ہوئے پتھروں سے بنایا ہے۔ درمیان کے ایک تہائی حصے کو مشک و عود و عنبر و عطریات سے لیپا

گیا ہے جس سے دیوار پر نصف بالشت موٹی تہہ بطور کہہ گِل کے چڑھ گئی ہے
سب سے اوپر کے ایک تہائی حصے میں لکڑی کی جالیاں ہیں جو مسجد کی چھت
سے ملی ہوئی ہیں۔"

(۱۱) حجرۂ مزار اقدس میں ایک داخلی

یہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے کہ عمر بن عبد العزیز نے حجرۂ اقدس اور اس کے باہر کے مخمس احاطے میں کوئی دروازہ نہیں رکھا تھا۔ اس طرح زائرین کو قبر شریف حضرت سرور کائنات ؐ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع نہیں رہا تھا اور اس طرح تقریباً سنہ ۹۱ھ سے مرقد مبارک آنکھوں سے پنہاں تھا اور کوئی خاص ضرورت ایسی بھی پیش نہیں آئی تھی جس کی تکمیل کے لیے چھت کی کھڑکیوں میں سے کسی کو حجرے کے اندر اتارا جاتا۔ سنہ ۵۴۸ھ میں حجرۂ شریف کے اندر دھماکے کی آواز سنائی دی جس سے خیال ہوا کہ کوئی دیوار وغیرہ اندر گر گئی ہے۔ دریافت حال کے لیے عمر النشائی ساکن موصل کو جو مشائخ صوفیہ میں سے تھے اور مدینے میں مقیم تھے چند روز بھوکا رکھ کر کہ نظافت وطہارت ان میں زیادہ ہو جائے۔ ع
ایک خواجہ سرا کے کمر میں رسی باندھ کر اور شمع ساتھ دے کر چھت کی کھڑکی میں سے جو عمر بن عبد العزیز نے رکھی تھی اندر اتارا۔ ایک روایت یہ ہے کہ بدر عباسی نامی کسی بزرگ کو جو قائم اللیل وصائم الدہر تھے یہ شرف حاصل ہوا تھا۔ اندر جاتے کے بعد معلوم ہوا کہ غربی دیوار سے کچھ اینٹیں گر کر ٹوٹ گئی ہیں اور کچھ خاک گری ہے۔ شیخ موصوف نے اس مقام کو اپنی محاسن سے پاک کیا اور خاک مسجد سے اینٹیں بنا کر دیوار کو مثل سابق تیار کر دیا حجرے کے اندر ان کو مٹی میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا ملا تھا۔ یہ ٹکڑا اور دیوار کی گری ہوئی اینٹوں کا تھوڑا سا چورا یہ اپنے ساتھ لے کر باہر آئے اور یہ تبرکات بغداد بھیجے گئے وہاں ان چیزوں کے پہنچنے کے دن بڑی خوشی منائی گئی۔ لوگوں نے اپنے کاروبار چھوڑ دیے اور ان تبرکات

استقبال کے لیے گھروں سے نکلکر دور تک گئے[1]

(۱۲) حجرۂ مزارِ اقدس میں ایک اور داخلی

۵۵۴ھ میں گیارہ ربیع الآخر کو شنبہ کے دن حجرۂ شریف کے قریب کچھ مکروہ بو معلوم ہوئی اُس وقت صفی الموصلی متولی مسجد۔ ہارون شادبے صوفی اور بیان نامی حبشی خواجہ سرا کھڑکی میں سے اندر اُترے معلوم ہوا کہ مسجد و حجرہ کی چھتوں کے درمیان ایک مُردہ بلی پڑی ہے اُس کو دور کر کے یہ لوگ باہر آ گئے۔

(۱۳) مسجدِ نبوی کی پہلی آتشزدگی اور مزارِ اقدس

عمر بن عبد العزیز کا بنوایا ہوا حجرہ ساڑھے پانسو برس سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا۔ یہاں تک کہ ۶۵۴ھ میں مسجد نبوی میں آگ لگی اور اس سے حجرۂ شریف کو بھی بہت کچھ نقصان پہنچا۔ کیفیت اس کی یہ ہے :-

یکم رمضان ۶۵۴ھ کو سرِ شام ابوبکر بن احمد نامی فراش قندیلیں روشن کرنے کے لیے مسجد نبوی کے ایک حجرے میں گیا اس کے ہاتھ میں سے جلتی ہوئی بتی چھوٹ کر گر پڑی اُس سے کمل اور بوریے میں جو یہاں رکھا ہوا تھا آگ لگ گئی۔ اور اتنی بھڑکی کہ اُس کے شعلے مسجد کی چھت تک پہنچ گئے۔ وہ جل اُٹھی۔ اب آگ سب طرف پھیل گئی۔ اور منبر۔ خزانۂ قرآن کتابیں۔ غلاف حجرۂ شریف۔ غرض جو کچھ مسجد کی چھت کے نیچے تھا سب جل گیا۔ کوئی لکڑی

[1] یہ واقعہ خلیفہ مقتفی باللہ کے زمانہ کا ہے جس کی سلطنت ۵۳۰ھ سے ۵۵۵ھ تک رہی۔ بعض اسکو مستضیٔ بنور اللہ کے زمانہ کا واقعہ بتاتے ہیں جس کا عہدِ سلطنت ۵۶۶ھ سے ۵۷۵ھ تک ہے۔

صحیح و سالم نہ رہی۔ اس وقت حجرۂ شریف پر تہہ بہ تہہ گیارہ غلاف تھے وہ سب جل گئے اور مسجد میں سنہ ۵۷۶ھ اس ایک گنبد کے جو حرم کے ذخائر رکھنے کے لیے الناصر لدین اللہ نے بنوایا تھا اور جس میں مصحف عثمانی[1] اور چند بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے کوئی حصہ محفوظ نہ رہا۔ پتھر کے ستون جل کر کھجور کے تنوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔ ہوا چلتی تھی تو ہلتے تھے۔ مسجد کی چھت جو حجرۂ شریف کی چھت سے اوپر تھی جب وہ جل کر گری تو اس سے حجرے کی چھت بھی ٹوٹ گئی اور دونوں چھتیں قبروں کے اوپر گر پڑیں۔ چھتوں کا ملبہ اور ٹوٹی پھوٹی جلی جلائی چیزوں کو جو قبروں پر گری تھیں لوگوں نے اٹھانا چاہا لیکن قبروں کے احترام و عظمت و ہیبت کی وجہ سے ہمت نہ پڑی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ خلیفۂ وقت مستعصم باللہ[2] سے اس معاملہ میں استمزاج کریں۔ چنانچہ اس سانحہ کی اطلاع خلیفہ کو کی گئی اور وہاں سے جواب آنے تک قبروں کو کسی نے ہاتھ نہ لگایا۔ اور خاک و خاکستر جو کچھ ان پر پڑا تھا وہیں پڑا رہا۔ البتہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد سے خس و خاشاک ہٹا کر جگہ نکال لی۔ سنہ ۵۵ کے اوائل میں تعمیر کی ابتدا ہوئی۔ ہنوز تمام نہ ہونے پائی تھی کہ سنہ ۶۵۶ھ میں تاتاریوں نے خلافت بغداد کو دنیا سے مٹا دیا۔ آخر ملک منصور نورالدین علی[3] سلطان مصر نے چھ سو پچاس کاریگر اور سامان روانہ کیا اور پھر ملک الظاہر رکن الدین[4] سلطان مصر نے

---

[1] - حجرۂ شریف کے خزانہ میں ایک قرآن موجود ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ وقت قتل حضرت عثمان رضی اسی میں تلاوت کر رہے تھے۔ ابن جبیر کا بیان ہے کہ یہ منجملہ اُن قرآنوں کے ہے جو حضرت عثمان رضی نے بعد تدوین مختلف ملکوں میں روانہ کیے تھے بعض لوگ مصحف عثمانی کے غائب ہو جانے کی اور بعض کہیں اور محفوظ ہونے کی روایت کرتے ہیں مصر میں بھی ایک قرآن موجود ہے جس پر حضرتِ عثمان رضی کے خون کا نشان بیان کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک قرآن مکہ معظمہ میں بھی ہے۔ [2] - یہ خلفائے عباسیہ میں آخری خلیفہ تھا۔ سنہ ۶۴۰ھ ہجری میں ہلاکو خاں نے اس کو مع اس کے لڑکوں کے قتل کیا اس کے بعد خلافتِ بغداد کا ہی خاتمہ ہو گیا۔ یہ واقعہ نہایت مشہور ہے۔ صراحت کی حاجت نہیں۔

[3] - ملک منصور نورالدین علی کی مدت سلطنت سنہ ۶۵۵ھ سے سنہ ۶۵۷ھ تک ہے۔

[4] - ملک الظاہر رکن الدین سنہ ۶۵۸ھ سے سنہ ۶۷۶ھ تک بادشاہ مصر و حجاز رہا۔

مدد کی اور شمس الدین یوسف بادشاہ یمن نے بھی آلات عمارت روانہ کیے یہاں آکر ۶۵۹ھ میں حجرہ شریف و مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہوگئی۔

(خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفےٰ عربی مطبوعہ مصر باب (۴) فصل (۳) صفحہ ۱۵۵)

ابن بطوطہ اس تعمیر کے ساٹھ ستر برس بعد ۷۲۶ھ میں زیارت کو گیا تھا گر انہیں ہے کہ اس نے کچھ صراحت نہیں کی۔ اس کی تحریر سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حجرہ شریف سنگِ مرمر کا تھا اس نے بجائے مخمس کے اس کو گول سمجھا۔

(۱۴) مزارِ اقدس سے منتقلی اجسام کی کوشش

تاریخوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مخالفوں نے حجرۂ شریف سے آنحضرتؐ کا جسد اطہر اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اجسام نکالنے کی چار مرتبہ کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔ ان کوششوں کا مجمل ذکر یہاں تواریخ مدینہ سے اقتباس کر کے درج کیا جاتا ہے۔

الف۔ شیعیانِ حلب کا ارادہ۔

بحوالہ کتاب ریاض النضرہ مولفہ شیخ محب الدین طبری تاریخ وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ و نزہۃ الناظرین وغیرہ میں ہے کہ ہارون ابن شیخ عمر بن شمس الدین صواب دربان حرم نبوی روایت کرتے ہیں کہ حلب کے شیعوں میں سے کچھ لوگ امیر مدینہ کے پاس آئے اور بہت سا مال اس کو دینے کے لیے اس غرض سے لائے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے جسموں کو حجرۂ شریف سے نکالنے کی اجازت دیدے امیر مدینہ نے اس بات کو قبول کرلیا اور شمس الدین کو بلاکر حکم دیدیا۔ کہ جس وقت یہ لوگ حرم شریف کا دروازہ کھلوائیں کھول دینا اور جو کچھ کریں اس میں مزاحم نہ ہونا۔ دربان کہتا ہے کہ جب نمازِ عشا سے فارغ ہوکر لوگ چلے گئے اور دروازہ حرم کا میں نے بند کردیا تو چالیس آدمی (بروایت دیگر بیدرہ آدمی) پھاوڑے

کدالیں اور شمعیں ہاتھوں میں لیے آگئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور کونے میں بیٹھکر زار زار رونے لگا۔ وہ لوگ منبر تک بھی نہیں پہنچنے پائے تھے کہ سب کے سب زمین کے اندر سما گئے۔ مدینے کا امیر منتظر تھا جب دیر ہوئی تو دربان کو بلا بھیجا اُس نے جو کچھ دیکھا تھا کہدیا مگر امیر کو یقین نہ آیا۔ دربان نے کہا امیر خود چل کر دیکھ لے کہ اب تک زمین کے پھٹنے کا اثر باقی ہے۔

(وفاء الوفا صـ۴۷۱ ۔ خلاصۃ الوفا صـ۱۵۴ ۔ نزہۃ الناظرین صـ۸۲)

اگرچہ حکایتِ مذکورۂ بالا کو طبری ثقات کی طرف منسوب کرتے ہیں اور راویوں کا نام بھی بتادیا ہے مگر نہ اس واقعہ کا سنہ لکھا نہ اُس بادشاہ کا نام جس کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور جس کے تحت اُس زمانے میں سلطنت حجاز و حلب تھی اور نہ اس امیر مدینہ کا نام ظاہر کیا جس نے حجرۂ شریف میں نقب لگانے کی اجازت دیدی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا قحط الرجال کا زمانہ تھا۔ جب سوائے ایک ہارون دربان حرم نبوی کے اور کوئی دربان نہ تھے۔ ایسی صورت میں واقعۂ مذکور تاریخی حیثیت سے بالکل گر گیا اور محض ایک کہانی رہ گئی۔ علاوہ ازیں "ریاض النضرۃ" کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ مناقب کی کتاب ہے اور یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی فضائل میں لکھا ہے اس لیے تاریخی واقعہ نہیں کہا جاسکتا۔ مناقب کی کتاب میں رطب و یابس سب بھر دیتے ہیں۔ ریاض النضرۃ کی روایتیں اکثر ضعیف ہیں۔ مولوی شبلی مرحوم نے جابجا الفاروق میں اس کتاب اور اس کے مؤلف کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مناقب کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات درج کرنے سے کسی تاریخی واقعہ کا اظہار مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ مؤلف کی اصلی غرض اظہار منقبت ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مزارات و مقامات مقدسہ کو مخالفین کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے معجزے اور کراماتیں مشہور کردی جاتی ہیں جن میں وہاں بے ادبی کرنیوالوں کی سزا کا ذکر ہوتا ہے اور غرض اس سے یہ ہوتی ہے کہ ان مقامات پر جرائم کا سدباب ہوجائے اور اقدام جرم کے لیے کسی کی ہمت نہ پڑے اور ان مقامات سے عقیدہ رکھنے والوں کے اعتقاد میں پختگی زاید ہوجائے۔ کیا عجب ہے کہ واقعۂ مذکور بھی اسی خیال سے وضع کیا گیا ہو۔

یا کسی مفتری نے سنی شیعوں میں اختلاف بڑھانے کے واسطے یہ قصہ گڑھا ہو۔ اگر اس واقعہ کو صحیح بھی مان لیں تو بھی کچھ حیرت کی بات نہیں ہے جو لوگ کرامات کے قائل نہ ہوں اُن کو سمجھانے کے لیے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے امیر مدینہ نے حلب والوں سے روپیہ کا روپیہ لے لیا ہو اور سرنگ کھود کر اُن کو زمین میں زندہ دفن کر دیا ہو۔ اس کے بعد یہ قصہ ایک معجزنما طریقے سے مشہور ہو گیا۔

(ب) حاکم بامر اللہ کا خبط۔

دوسرا واقعہ منتقلی اجسام کے متعلق یہ ہے کہ حاکم بامر اللہ[1] مصر کے دیوانے بادشاہ کو یہ خبط سمایا کہ آنحضرتؐ کا جسد مبارک اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے اجسام مصر میں اگر منتقل کر دیے جائیں تو ساری دنیا کے مسلمان زیارت کے لیے اس طرف آنے لگیں گے اور مصر و اہل مصر کے لیے دینی و دنیوی فوائد کا باعث ہو گا۔ چنانچہ اُس نے قاہرہ میں

---

[1] اس کا نام منصور اور لقب حاکم بامر اللہ تھا۔ یہ خلفائے فاطمی یا عبیدیۂ مصر میں چھٹا خلیفہ تھا۔ ۳۸۶ھ میں بادشاہ ہوا۔ چونکہ عبید اللہ مہدی بانیٔ سلطنت کی اولاد میں تھا۔ اس وجہ سے تاریخوں میں یہ حاکم عبیدی کے نام سے مشہور ہے۔ عجب دیوانہ تھا طرح طرح کے متضاد حکم دیا کرتا تھا۔ لوگوں کو قتل کرانے میں اس کو مزا آتا تھا۔ حجر اسود کو توڑنے کے لیے بھی اس نے کچھ آدمی مکۂ معظمہ بھیجے تھے مگر ناکامی ہوئی۔ بایں ہمہ دیوانگی فیاض و علم دوست تھا۔ طریقۂ شیعہ اسماعیلیہ کا پابند تھا۔ کئی مدرسے مسجدیں اور رصدگاہیں اس نے بنوائی تھیں۔ قاہرہ کے پاس ایک پہاڑ ہے جسے المقطم کہتے ہیں اس کی چوٹی پر ستارہ شناسی کے لئے اس نے ایک مکان بنوایا تھا۔ ۲۷ شوال ۴۱۱ھ کو حسب معمول عبادت کے لیے یا ستاروں کا معائنہ کرنے کے واسطے صرف دو ملازموں کے ساتھ یہ وہاں گیا اور ملازموں کو واپس کر دیا پھر وہاں سے یہ واپس نہ آیا۔ غالباً وہاں کسی نے اس کو قتل کر دیا۔ اس نے ایک نیا مذہب بھی ایجاد کیا تھا اور اپنے تئیں خدا کا اوتار کہتا تھا۔ اس کے پیرو فرقہ دروز کے لوگ جو علاقہ کوہ لبنان واقع شام میں رہتے ہیں۔ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حاکم بامر اللہ آسمان پر چلا گیا ہے۔ قیامت کے قریب ظاہر ہو گا۔ ۱۳۴۴ھ ہجری میں انھیں لوگوں نے حصول آزادی کے لیے فرانسیسیوں کے خلاف بڑی جدوجہد کی تھی۔

ایک بڑا امکان اسی غرض سے بنوایا اور ابو الفتوح[ل] کو جو اُس کی طرف سے والی مکہ و مدینہ تھا اس مہم کے انجام دینے کا حکم دیا۔ اہل مدینہ اس کیفیت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ مگر سرزمین حجاز چونکہ حاکم بامر اللہ کے تصرف میں تھی اس لیے ابو الفتوح پر قاتلانہ حملہ کرنے سے تامل کیا۔ آخر ایک مجلس میں جہاں ابو الفتوح بھی موجود تھا ایک قاری نے بڑے جوش کے ساتھ موثر لہجے میں یہ آیت پڑھی۔ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ " یعنی اگر تم ایمان والے ہو تو کیا اُس قوم سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور اپنے پیغمبر کو نکالنے کا قصد کیا" حاضرین مجلس میں اس وقت بڑا جوش و اشتعال پیدا ہو گیا اور قریب تھا کہ ابو الفتوح کو وہیں مار کر ڈھیر کر دیں۔ ابو الفتوح پر بھی سخت ہیبت طاری ہو گئی اور اتفاق سے اُس رات کو ایک زلزلہ اور سخت آندھی چلی جس کو اس نے قہر و غضب الٰہی کے آثار سمجھا آخر وہ حاکم بامر اللہ کی ناراضگی کا ہر طرح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور اس ارادہ سے باز آگیا۔

(سمہودی صفحہ ۱۵۴ قلقشندی جلد (۴) صفحہ ۲۹۹)

اگرچہ واقعۂ مذکورۂ بالا ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس میں ہم اس قدر اور اضافہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ حاکم بامر اللہ پر وہ مثل صادق آتی ہے کہ "بد اچھا بدنام برا"۔ وہ تو بد بھی تھا اور بدنام بھی۔ اس لیے کیا عجب ہے کہ ابو الفتوح نے اس سے سرکشی و تمرد اختیار کرنے کا یہ سبب قرار دیا ہو اور اہل حجاز کو اپنی طرف ملانے کے لیے یہ مشہور کر دیا ہو کہ حاکم بامر اللہ نے منتقلی اجسام کا حکم دیا تھا اس لیے میں نے اُس سے بغاوت کی۔

صاحب تاریخ جامع اللطیف اور قلقشندی نے ابو الفتوح کے تمرد کا ذکر بصراحت کیا ہے کہ حاکم بامر اللہ نے ۳۹۸ھ میں اپنے عمال کو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے

ل۔ ابو الفتوح الحسن بن جعفر الحسینی کو حاکم بامر اللہ نے ۳۹۰ھ میں والی حجاز مقرر کیا تھا۔ عدم تعمیل حکم منتقلی اجسام یا مذہب شیعہ اسماعیلیہ اختیار نہ کرنے پر حاکم بامر اللہ نے ناراض ہو کر اس کی امامت سے موقوف کر دیا۔ اس نے تمرد اختیار کر کے راشد باللہ اپنا لقب رکھا اور مکہ معظمہ میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا آخر میں اس نے حاکم بامر اللہ سے معافی مانگ لی۔ یہ ۴۳۰ھ میں مرا اور مرتے دم تک امیر حجاز رہا۔

تبرا کرنے کے لیے لکھا تھا اس سے ابوالفتوح نے انکار کردیا اور راشد باللہ لقب اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ مکے میں پڑھوایا۔

(جامع اللطیف صفحہ ۳۰۵ قلقشندی جلد (۴) صفحہ ۲۹۹)

(ج) اسپین کے عیسائیوں کا منصوبہ اور خندق الرصاص

۵۵۷ھ میں سلطان نورالدین محمود شہید بن زنگی[51] والی شام نے ایک رات میں تین مرتبہ آنحضرت صلعم کو خواب میں دیکھا کہ دو شخصوں کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں کہ مجھے ان بھوری آنکھوں والوں کے شر سے بچا۔ سلطان یہ خیال کر کے کہ غالباً کوئی امر موجب ایذائے رسول اللہ ہوا ہے۔ اسی وقت مع اپنے وزیر جمال الدین جواد کے صرف بیس آدمیوں کو ساتھ لیکر یلغار کرتا ہوا سولہ دن میں مدینے پہنچا اور ان شخصوں کی گرفتاری کے لیے یہ تدبیر کی کہ انعام تقسیم کرنے کے حیلہ سے تمام اہل شہر کو طلب کیا۔ مگر وہ دونوں شخص جو خواب میں دکھائی دیے تھے نظر نہ پڑے۔ سلطان نے دریافت کیا اب تو کوئی اور شخص باقی نہ رہا۔ لوگوں نے کہا کہ اسپین کے دو حاجی جو بڑے عابد و زاہد ہیں اور اپنے حجرے سے باہر نہیں نکلتے وہ نہیں آئے۔ سلطان نے ان کو بھی بلوایا جب وہ حاضر ہوئے تو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہی وہ شخص ہیں جن کو آنحضرت صلعم نے خواب میں دکھایا تھا سلطان نے ان سے پوچھا تم کہاں رہتے ہو۔ کہا اس رباط میں جو حجرۂ شریف کے پاس ہے سلطان ان کو وہیں چھوڑ کر ان کے حجرے میں گھس گیا۔ وہاں قرآن اور وعظ کی کچھ کتابیں طاق پر رکھی ہوئی تھیں اور ایک چٹائی ان کے سونے کے لیے پڑی ہوئی تھی سلطان نے جب اسے اٹھایا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے حجرۂ شریف کی طرف ایک بڑی سرنگ کھودی ہے۔ یہ رات کو سرنگ کھودا کرتے تھے اور اس کی مٹی تکیوں کے غلاف میں بھر بھر کر زیارت کے حیلہ سے بقیع میں ڈال آیا کرتے تھے۔ آخر مار پیٹ سے انھوں نے اقبال کیا کہ وہ اسپین کے عیسائی تھے اور وہاں کے نصاریٰ بادشاہوں نے ان کو مغربی

[51] یہ بادشاہ بڑا بہادر سخی۔ عادل۔ اور متقی تھا۔ نصاریٰ سے اس نے بہت جہاد کیے اور صلیبی جنگوں میں حمیت اسلامی کا پورا ثبوت دیا۔ اس کا سنہ ولادت ۴۹۲ھ سن جلوس ۵۴۱ھ اور سن وفات ۵۶۹ھ ہے۔

(اسپین کے) حاجیوں کے بھیس میں مدینہ منورہ بھیجا تھا تاکہ حجرۂ شریف کے اندر داخل ہو کر جسد اطہر کے ساتھ بے ادبی کریں۔ ان کو قتل کر کے جلا دیا گیا اور حجرۂ شریف کے گرد ایک نہایت گہری خندق کھود کر کہ پانی تک پہنچ گئی تھی اُس میں سیسہ پگھلا کر بھر دیا تاکہ آئندہ وہاں تک کوئی نہ پہنچ سکے۔

(خلاصۃ الوفا سمہودی ص ۱۵۳ ۔ نزہۃ الناظرین ص ۸۷)

روایت مذکورۂ بالا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اگرچہ سچے خوابوں سے تمام دنیا کی تاریخیں بھری پڑی ہیں اور اس قسم کے معجزنما خوابوں سے کوئی سمجھ دار انسان انکار نہیں کر سکتا تاہم معجزوں کے منکر اس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں کہ سلطان نورالدین بغرض زیارت مدینے گیا ہوگا اور بادشاہوں کے دستور کے موافق انعام دینے کے لیے اہل مدینہ کو طلب کیا ہوگا۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ دو مغربی حاجی نہیں آئے ہیں ازراہِ عقیدت یا کسی شبہ پر اُن کے حجرے میں چلا گیا ہوگا اور وہاں سُرنگ کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی۔ بہر حال یہ واقعہ سچ معلوم ہوتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۵۵۵ھ میں حجرۂ شریف کے گرد خندق کھدوا کر سیسہ بھر دیا گیا ہے اور چونکہ یہ کام اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا اہم اور بڑے مصارف کا تھا اس لیے غالباً سلطان نے اطمینان کر لیا ہوگا کہ اس سے قبل حجرۂ شریفہ سے جسد اطہر سرورِ کائنات یا اجسام حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ منتقل نہیں کیے گئے ورنہ اگر اُس کو ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا یا کوئی روایت یا کہانی اس قسم کی سُن لیتا کہ مصریوں حلب کے شیعوں یا عیسائیوں نے اجسام کو یہاں سے منتقل کر دیا ہے تو وہ ہرگز یہ خندق بنوا کر زر کثیر صرف نہ کرتا۔ ۱۳۲۵ھ میں اس گنہگار نے خدام روضۂ منورہ سے اس خندق کا مقام دریافت کیا تو انھوں نے جالی کے اندر جو گیلری ہے اُس کے نیچے سیسہ کی خندق بتائی۔

(۷) شام کے عیسائیوں کا ارادہ

محمد ابن جبیر ذی الحجہ ۵۷۸ھ کے واقعات تحریر کرتے ہوئے اپنے سفرنامے میں فرماتے ہیں:

> ہم نے اسکندریہ پہنچ کر سب سے اوّل ایک جماعت کثیر کو دیکھا جو رومی قیدیوں کو دیکھنے کے واسطے جمع ہوئی تھی۔ قیدی اونٹوں پر اُلٹے سوار تھے

اور ان کے پیچھے نقارے بجتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ ان کے حالات سُننکر خوف و ہراس سے کلیجہ مُنھ کو آتا تھا۔ یہ قیدی شام کے نصرانیوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے بحر قلزم[1] کے کنارے کشتیوں کے واسطے تختے بنوائے اور اس سامان کو ہمسایہ عربوں کے اونٹ کرایہ کر کے ساحل تک لے گئے۔ ساحل سے کشتیاں بنا کر دریا میں ڈالیں اور ان میں سوار ہو کر عیذاب[2] میں آئے اور حاجیوں کی ایک کشتی کو جو جدے سے آتی تھی لوٹ لیا اور قافلے میں سے کسیکو زندہ نہ چھوڑا اس کے بعد یمن سے آتے ہوئے سوداگروں کے دو جہاز لوٹ لیے اور ساحل پر امیر مکہ و مدینیہ کی جس قدر جنس وغیرہ جمع تھی جلا دی غرضکہ ان لوگوں نے اس قدر بدکاریاں اختیار کیں کہ نہ اہل اسلام میں سننے میں آئیں اور نہ رومیوں سے ظہور میں آئیں سب سے بدتر خباثت اس جماعت کی یہ ہے جس کو کان برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا مقصد تھا کہ مدینیہ جا کر حضرت سرورِ کائنات کے جسدِ مبارک کو ضریح مقدس سے نکال لائیں۔ یہ تذکرہ ابھی ان کی زبانوں ہی پر تھا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی بے باکی کا مواخذہ کیا۔ مدینے سے ایک دن کی راہ باقی تھی کہ خداوند کریم نے ان کے شر کو دفع کیا۔ لولو حاجب کی کشتیاں جن میں دلیرانِ مغربی سوار تھے اس گروہ سے دوچار ہوئیں یہ لوگ ڈیڑھ مہینے سے ان کی تلاش میں تھے اُن کی کشتیاں گھیر لیں۔ بعض کو قتل اور بعض کو گرفتار کیا۔ قیدیوں کی کئی جماعتیں بنا کر بڑے بڑے شہروں میں قتل کے واسطے روانہ کیں اور ان کے سرغنوں کو مکہ معظمہ و مدینیہ منورہ میں قتل کے لیے بھیجا" ترجمہ سفرنامہ ابن جبیر ص ۲۸۔

[1] بحر قلزم افریقہ و عرب کے درمیان واقع ہے جدہ وینبوع اس کے خاص بندرگاہ ہیں چونکہ اسمیں مونگا بکثرت پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا نام بحر احمر یعنی سرخ سمندر بھی ہے [2] عیذاب مصر سے مکہ جاتے ہوئے بحر احمر کے کنارے ایک بندرگاہ و قصبہ ہے یہاں سے جدہ ایک دو دن کا راستہ رہجاتا ہے کسی زمانے میں اس کا شمار دنیا کے مشہور بندرگاہوں میں ہوتا تھا اور ہندوستان و یمن کے بہت سے تاجر یہاں سے گزرتے

مزار اقدس کی تعمیر سلطان قایدبے کے زمانہ میں

ملک الاشرف سلطان قایدبے[1] بادشاہ مصر کے حصے میں حرمین کی خدمت اللہ تعالیٰ نے بطور خاص عطا فرمائی تھی۔ اس نے حرمین میں بڑے بڑے فیوض جاریہ اور بالخصوص تعمیر امکنہ کے کام کیے۔ جن سے اُس کو حیات جاودانی حاصل ہو گئی۔ اور دنیا میں جب تک مدینہ کی تاریخیں رہیں گی اس کا نام ہمیشہ یادگار رہیگا۔

۸۸۱ھ میں حجرۂ مزار اقدس مرمت طلب ہو گیا تھا اس کی شمالی دیوار میں ترق آگئی تھی اور بنیاد میں بھی کچھ نقص ہو گیا تھا اس کی اطلاع ملک اشرف قایدبے کو کی گئی۔ اس نے انتظام تعمیر شمس بن زمن ناظر عمارات کے سپرد کیا۔ ۱۲ شعبان ۸۸۱ھ کو مرمت کے بارے میں صلاح و مشورہ کے لیے اکابر مدینہ کی ایک کمیٹی مسجد نبوی میں منعقد ہوئی اور عمارت کا ملاحظہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ بیرونی دیوار کی ترق کا باعث اندرونی دیوار کی خرابی ہے۔ پس ۱۴ شعبان کو دیواریں ڈھانا شروع کی گئیں اور مشرقی و شمالی دیوار کو زمین سے ۵ گز کی بلندی سے اوپر تک منہدم کیا تو حریق اول کے آثار نمودار ہوئے اور کچھ آدھ جلی لکڑیاں دکھائی دیں اُن کو علٰحدہ کیا۔ حالت کو مشاہدہ کرنے کے بعد ناظر عمارت نے ارادہ کیا کہ شرقی شمالی دیوار کو بالکل منہدم کر کے از سر نو بنائے۔ اور چھت کی بجائے قبہ تعمیر کرے۔ چنانچہ ان دیواروں کو زمین تک گرا دیا۔ اور جنوبی و غربی دیواریں بھی چار چار گز ڈھا دیں۔ ان میں سے کچی اینٹیں نکلیں جن کا طول ایک ہاتھ سے زیادہ تھا اور عرض کوئی بالشت بھر تھا۔ شاید یہ اینٹیں بنائے اوّل کی تھیں جن کو حجرے کی تجدید کے وقت تبرکاً رہنے دیا تھا۔ دیواروں کی مٹی جو

---

[1] قایدبے کا معرب قایتبائی ہے۔ عربی تاریخوں میں اس کا نام قایتبا یا قایتبائی مرقوم ہے۔ ملک اشرف ابو نصر قایدبے بادشاہ مملوکہ چرکسیہ مصر میں نہایت ہی مخیر و نیک گزرا ہے اس کو مسجد نبوی کی ترمیم و تعمیر کا دو مرتبہ شرف حاصل ہوا پہلی مرتبہ ۸۸۱ھ میں۔ دوسری مرتبہ ۸۸۶ھ میں دوسری آتشزدگی کے بعد۔ سلطان ممدوح ۸۷۲ھ سے ۹۰۲ھ تک سلطان مصر و حجاز رہا۔

حجرۂ شریف میں گری تھی اُس کو ہٹانے میں پورا ایک دن صرف ہوا اس وقت سید نورالدین علی مولف تاریخ خلاصتہ الوفا باخبار دار المصطفے کو شرف باریابی حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے جس حالت میں قبروں کو پایا تھا۔ اُس کی کیفیت قبور کی ہیئت و وضع کے ذکر میں اوپر تحریر کی جا چکی ہے باقی تعمیر کے متعلق سید ممدوح نے جو لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

حجرے کی چھت جو پہلے معمولی چھت تھی اب لداؤ کی بنا دی گئی اور اُس پر ایک چھوٹا سا قبہ بنایا۔ جس کی بلندی حجرے کی سطح سے چھت کی چوٹی تک ۲۷ فٹ ۱۴ انچ ہے۔ اس پر پیتل کا ایک ہلال نصب کیا۔ حجرے کی دیوار شمالی کے وسط میں ایک چھوٹی سی کھڑکی رکھی جس میں سے عود و عنبر حجرۂ شریفہ میں سُلگاتے تھے۔ جب بعض لوگ منّتیں مرادیں ماننے کے لیے عرضیاں لکھ لکھ کر اس کھڑکی میں سے حجرے کے اندر ڈالنے لگے تو اس کھڑکی کو بند کر دیا۔

اِس عمارت کی تعمیر ۱۰ شعبان ۸۸۱؁ھ سے شروع ہو کر ۱۷ شوال ۸۸۱؁ھ یوم پنجشنبہ کو ختم ہوئی۔

(خلاصتہ الوفا باب (۴) فصل (۱۲) صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۲)

اس تعمیر کے وقت جو قبہ نما چھت تعمیر کی گئی اُس کو بڑا گنبد یعنی قبۂ خضرا تصور نہ کرنا چاہیے۔ بڑا گنبد اُس وقت بھی علٰحدہ موجود تھا جو سابقہ چھت کے اوپر قائم تھا اور جس کی ترمیم کی اُس وقت ضرورت نہیں ہوئی تھی۔ توضیح نمبر (۱۷) میں قبۂ خضرا کے حالات ملاحظہ ہوں۔

(۱۶) مسجد نبوی میں دوسری آتشزدگی اور مزار اقدس

۱۳ رمضان ۸۸۶؁ھ ہجری کو پچھلے پہرے بجلی گرنے سے دوسری مرتبہ مسجد نبوی میں آتشزدگی ہوئی۔ اُس وقت شمس الدین خطیب موذن

منارۂ رئیسیہ[1] پر اذاں دینے کے لیے چڑھا ہوا تھا کہ ابر آیا۔ بوندیں پڑنے لگیں بجلی چمکنے لگی۔ بادل گرجے۔ اور ایک بڑی کڑک کے ساتھ منارۂ رئیسیہ پر بجلی گری اور منارے کی چوٹی کو ڈھا کر مسجد کی چھت کو پھوڑتی ہوئی نیچے تک پہنچ گئی۔ موذن اُسی وقت مرگیا۔ اس بجلی میں ایسے زبردست شعلے نکل رہے تھے کہ اُن سے مسجد کی چھت میں آگ لگ گئی۔ خدام نے مسجد کے دروازے کھول دیے اور غل مچایا۔ امیر مدینہ اور شہر والے سب جمع ہو گئے۔ بعضوں نے ہمت کی۔ پانی لے کر مسجد کی چھت پر چڑھ گئے مگر قابو نہ چلا اور قریب تھا کہ وہ بھی پھنک جائیں اس لیے بھاگ کر نیچے آئے بعض پریشانی میں سیڑھی پر سے گر کر مر گئے۔ اور کل دس بارہ آدمی اس طرح ہلاک ہوئے۔ آخر تمام مسجد میں آگ پھیل گئی اور مسجد کی ساری چھت اور جو کچھ سامان و اسباب و کتب و قرآن وغیرہ چیزیں یہاں تھیں سب جل گئیں۔ البتہ جس سامان کو ہمت کر کے نکال لے گئے وہ بچ گیا اس وقت مسجد آگ کا ایک دریا معلوم ہو رہی تھی جس کے شرارے آس پاس کے مکانوں تک پہنچ رہے تھے مگر اُن سے کوئی نقصان اُن مکانوں کو نہ پہنچا۔ صبح کے وقت ہمت کر کے اُس قبے کی جو چھت کی بجائے بنایا گیا تھا اور جسے قبۂ صغیر بھی کہتے ہیں آگ بجھائی گئی۔ اُس وقت دیکھا کہ حجرے کی یہ قبہ نما چھت آگ سے محفوظ رہی اور اس آگ کا اثر حجرے کے اندر مطلق نہ پہنچا۔ حالانکہ بڑا قبہ جل کر اس پر گر پڑا تھا اور مسجد کی چھت جو بڑے قبے اور قبۂ صغیرہ کے درمیان تھی اس کے بڑے بڑے ٹکڑے پہاڑ کے پہاڑ جل جل کر اس پر گرے تھے۔ یہ بھی حیرت ہے کہ اس قبۂ صغیرہ میں سفید پتھر لگا ہوا تھا جس میں بہت جلد آگ کا اثر ہو جاتا ہے مگر جلا نہیں۔ برخلاف اس کے سیاہ پتھر جو آگ قبول نہیں کرتا اُس کے ۱۲۰ استون جل کر کوئلہ ہو گئے۔ اور وہ ستون جو حجرۂ شریف سے ملے ہوئے تھے وہ بھی جل گئے اور

---

[1] سب سے پہلے ولید بن عبد الملک کے زمانہ ۹۰ھ میں مسجد نبوی کے چار کونوں پر چار منار بنائے گئے۔ عرب میں موذن کو رئیس کہتے ہیں چونکہ سابق میں اذاں اسی منار پر دی جایا کرتی تھی اس وجہ سے اس کا نام منارۂ رئیسیہ ہو گیا۔ بعد میں چاروں مناروں پر اذاں ہونے لگی۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے چار موذن ایک ہی وقت میں اذاں دیتے ہیں۔

مواجہ[1] شریفہ اور حجرے کے گرد جو لکڑی کی جالی تھی وہ سب جل گئی۔ صبح کو امیر و قاضی مدینہ اور شہر کی تمام عورتیں مرد، بچے بڈھے مسجد کو صاف کرنے میں مصروف ہوئے اور اس واقعہ کی اطلاع سلطان مصر و حجاز ملک الاشرف قایدبے کو بھیجی گئی۔ اس نے ایک سو کاریگر بیس ہزار دینار اور بہت سارا سامان اونٹوں اور گدھوں پہ لادھ کر روانہ کیا۔ آخر رمضان سنہ ۸۸۶ھ ہجری میں تعمیر ختم ہوئی۔ اس وقت اگرچہ حجرہ شریف بالکل محفوظ رہا تھا تاہم اس کا بڑا قبہ تعمیر کرایا گیا اور بیرونی حصوں پر جہاں جہاں تک آگ نے دست درازی کی تھی اُن کی درستی کیگئی۔

(۱۷) مزار اقدس پر گنبد اور قبۂ خضرا

آنحضرت کے زمانہ میں حجرہ شریف پر ایک پست چھت تھی جو کھجور کی کڑیوں سے پٹی ہوئی تھی یہ سنہ ۹۱ھ تک رہی۔ اس کے بعد عمر بن عبد العزیز نے جو حجرہ تعمیر کرایا اُس میں معمولی چھت کے علاوہ مسجد کی چھت سے کوئی سوا گز بلندی پر تختوں کا ایک سائبان سختہ اینٹوں کی منڈیر پر ڈالا۔ یہ مسجد کی چھت سے علیحدہ اونچا نظر آتا تھا اور اس پر موم جامہ پڑا رہتا تھا سنہ ۶۵۴ھ کی آتشزدگی میں یہ چھت جل گئی۔ اس کے بعد جو چھت تیار کی گئی وہ بھی اسی وضع کی تھی اور وہ تقریباً ساتویں صدی ہجری تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ سنہ ۶۷۸ھ ہجری میں الملک منصور[2] قلاؤن صالحی سلطان مصر نے حجرہ شریف کی چھت پر ایک چوبی قبہ بنوایا۔ یہ پہلا گنبد ہے جو مزار اقدس پر قایم کیا گیا۔ یہ نیچے سے مربع اور اوپر سے ہشت پہل تھا۔ اس کی لکڑی کے تختے کیلوں سے جمائے تھے اور اُن کے اوپر سیسے کی چادریں منڈھی تھیں۔

جعفر بن برزنجی اور اُن کے تتبع مولوی صبغۃ اللہ صاحب مولف کتاب السکینۃ باخبار مدینہ

---

[1] مواجہ کے معنی سرہانے کے ہیں۔ آنحضرت کے سرہانے کے امتیاز کے لیے جالی کے اندر ایک صندوق رکھا ہوا ہے۔ اسے صندوق مواجہ شریفہ کہتے ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عنوان علامت مواجہ شریفہ۔

[2] یہ بادشاہ خاندان قلاؤنیہ مصر کا پہلا سلطان ہے۔ اس کا عہد سلطنت سنہ ۶۷۸ھ سے ۶۸۹ھ تک رہا۔

لکھتے ہیں کہ قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا قبہ پہلی آتشزدگی میں جل گیا یہ صحیح نہیں ہے اس وقت قبہ تھا ہی نہیں۔ اس آگ کے چوبیس برس بعد سب سے پہلا قبہ سنہ ۶۷۸ھ سلطان قلاؤن نے بنوایا تھا جس کو وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نزہتہ الناظرین صفحہ ۶۷ والسکینہ صفحہ ۱۱۶

بارش کی وجہ سے جب اس قبے کی سیسے کی چادروں میں نقص پیدا ہو گیا تو سلطان قلاؤن کے لڑکے سلطان ناصر حسن[1] نے اس کی مرمت کرائی۔ اس کے بعد سلطان اشرف[2] شعبان بن حسین سلطان مصر نے سنہ ۷۶۵ھ میں اس کو اور مستحکم کر دیا۔ اسی طرح زمانہ سلطنت الظاہر جقمق میں سنہ ۸۴۳ھ سے سنہ ۸۵۳ھ مسجد نبوی کی ترمیم کے وقت زیر نگرانی امیر بردبک المعمار اس کی درستی کی گئی۔

سنہ ۸۸۱ھ میں جب حجرے کی دیواروں میں دراڑیں پیدا ہو گئیں تو ملک الاشرف سلطان قایتبائی نے دیواروں کی مرمت کے ساتھ ساتھ چھت کو بھی بدلوا دیا۔ اور بجائے معمولی چھت کے لداؤ کی چھت کر کے اس کو قبہ نما بنا دیا۔ یہ چھت تاریخ سمہودی میں قبۂ صغیرہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر پیتل کا ایک ہلال بھی نصب ہے۔ سطح حجرے سے اس ہلال تک بلندی (۲۷) فٹ ۴ انچ ہے۔ چونکہ اس چھوٹے قبے پر غلاف پڑا رہتا ہے اس وجہ سے یہ نظر نہیں آتا البتہ حجرے کی چھت بیچ میں سے ڈیرے کی طرح کچھ اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عام ناظرین اس قبے کی زیارت سے محروم ہیں شعبان سنہ ۱۲۹۶ھ میں جبکہ ایک سخت آندھی کی وجہ سے ایک طرف کی جالی گر پڑی تھی تو سید جعفر برزنجی کو چھت پر چڑھنے اور اس کی زیارت سے مشرف ہونے کا موقع ملا تھا وہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے ادب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حجرہ مربع ہے اس پر غلاف پڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ قبہ نظر نہیں آتا۔ جس کا ذکر سمہودی نے کیا ہے۔ لیکن وسط میں غلاف کسی قدر ڈھلوان اور بلند تھا جیسے خیمہ ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ قبے کے سبب سے غلاف کے بیچ میں بلندی ہے۔"

(نزہتہ الناظرین عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۹۹)

[1] سلطان ناصر بن قلاؤن سنہ ۶۹۳ھ میں بادشاہ مصر و حجاز ہوا مگر تھوڑے عرصہ بعد سلطنت سے دستبردار ہو گیا

[2] ملک اشرف شعبان سنہ ۷۶۴ھ سے سنہ ۷۷۸ھ تک سلطان مصر و حجاز رہا۔

سلطان قایدبے نے حجرۂ شریف پر چھت کی بجائے قبہ صغیرہ تعمیر کرا کے اس کے اوپر سلطان قلاؤن صالحی کا بنوایا بڑا قبہ جو اُس وقت صحیح سالم موجود تھا بدستور قائم رہنے دیا اور اُس وقت سے اب تک بھی حجرۂ شریف پر دو قبے ہیں ایک اندرونی قبۂ صغیرہ یا چھت دوسرا بڑا قبہ جو گنبدِ خضرا کہلاتا ہے۔

سنہ ۸۸۶ھ میں جب بجلی کی وجہ سے مسجد نبوی میں آتشزدگی ہوئی۔ اُس میں حجرے کی چھت یعنی قبۂ صغیرہ تو باقی رہا مگر سلطان قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا بڑا قبہ جل گیا اس لیے سلطان قایدبے نے سنہ ۸۸۸ھ میں حجرۂ شریف کی دیواروں پر دوبارہ قبۂ عظیم تعمیر کرایا۔ چند سال کے بعد اُس میں دراڑیں پڑگئیں اور مرمت سے کام چلتا نظر نہ آیا۔ تو اُس کے بالائی حصہ کو تھوڑا سا توڑ کر قبے کو کسی قدر چھوٹا کر دیا اور محرابوں میں تختے بچھا کر کام شروع کیا تاکہ اوپر سے کچھ گرے تو حجرۂ شریف پر نہ گرے۔ اس قبے کی تعمیر میں بڑے ادب سے کام لیا گیا معماروں نجاروں کے چڑھنے اُترنے اور سامان لانے لیجانے کے لیے مسجد کی شرقی جانب سیڑھیاں لگائی گئیں اور ایسا خاموشی کے ساتھ کام ہوا کہ نمازیوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ یہاں تعمیر ہو رہی ہے سنہ ۸۹۲ھ میں قبہ بن کر تیار ہوا۔

سنہ ۲۹۶اھ میں سید جعفر برزنجی نے اس قبے کو اندر سے دیکھا تھا وہ فرماتے ہیں کہ قبے کے اندر مختلف قسم کے خوشنما نقش و نگار ہیں اور نیچے اُس کے اطراف میں جلی قلم سے کچھ لکھا ہوا ہے۔ مغربی جانب انھوں نے حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی دیکھی دوسری جانب ان کی نظر نہ پہنچ سکی۔

انشاء هٰذهِ القبّة الشريفة العالية المُعترف بالتقصير

الراجی عفو ربہ الغنی قایتبا۔ (نزہتہ الناظرین صہ ۶۹)

یعنی اس عالیشان گنبد کا بنوانے والا اپنے گناہوں کا معترف اور خدا کی رحمت کا امیدوار قائدبے ہے۔

سنہ ۱۲۳۳ھ میں سلطان محمود خاں[۱] بن سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں اس قبہ میں

---

[۱] سلطان محمود خاں کا عہدِ سلطنت سنہ ۱۲۲۳ھ سے سنہ ۱۲۵۵ھ تک رہا ان کے زمانہ کا سب سے بڑا واقعہ جنگِ وہابیہ ہے۔

پھر دراڑیں پڑ گئیں تو حصۂ بلند کو منہدم کر کے پھر بنوایا۔ اور اس امر کا لحاظ رکھا کہ انہدام کے وقت کوئی چیز قبۂ صغیرہ پر یا حجرے میں یا مسجد میں گرنے نہ پائے۔ اس کام میں حصول برکت کے خیال سے اکثر مدینے والے اور اُن کے بال بچے شریک ہوئے۔ بعد ختم تعمیر بالعالی سے شہر والوں کو کے لیے جو اس کام میں شریک تھے نذر کے لیے رقمیں آئیں اور فی کس ڈھائی ڈھائی سو قرش (تخمیناً پندرہ پندرہ روپیے) دیے گئے۔

(نزہتہ الناظرین صفحہ ۱۱)

مشہور و معروف فرنگی سیاح حجاز برکھارٹ ۱۲۳۲ھ ہجری میں مدینہ منورہ گیا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک حجاز اہلِ نجد کے ہاتھ سے نکل کر دوبارہ ترکوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اس قبے کے بارے میں اُس نے وہابیوں کے طرزِ عمل کی نسبت ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

۱۲۱۹ء میں وہابیوں نے اِس قبّے کے کلس سے چونکہ مقبرہ اور انسان فانی کی قبروں پر گنبدوں کے ڈھا دینے والی عادت پر عمل کر کے اس قبے کو بھی منہدم کرنے کی کوشش کی تھی اور کلس و ہلال کو توڑ ڈالا تھا۔ لیکن اِس گنبد کی مضبوط ساخت اور اُس سیسے کے پتروں نے جو اس پر چڑھے ہوئے تھے اس کام کو مشکل بنا دیا اور گنبد کی چکنی سطح سے بھی دو کاریگر اوندھے مُنہ نیچے گرے اس وجہ سے انہدام کا کام موقوف ہو گیا۔ یہ واقعہ ایک معجزے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے جو پیغمبر صاحب نے اپنی یادگار قائم رکھنے کے لیے ظاہر فرمایا۔

(انگریزی سفرنامہ برکھارٹ جلد دُوم)

مذکورۂ بالا واقعہ محض ایک سُنی ہوئی کہانی ہے جو برکھارٹ کو مدینے میں معلوم ہوئی ورنہ اگر یہ سچا واقعہ ہوتا تو سید جعفر برزنجی جو وہابیوں کے سخت دشمن[۱] ہیں۔ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے مگر وہ

۱۔ سید جعفر برزنجی نے اپنی کتاب میں وہابیوں کا ذکر ایک خاص لہجے میں کیا ہے۔ وہابیوں کی پہلی فتوحات کے وقت سید صاحب کے والد مدینے سے عراق بھاگنے پر مجبور ہوئے تھے۔ اس وجہ سے بھی سید صاحب کو وہابیوں سے ایک قسم کی نفرت ہے۔

مگر وہ اس موقعے پر صرف اس قدر لکھ کر خاموش ہو گئے ہیں کہ :-

"وہابیوں نے گنبد خضرا کے انہدام کرنے اور اس کے کلس کو سونے کا سمجھ کر لے لینے کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا اور وہ اس پر قابو نہ پا سکے۔"

(نزہتہ الناظرین صے ۶۲)

غرضکہ موجودہ بڑا قبہ سلطان قایدبے کا بنوایا ہوا اس وقت تک قایم ہے۔ اہل نجد کے حالیہ قبضۂ حجاز کے بعد ہندوستان کے بعض مسلمانوں کو یہ گمان ہوا تھا کہ وہابی شاید گنبد خضرا کے ساتھ بھی اسی قسم کا عمل کریں گے جو انھوں نے دوسرے مزاروں کے قبوں کے ساتھ کیا ہے اسی بنا پر میں نے ۱۳۴۵ھ میں بعض سربرآوردہ اہل علم نجدیوں سے دریافت کیا تھا۔ کہ ہندوستان میں یہ مشہور ہو رہا ہے کہ آپ لوگ گنبد خضرا پر بھی اسی طرح دست درازی کرنے والے ہیں جیسی کہ اُن کے مورث اعلیٰ امیر سعود بن عبدالعزیز نے کی تھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ نہ ایسا سعود نے کیا تھا اور نہ معاذ اللہ ہمارا ایسا ارادہ ہے۔ میں نے کہا ایک فرنگی سیاح برکھارٹ نے ایسا لکھا ہے اور بہت سے مسلمانوں کا بھی یہی خیال ہے۔ انھوں نے کہا عام مسلمان اور عیسائی دونوں ہمارے دشمن ہیں۔

اب میں اپنا سلسلۂ بیان پھر شروع کرتا ہوں۔ اس بڑے قبے میں جانب جنوب ایک کھڑکی ہے جس پر جالی کا دروازہ چڑھا ہوا ہے۔ اس میں سے پانی اندر نہیں جا سکتا۔ لیکن روشنی و ہوا پہنچ سکتی ہے۔ یہ کھڑکی کوئی پون گز لمبی اور آدھ گز سے زاید چوڑی ہوگی۔ ضرورت کے وقت اس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہو سکتا ہے۔ اس کھڑکی کے محاذی قبۂ صغیرہ میں بھی ایک دریچہ ہے اس میں بھی جالی کا دروازہ ہے۔ اس طرح کی کھڑکی حجرۂ شریف کی چھت یا گنبد میں ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔

سمہودی کہتے ہیں کہ حضرت عایشہؓ کے زمانہ میں ایک سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑ رہا تھا۔ اہل مدینہ اکٹھے ہو کر حضرت عایشہؓ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ حجرۂ شریف کا دروازہ کھول دیجیے تاکہ ہم بواسطہ حضرت رحمۃ للعالمین اللہ تعالےٰ سے دعائے باران رحمت کریں۔ حضرت عایشہؓ نے حجرے کا دروازہ کھول دیا۔ اور تشنہ کاموں نے دعا کی۔ خدا کی قدرت سے

ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل بھر گئے اور اس کثرت سے زراعت ہوئی کہ مویشی اناپ شناپ بھوکے ہوگئے اس کے بعد سے رہنے والوں کا یہ طریقہ ہوگیا کہ جب کبھی قحط کے آثار نمودار ہوتے یا کوئی اور سخت مہم درپیش ہوتی تو وہ حجرے کی چھت کی کھڑکی کھول کر دعا کیا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک یہ طریقہ جاری رہا مگر نویں صدی یعنی سمہودی کے زمانہ میں موقوف ہوگیا تھا۔ اس وقت بجائے چھت کی کھڑکی کے حجرہ شریف کی جالی کا ایک دروازہ جو جانب قبلہ ہے اور جسے باب التوبہ کہتے ہیں کھول کر دعائے استسقا کیا کرتے تھے۔ یہ طریقہ بھی چودھویں صدی تک جاری رہا۔ موجودہ عہد میں ایسی کوئی مصیبت نہیں آئی کہ یا ب تو بہ وا ہوتا اور خدا ایسا موقع کبھی نہ لائے۔

قبہ خضرا جس کا یہ نام ہمارے زمانہ میں اس کے سبز رنگ کی وجہ سے رکھا گیا ہے ہمیشہ سے سبز نہیں ہے۔ پہلا گنبد جو ۶۷۸ھ میں تعمیر ہوا تھا اس کا رنگ سفید تھا اس وقت اس کو قبہ بیضا کہا کرتے تھے۔ ۸۸۶ھ کی آگ میں جب وہ جل گیا تو دوسرا تعمیر ہوا۔ اس کا رنگ نیلا تھا اور اس وجہ سے اس کو قبہ زرقا کہتے تھے۔ ۱۰۰۱ھ میں جب شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے جذب القلوب تالیف کی اس وقت اس کا رنگ سبز تھا پھر نیلا کیا گیا جو غالباً تیرھویں صدی کے وسط تک رہا۔ چنانچہ جعفر برزنجی کہتے ہیں کہ سلطان محمود خاں کے زمانہ میں ۱۲۵۳ھ میں اس کو ہرا رنگا گیا اور اس کے بعد سے اب تک مسلسل اس کا رنگ سبز چلا آرہا ہے۔ ۱۲۸۹ھ میں جب رنگ مدھم پڑ گیا تو سلطان عبد العزیز خاں کے حکم سے پھر سبز رنگ پھیرا گیا۔ مدینے والوں سے مجھے معلوم ہوا کہ موجودہ رنگ اب سے پچیس سال قبل ۱۳۲۰ھ میں ہوا تھا۔ میں نے ۱۳۴۵ھ میں دیکھا کہ یہ رنگ اب بالکل دھیما پڑ گیا ہے اس میں کسی قسم کی تازگی و شگفتگی باقی نہیں رہی ہے۔ توتیے کے پرکا سا رنگ ہے جس میں چمک نہیں اور بجائے روغنی رنگ کے محض آبی رنگ معلوم ہوتا ہے اس کا سنہری کلس بھی اس قابل ہوگیا ہے کہ اس پر بھی جلا کردی جائے۔ یہ صرف اس لیے عرض کرتا ہوں کہ دنیا داروں اور ظاہر بین اصحاب کی آنکھوں میں بھلا معلوم ہو۔ ورنہ یہ ہلال اور یہ کلس اس قسم کی چمک جھلک اور ملمع کاری سے مبرا ہے

۵۱۔ اس کی تفصیل کیفیت جالی کے ذکر میں ملاحظہ ہو۔

اس کی چمک پیتل پنی کی سی چمک نہیں ہے۔ یہ اُن تجلیات کا مطلع ہے جن سے زمین و آسمان منور ہو رہے ہیں۔ میں نے سچ کہا ہے اور خوب کہا ہے۔

ندی چڑھاؤ پر ہے شراب طہور کی — مے نوش لا رہے ہیں خبر دور دور کی
کیا دیکھے کوئی روشنی اب شمع طور کی — جھڑیاں لگی ہوئی ہیں مدینے میں نور کی

چھٹکی ہلالِ گنبدِ خضرا کی چاندنی
پھیکی پڑے نہ کیوں یدِ بیضا کی چاندنی[۱]

سید سمہودی نے اس قبے کی بلندی تحریر نہیں کی اور جعفر برزنجی بھی ساکت ہیں۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حجرۂ شریف کی چھت یعنی قبۂ صغیرہ سے کوئی دو گز اونچی مسجد نبوی کی چھت ہے اس سے کوئی بارہ گز اونچا یہ قبہ ہے۔ قبۂ صغیرہ کی اونچائی سید سمہودی نے (۱۸) ہاتھ یعنی کوئی نو گز تحریر کی ہے اس حساب سے اور میرے حساب سے گنبد خضرا کی بلندی زمین سے تیئیس چوبیس گز ہے۔ اس پر جست یا سیسے کے پتر سے منڈھے ہوئے ہیں جن کی شکنیں اور جوڑ ہر طرف سے بخوبی نظر آتے ہیں۔ اور قبۂ خضرا مدینے کے مختلف محلوں سے اور بعض مقامات پر کئی کئی کوس سے دکھائی دیتا ہے۔ جب حاجیوں کا قافلہ منزل بیر علی پر پہنچتا ہے جو مدینے سے دو ڈھائی کوس ہے۔ تو یہ سبز گنبد مشتاقانِ جمالِ احمدی کے زخمِ فرقت ہرے کر دیتا ہے اس کو دیکھ کر شیفتگانِ دیدارِ محمدی کی آتش شوق بھڑک اٹھتی ہے۔ یہی وہ موقع ہے جس کی تصویر اس گنہگار نے ان اشعار میں کھینچی ہے۔

قافلے والو اٹھو وقتِ سحر ہونے لگا — اب ہوائے باغ یثرب کا اثر ہونے لگا
اب یہ وقت آیا کہ اونٹوں پر رہو اب نا حرام — حاجیو! اُترو کہ روضہ جلوہ گر ہونے لگا

(۱۸) مزار اقدس کی جالی

قبل اس کے کہ ہم اُس بیرونی سبز جالی کا ذکر کریں جو حجرۂ شریف کے گرد نصب ہے اور

[۱] یہ اس فقیر کی نظم مدینے کی چاندنی کا پہلا بند ہے۔

جس کی زیارت سے ہر زائر مشرف ہو سکتا ہے۔ ہم اُس اندرونی جالی کا مختصراً بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ جو حجرہُ شریف کی دیواروں سے ملحق استادہ ہے۔ جس پر غلاف پڑا رہتا ہے اور جو زائروں کو مطلق نظر نہیں آتی۔ سید جعفر برزنجی کو شعبان ۱۲۹۶ھ میں اس کی زیارت کا موقع مل گیا تھا وہ فرماتے ہیں :۔

"حجرہُ شریف کی دیوار کے گرد لکڑی کی رنگی ہوئی جالی کا کٹہرا ہے جو شمالی جانب زاویہ دار ہے۔ اس جالی پر سب طرف غلاف پڑا ہے لیکن شمالی جانب غلاف نہیں ہے۔"

۱۳۴۵ھ میں محمد سرور آفندی شیخ الحرم اور آغا عبد اللطیف خادم حجرہُ شریف نے مجھ سے فرمایا کہ

"یہ جالی کھجور کی لکڑیوں کی ہے۔ اس پر کسی قسم کا رنگ نہیں ہے۔ چونکہ حجرے کی دیواروں پر عطر ملا جاتا ہے۔ اس لیئے غلاف کی حفاظت کے واسطے یہ جالی کھڑی کر دی گئی ہے ورنہ اگر غلاف دیواروں سے بالکل ملا ہوتا تو اس پر عطر کے دھبے پڑ جاتے۔"

مجھے یہ پتہ نہ لگ سکا کہ یہ جالی کب لگائی گئی تھی۔ ممکن ہے کہ جعفر برزنجی کے زمانے میں بھی یہی ہو اور ایک جھپک دیکھنے میں اُن کو یہ رنگین نظر آئی ہو۔

اب بیرونی جالی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حجرہُ شریف کے گرد سب سے پہلے جمال الدین[1] اصفہانی وزیر سلطان نور الدین زنگی نے

---

[1]۔ ابو جعفر محمد بن علی جمال الدین موصلی جو اپنی فیاضی و سخاوت کی وجہ سے جواد کے لقب سے مشہور ہے عماد الدین زنگی و نور الدین محمود خاندان اتابک کے سلاطین شام کا وزیر تھا۔ اس کے آثار کریمہ مکہ و مدینہ میں بکثرت تھے۔ اس نے شام و عراق و حجاز کے راستوں کو درست کیا۔ جا بجا پانی کے چشمے نکالے۔ کنویں کھُدوائے مسافر خانے اور سرائیں بنوائیں ان کی حفاظت و اخراجات کے لئے اوقاف مقرر کیے۔ مکہ معظمہ میں رباط و حمام تعمیر کرایا۔ مدینے کی فصیل بنوائی۔ عرفات میں نہر کی درستی کرائی۔ قبیلہ بنی شعبہ جو پانی روک دیا کرتا تھا اُس کا وظیفہ مقرر کیا کہ حاجیوں کو پانی سے محروم نہ کرے۔ حرم بیت اللہ کے دروازے کی (بقیہ مضمون بر حاشیہ صفحہ)

۵۸۵ھ میں صندل و آبنوس کی ایک جالی بنوائی تھی جس کی بلندی حجرے کی دیواروں تک تھی۔ سید سمہودی کہتے ہیں کہ اس جالی کا ذکر سوائے ابن نجار کے متقدمین میں سے اور کسی نے نہیں کیا۔ (خلاصۃ الوفا صـ۱۳۹)

مورخین مدینہ اگرچہ اس امر کی صراحت سے ساکت ہیں کہ آیا یہ جالی ۶۵۴ھ کی پہلی آتشزدگی میں محفوظ رہی تھی یا جل گئی تھی مگر مولوی صبغۃ اللہ صاحب مؤلف کتاب السکینہ بالبلد مدینہ اس کا وجود اب تک حجرۂ شریف میں ظاہر کرتے ہیں۔ جو نقشہ حجرۂ شریف کا انھوں نے کھینچا ہے اس میں یہ جالی بھی دکھائی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ۶۵۴ھ کی آگ نے حجرے کے آس پاس کی تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور خود حجرے کی چھت بھی جل کر گر پڑی تھی اس آگ سے اس جالی کا بچنا مشکل تھا۔ اس کے بعد دوسری آتشزدگی میں بھی حجرۂ شریف کے گرد اس کا وجود نہ تھا۔ اُس وقت سلطان الظاہر[1] رکن الدین بیبرس سلطان مصر و حجاز کی بنوائی ہوئی لکڑی کی جالی موجود تھی جو اُس نے ۶۶۸ھ میں بھجوائی تھی اور غالباً اس کی ضرورت جمال الدین کی جالی آگ میں ضایع ہو جانے ہی کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ یہ جالی بھی

(بقیہ حاشیہ صـ۹۹) ترمیم کرائی۔ خانہ کعبہ کا نیا دروازہ بنوا کر اُس کے کواڑوں پر چاندی منڈھی اور سونے کا کام کیا۔ اُس کی چوکھٹ پر طلائے خالص کی ایک تختی لگائی۔ پرانے دروازے کا اپنے لیے تابوت بنوایا اور مرتے وقت وصیت کی کہ اس تابوت میں اسکو رکھکر حج کے وقت عرفات لیجائیں۔ اور وہاں تابوت کا ڈھکنا کھول دیں کہ اس شخص نے زندگی میں حج نہیں کیا تھا اب مرنے کے بعد حج ادا کر رہا ہے۔ چنانچہ مرنے کے بعد اس کا تابوت عرفات لے گئے۔ تمام مناسک حج ادا کرائے اور طوافِ وداع کے بعد اسے مدینہ منورہ پہنچایا۔ چونکہ یہ وہاں والوں کے لیے ہر سال کپڑے اور روپیہ بھیجا کرتا تھا اس لیے اہلِ مدینہ نے اس کا تابوت سروں پر اٹھایا۔ اس کے بعد روضۂ مبارک کے متصل بابِ جبریل کے سامنے اس کا مقبرہ تعمیر ہوا اور اس کے مزار و روضۂ اقدس کے درمیان مسجد کی دیوار میں لوہے کا ایک جنگلہ لگا یا جس میں سے وہ روضۂ مبارک کے سامنے سے دکھائی دیتا ہے اور اس کے ذریعہ سے بوئے فردوس اُس کے مشامِ جاں کو معطر کرتی رہتی ہے۔ یہ قبر رباط عجم میں ہے جو اسی کا بنوایا ہوا رباط ہے۔ پیشتر جو ایک چوبی کٹہرا اُس کی قبر کے گرد تھا اب وہ نہ رہا۔ معمولی کچی قبر ہے۔

[1] یہ بادشاہ ۶۵۸ھ سے ۶۷۶ھ تک سلطان مصر و حجاز رہا۔ سلاطین مملوکیہ مصر کا چوتھا بادشاہ تھا۔

دوسری آگ میں جل گئی ایسی صورت میں یہ قیاس نہیں ہوسکتا کہ جمال الدین کی جالی دونوں آتش زدگیوں میں محفوظ رہکر اب تک موجود ہو۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب کو شاید سید جعفر برزنجی کے بیان سے غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ۱۲۹۶ھ میں سید صاحب موصوف نے جو رنگین چوبی جالی حجرۂ شریف کے اندر دیکھی تھی جس کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں اس کو مولوی صاحب نے جمال الدین کی جالی تصور کر لیا۔ دوسری جالی جو حجرۂ شریف کے چاروں طرف استادہ کی گئی وہ سلطان الظاہر رکن الدین بیبرس نے بنوائی تھی۔ یہ سلطان ۶۶۷ھ میں حج و زیارات کو آیا تھا۔ اس نے حجرۂ شریف اور جناب سیدہ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کے بیت الشرف کے گرد جہاں قبر اطہر بنی ہوئی ہے۔ لکڑی کی جالی بنانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے اور رسیوں سے حجرے کے اطراف کی پیمائش کی اور مصر پہنچکر جالی تیار کرائی۔ جو ۶۶۸ھ میں مدینہ منورہ بھیجی گئی اور حجرے کے گرد لگائی گئی۔ اس کے تین دروازے تھے۔ ایک جانب قبلہ (جنوب) دوسرا مشرق میں تیسرا جانب غرب۔ جالی کی بلندی ایک قدآدم تھی۔ ۶۹۴ھ میں الملک العادل زین[۱] الدین کتبغا سلطان مصر نے اس کو اونچا کر کے مسجد کی چھت تک پہنچا دیا اور اب اس کی اونچائی کوئی چھ گز ہوگئی۔

۷۲۹ھ میں سلطان[۲] الناصر نے جب محراب تہجد[۳] بنوائی تو اس جالی میں بھی جو تھا دروازہ جانب شمال مسجد کے صحن کی طرف اور زیادہ کر دیا۔

سمہودی فرماتے ہیں کہ اُس زمانے میں اس جالی سے متصل جانب مغرب جالی کا ایک اور بڑا مقصورہ تھا جس پر دھوپ سے بچاؤ کے لئے ڈھالیہ بھی پڑا تھا۔ اس میں شیعہ[۴] نماز باجماعت

---

[۱] اس کا عہد سلطنت ۶۹۴ھ سے ۶۹۶ھ تک ہے۔

[۲] یہ بادشاہ ۶۹۶ھ سے ۷۴۶ھ تک تین مرتبہ معزول ہوا اور پھر بادشاہ ہوا۔ مصر و حجاز پر اس کی حکومت تھی۔

[۳] حضرت فاطمہ زہراؑ کے مزار کے پیچھے جانب شمال مسجد نبوی میں ایک محراب ہے اسے محراب تہجد کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ آنحضرت اس جگہ نماز تہجد پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے جالی کے نقشے میں اس محراب کو بھی دکھایا ہے۔

[۴] مدینہ منورہ ایک زمانہ میں شیعوں کا مخزن رہا ہے۔ ۳۶۷ھ میں وہاں بجائے (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۰۲)

علیحدہ پڑھا کرتے تھے۔ اِسی مقصورہ کے دروازے پر اِن کی اذاں بھی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۰۱)

خلفائے عباسیہ بغداد کے خلفائے اسماعیلیہ مصر کا جو شیعہ مذہب رکھتے تھے خطبہ پڑھا جانے لگا تھا۔ امرائے مدینہ بھی قبیلۂ بنی حسن و قبیلۂ بنی حسین سے جو زیادہ تر شیعہ اسماعیلیہ و زیدیہ تھے۔ انتخاب کیے جاتے تھے۔ حکومت خلفا مصر کی تھی مگر مدینے کا گورنر انھیں دو قبیلوں سے منتخب ہوا کرتا تھا۔ ۵۶۶ھ میں جب اسماعیلی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تب بھی ایوبی و چراکسی سلاطین مصر انھیں شیعہ قبائل میں سے امیر مدینہ مقرر کرتے رہے۔ عموماً یہ خدمت موروثی ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بقول ابن خلدون ۷۵۱ھ ہجری تک اور بقول قلقشندی ۸۱۴ھ تک مدینے کے امیر اور روضے کے متولی و مجاور شیعہ تھے (تاریخ ابن خلدون کتاب ثانی جلد دہم۔ صبح الاعشیٰ قلقشندی عربی مطبوعہ مصر جلد (۴) ص ۲۹۹)

سید سمہودی و سید جعفر برزنجی مورخین مدینہ لکھتے ہیں کہ ابتدا میں مسجد نبوی میں منبر شریف کی خطبہ خوانی شیعوں میں تھی پھر کچھ عرصہ تک اہل سنت خطیب مقرر ہوتے رہے۔ ۶۸۲ھ میں خطابت پھر شیعوں میں منتقل ہوگئی۔ اس کے کچھ دن بعد ملک منصور قلاؤن صالحی بادشاہ مصر (۶۷۸ھ تا ۶۸۹ھ) سال میں دو دفعہ چھ چھ مہینے کے لئے سنی امام و خطیب مقرر کرکے بھیجنے لگا۔ چونکہ اس زمانہ میں سادات امامیہ کا مدینے میں بڑا زور تھا اس لیے چھ مہینے بھی یہ لوگ بڑی مصیبت سے گزارتے تھے۔ آخر میں دونوں فریق میں سابقہ قرابت ہوجانے سے کشاکش باقی نہ رہی۔ (نزہۃ الناظرین عربی مطبوعہ مصر ص ۹۹و۹۸)

قبیلہ بنی حسن و بنی حسین کی باقیات اب بھی مدینہ میں موجود ہے اور ان میں سے بعض تمول و دیگر اعتبار سے ذی وجاہت ہیں۔ یہ لوگ اصل میں اسماعیلی و زیدی تھے۔ مگر صدیوں سے تقیہ کی آڑ میں بسر کرتے چلے آئے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں مگر وہ اپنا ظاہری طرز عمل اہل سنت کا رکھتے ہیں۔ بعض ان میں کے امتداد زمانہ کی وجہ سے سُنّی بھی ہوگئے ہیں اور بعض اسماعیلی و زیدی مذہب کے پیچ در پیچ طریقوں سے نکل کر امامیہ رستے پر آگئے ہیں اور اپنے تئیں اثنا عشری شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے قرب وجوار کے دیہات میں ایک قوم نواخلہ آباد ہے۔ ان کو بعض لوگ یزید پلید کے اُن ساتھیوں کی اولاد بتاتے ہیں۔ جنھوں نے بعد واقعہ کربلا مدینۂ منورہ میں ایک قیامت برپا کی تھی۔ اس نوج میں سے جو لوگ یہاں رہ پڑے یہ ان کی نسل سے ہیں۔ ممکن ہے یہ روایت اُن کے دشمنوں کی بنائی ہوئی ہو۔ (بقیہ مضمون بر حاشیہ ص ۱۰۳)

حیی علی خیر العمل کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ دوسرے اوقات میں شیعہ علماء یہاں درس و تدریس کیا کرتے تھے۔ یہ حالت تقریباً نویں صدی کے وسط تک رہی اس کے بعد یہ تفرقہ اٹھادی گئی۔

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفٰے عربی مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۴۳۸ و صفحہ ۴۳۹)

۸۸۶ھ کی آگ میں جب سلطان بیبرس کی جالی جل گئی تو سلطان قاید بے نے مسجد کی تعمیر و ترمیم کے ساتھ حجرے کے اطراف کے واسطے تانبے اور لوہے کی ڈھلی ہوئی جالیاں تیار کرائیں۔ جو ۸۸۸ھ میں محمل مصری کے ساتھ ستر اونٹوں پر مدینے پہنچیں۔ ان کا وزن (۶۰۰) قنطار یعنی چھ سو من تھا۔

(تاریخ ابن ایاس عربی مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۲۲۰ و صفحہ ۲۳۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲)

بعض ان کو بنی حسن و بنی حسین کہتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے کو انہیں قبائل سے بتاتے ہیں۔ ان کی تعداد چھ سات ہزار ہے۔ زمانہ دراز سے ان کی حالت نہایت پست ہے۔ یہ لوگ عموماً زراعت کرتے ہیں۔ بعض قصائی کا پیشہ کرتے ہیں۔ ان کو ہندوستان کا کاچھی مالی سمجھنا چاہیئے۔ چونکہ یہ نخلستان کا کام کرتے ہیں اس لیے ان کو نواخلہ کہتے ہیں۔ خود مدینۂ منورہ میں بھی محلہ نخلہ۔ محلہ جعفر طیار اور باب رحمت کے قریب کئی گھرانے شیعوں کے آباد ہیں یہ کھلے ہوئے شیعہ ہیں اور ہندوستانی و ایرانی شیعوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ سب حکومت نجد کی طرف سے اجازت یافتہ معلم ہیں۔ ان کے علاوہ بعض سُنّی بھی فرمائش کرنے پر شیعہ طریق سے زیارت وغیرہ پڑھادیتے ہیں۔

مکہ معظمہ کی فضا میں بھی کوئی دو سو برس تک شیعوں کی اذان گونجتی رہی ہے اور اہل سنت کے مصلوں[۱] کے ساتھ فرقہ زیدیہ کا مصلےٰ بھی قائم رہ چکا ہے اس زمانہ میں بھی مکہ معظمہ کے محلہ قرارہ میں شیعوں کی ایک تعداد آباد ہے جو آزادی کے ساتھ اپنے فرائض مذہبی ادا کرتی ہے۔

[۱] شیعہ اپنی اذان میں حیّ علی الفلاح کے بعد حیّ علی خیر العمل بھی کہتے ہیں جس کے معنی ہیں۔ دوڑو بہترین عمل کی طرف۔

تانبے کی جالی قبلہ کی طرف لگائی گئی۔ باقی تین سمت میں لوہے کی جالیاں نصب کی گئیں۔ اِس جالی میں قبلہ کی جانب پہلے ایک لکڑی کا دروازہ لگایا پھر اس کو بھی تانبے کی جالی کا کر دیا۔ باقی دروازے لوہے کی جالی کے تھے۔ نیز حضرت فاطمہؓ کے مکان کے گرد جہاں قبر شریف بنی ہوئی ہے لوہے کی جالی لگائی جس سے یہاں بھی جالی کا ایک جداگانہ حصار ہو گیا۔ حجرہ شریف اور اس حصار کے بیچ کی جالی میں دو دروازے رکھے جن میں سے حجرہ شریف کی گیلری میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس جالی کے جملہ چھ دروازے تھے جو اس وقت تک موجود ہیں۔ جانب قبلہ جو دروازہ ہے اِسے بابِ[۱] التوبہ کہتے ہیں۔ غرب میں باب[۲] الوفود ہے جو باب عائشہ بھی کہلاتا ہے۔ مشرق میں باب[۳] فاطمہ۔ شمال میں باب تہجد۔ باقی دو دروازے بھی اسی طرف ہیں۔ ایک مثلث حجرے کے دائیں طرف ایک بائیں طرف۔ توضیحاً نقشہ ذیل ملاحظہ ہو۔ جو صفحہ (۱۰۵) پر دیا گیا ہے۔

[۱]۔ اہل مدینہ کی سالہا سال سے یہ عادت ہے کہ قحط و مصیبت کے وقت اس دروازے کو کھول کر توبہ و استغفار کرتے ہیں اور حضرت رحمۃ للعالمین کا واسطہ دیکر دعا کرتے ہیں۔

[۲]۔ قبائل عرب کے وفد جب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو حضور سرورِ عالم اس مقام پر تشریف فرما ہو کر اُن سے گفت و شنید فرمایا کرتے تھے چونکہ حجرہ مزار اقدس حضرت عائشہؓ کا سکونتی مکان تھا اور اس وقت بھی مسجد نبوی میں آنحضرتؐ کے تشریف لانے کے لیے یہ دروازہ موجود تھا اس لیے حضرت عائشہؓ کے مکان کی مناسبت سے اس دروازے کو باب عائشہؓ بھی کہتے تھے۔ جب جالی تیار ہوئی اور اس میں بھی اس جگہ دروازہ رکھا گیا تو اس کا یہ نام بھی قائم رہا۔

[۳] حضرت فاطمہؓ کا مکان و مزار اس طرف ہے اُس کی مناسبت سے اس دروازے کو بابِ فاطمہؓ کہتے ہیں۔

سلطان قایتبے نے اس جالی کے ساتھ تانبے کے تاروں کی جالیاں بھی بھجوائی تھیں جو حجرۂ شریف کے اوپر کے حصے میں نصب کی گئیں یعنی مسجد کی چھت کے قریب حجرۂ شریف و مخمس احاطے کی دیواروں کے بیچ میں جو جگہ سیری کے طور پر چھوٹی ہوئی ہے اور جس پر کوئی چھت نہیں ہے اس کو اس جالی سے ڈھک دیا تاکہ کبوتر وہاں نہ جا سکیں[1]۔

(خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفٰے صفحہ ۱۴۶ و ۱۴۷)

سلطان قایتبے کی لوہے کی ڈھلی ہوئی جالی جو مشرق و مغرب و شمال میں نصب کی گئی تھی وہ اب تک موجود ہے۔ البتہ جانب جنوب جو تانبے کی جالی سلطان موصوف نے لگائی تھی اس کے بارے میں سید جعفر برزنجی کی مندرجۂ ذیل روایت نے شبہ ڈال دیا ہے۔ اس وجہ سے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جنوب میں جو جالی اس وقت موجود ہے وہ قایتبے کی ہے یا کوئی دوسری سید برزنجی فرماتے ہیں:۔

"شیخ مرعی کہتے ہیں کہ سلطان احمد خاں بن محمد خاں نے حجرۂ شریف کے لیے طلائی نقش و نگار کی جالیاں بھجوائی تھیں جو مواجہ شریفہ میں[2] نصب کی گئی تھیں ان کو سعود وہابی نے لوٹ لیا" (نزہۃ الناظرین ص ۷۵)

روایت مذکورۂ بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قایتبے کے بعد سلطان احمد خاں بن سلطان محمد خاں نے جس کا عہد حکومت ۱۰۱۲ھ سے ۱۰۲۶ھ تک ہے، مواجہ شریفہ کی طرف یعنی حجرۂ مبارک کے جانب جنوب نصب کرنے کے لیے کوئی سنہری جالی بھجوائی تھی۔ چونکہ اس روایت کے آخری جزو کی کوئی اہلیت نہیں ہے اس لیے اصل روایت بھی ضعیف معلوم ہوتی ہے جیسا کہ آئندہ ثابت کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ سلطان قایتبے کی جالی کے بعد کوئی اور جالی مواجہ شریفہ کے لیے نہیں آئی اور اس وقت جو سنہری جالی نصب ہے وہ غالباً سلطان ممدوح ہی کی جالی ہے۔ اگلے عربی مورخ پیتل کے لیے بھی لفظ "نحاس" جس کے معنی تانبے کے ہیں استعمال کرتے تھے اور کبھی کبھی جب زیادہ صراحت مقصود ہوتی تھی تو تانبے کے لیے "نحاس"

---

[1] آجکل اس جالی کے اوپر غلاف پڑا رہتا ہے۔ [2] مواجہ کے معنی سرہانے کے ہیں۔ یہاں آنحضرت کے سرہانے سے مراد ہے۔ مواجہ شریفہ کے تفصیلی حالات زیر عنوان "علامت مواجہ شریفہ" تحریر کیے گئے ہیں۔

اور پیتل کے واسطے "نحاس اصفر" (زرد تانبا) لکھتے تھے۔ اس وجہ سے کیا عجب ہے کہ سید سمہودی وغیرہ نے سلطان قایتبائی کی قبلہ رُخ جالی کو جو تانبے کا لکھا ہے وہ یہی پیتل کی جالی ہو جو اس وقت تک موجود ہے۔ اگر بالفرض وہ تانبے کی تھی اور یہ پیتل کی جالی کوئی اور ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سلطان قایتبائی کی تانبے کی جالی کہاں گئی۔ میں نے جہاں تک دریافت کیا شیخ الحرم و خدام حجرۂ شریف نے سامان حجرہ کے ذخیرے میں کسی جالی کی نشاندہی نہیں کی۔ اب ہم شیخ مرعی بن یوسف الحنبلی کی روایت کی تنقید کرتے ہیں

سلطان سعود ابن عبد العزیز امیر نجد نے ۱۲۱۹ھ میں مدینہ منورہ پر تسلط حاصل کر کے حجرۂ شریف کے سامان جواہرات و زیورات و ظروف طلائی وغیرہ پر قبضہ کیا تھا۔ مورخین نے اس قبضے کو لوٹ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی بقدر ضرورت تفصیل حجرہ شریف کے تحائف و ہدایا کے ضمن میں کیجائے گی۔ شیخ مرعی کی روایت ہم کو غلط معلوم ہوتی ہے۔ یہ عام مسلمانوں کو وہابیوں کی طرف سے بدگمان کرنے اور نفرت دلانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ سید جعفر برزنجی کے والد وہابیوں کی فتح مدینہ کے وقت موجود تھے اور یہاں سے بھاگ کر عراق پہنچے تھے وہابیوں کی فتح یا لوٹ کے واقعات معلوم کرنے کا ذریعہ سید صاحب موصوف کو بالراست حاصل تھا۔ انھوں نے سلطان سعود کی لوٹ میں جن جن چیزوں کو گنایا ہے اس میں اس جالی کا ذکر نہیں کیا۔ الجبرتی کی تاریخ "المتغالین فی الدین" میں اہل نجد کے مال غنیمت کی فہرست موجود ہے اس میں بھی یہ جالی شامل نہیں ہے۔ خدیو عباس حلمی پاشا[1] کی رحلۃ الحجازیہ میں فتنۂ وہابیہ کے عنوان سے ایک باب ہے اور چونکہ یہ محمد علی پاشا والی مصر کی اولاد میں ہیں جس نے وہابیوں سے ملک حجاز واپس لیا تھا اس لیے انھوں نے وہابیوں کے ظلم و زیادتی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ مگر اس جالی کی لوٹ کا پتہ اس سفرنامے سے بھی نہیں چلتا یورپ کا مشہور سیاح برکھارٹ جو وہابیوں کے تخلیۂ مدینہ کے دو ہی برس بعد وہاں گیا تھا۔ اس نے نجدیوں کی لوٹ کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے سفرنامے اور اپنی تاریخ وہابیہ میں کیا ہے (جس کی توضیح اس ہیچمدان نے

---

[1] ۔ خدیو عباس حلمی پاشا نے ۱۳۲۱ھ میں سفر حجاز کیا تھا۔ ان کا سفرنامہ علامہ محمد البتنونی ان کے ایک ہمراہی نے مرتب کیا ہے۔

حجرہ شریف کے مال و جواہرات کے ضمن میں کی ہے) وہ بھی یہ نہیں کہتا کہ وہابی حجرہ شریف کی سنہری جالی لوٹ لے گئے۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب مؤلف کتاب السکینہ جو سید جعفر برزنجی کے متبع ہیں اور ان کی کتاب کا ماخذ بھی جعفر برزنجی کی تاریخ نزہۃ الناظرین ہے وہ بھی اِس روایت کی تردید اس طرح کرتے ہیں۔

"راقم سطور نے اپنی آنکھوں سے جو مشاہدہ کیا تو جالی مواجہ شریفہ کو جو باب التوبہ پر ہے، سونے چاندی سے منقش پایا۔ معلوم نہیں کس کی قائم کردہ ہے۔ سلطان احمد خاں کی روانہ کی ہوئی سنہری روپہلی جالی اگر سعود وہابی لوٹ لے گیا تو پھر موجودہ جالی کیسی اور کہاں سے آئی"

(السکینہ ص۱۲۴)

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو سلطان احمد خاں نے کوئی جالی بھیجی ہی نہیں اور موجودہ سنہری جالی سلطان قایتبائی ہی کی ہے اور اگر احمد خاں نے کوئی جالی بھیجی تھی تو وہ بجنسہٖ موجود ہے وہابیوں نے اُسے نہیں اوٹا۔

شعبان ۱۲۹۶ھ میں مدینہ منورہ میں ایک سخت آندھی آئی تھی جس سے شرقی جانب کی بڑی جالی گر گئی تھی اس سے لوگوں میں بڑی پریشانی پھیلی۔ اِس کی اطلاع شیخ الحرم خیر اللہ آفندی کو کی گئی وہ اپنے ساتھ علماء کی ایک جماعت کو لیکر مسجد کی چھت پر چڑھے اور پھر اس کے نصب کرنے کا انتظام کیا۔

(نزہۃ الناظرین ص۶۹)

حجرہ شریف کی جالی کے متعلق یہ آخری واقعہ تھا جو تیرھویں صدی کے آخر میں پیش آیا۔ ممکن ہے کہ اس کے قبل و بعد بھی اس میں کچھ رد و بدل ہوا ہو یا کوئی حادثہ پیش آیا ہو تاہم ساڑھے چار سو برس سے یہ جالی اب تک چلی آرہی ہے ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے بھی اس کی زیارت کی ہے۔ یہ حجرہ شریف کے گرد گیلری کے چاروں طرف نصب ہے۔ جانب قبلہ یعنی جنوب کے رخ اس جالی کا رنگ سنہری ہے جس پر جا بجا روپہلی کام ہے اور نہایت خوشنما کتبے ڈھلے ہوئے نقش و نگار اور خوبصورت بیل بوٹے جالیوں میں کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ عام لوگ

اس کو چاندی سونے کا سمجھتے ہیں مگر میری رائے ناقص میں اصل جالی اعلیٰ درجے کے پیتل کی ہے البتہ اس کے بعض نقش ونگار اور کتبے چاندی کے ہیں۔ یہ جالی چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ یعنی پیتل کے چار ستونوں کے درمیان تین بڑی جالیاں ہیں۔ ہر جالی کے دو حصے ہیں اور ہر حصہ کوئی ڈھائی گز چوڑا چھ گز اونچا ہے۔ جالی کی موٹائی آدھے انچ سے کم ہے۔ زائر جب قبلہ کی طرف پیٹھ اور اس جالی کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوتا ہے تو بیچ کی جالی میں اس کے بائیں طرف ایک فٹ مدور حلقہ نظر آتا ہے جس میں ہلال بنا ہوا ہے۔ یہ حلقہ شبکۃ النبی یعنی آنحضرت کی کھڑکی کہلاتی ہے۔ اس کو مواجہ شریفہ بھی کہتے ہیں۔ مرقد منورہ میں اس کے محاذی آنحضرت صلعم کا چہرہ مبارک بیان کیا جاتا ہے۔ زائر اسی کھڑکی کے نزدیک کھڑے ہو کر آنحضرت کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں۔ اس حلقے سے پون گز دائیں طرف ہٹ کر شبکۂ ابوبکر رضؓ ہے۔ اس سے کوئی پون گز شبکۂ عمر رضؓ ہے۔ یہ دونوں کھڑکیاں ایک ایک بالشت مدور ہیں۔ ان کے بیچ میں بھی چاند وغیرہ کے نقش ہیں۔ ان دونوں صحابہ پر اُن کے شبکوں کے قریب کھڑے ہو کر سلام و فاتحہ پڑھتے ہیں۔ جالی کے وسط میں تخمیناً پانچ فٹ اونچا۔ ڈھائی فٹ چوڑا دروازہ ہے۔ جو باب التوبہ کہلاتا ہے اسکے کواڑ بھی کٹی ہوئی جالی کے ہیں جن کے ایک پٹ پر چاندی کے کٹے ہوئے حروف میں بخط طغرا "لا الٰہ الا اللہ الملک الحق المبین" اور دوسرے پٹ پر "محمد رسول اللہ الصادق الوعد الامین" لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے متصل یہ دو شعر بھی جالی میں منقوش ہیں۔

یا خیر من دفنت فی القاع اعظمہ	فطاب من طیبہن القاع والاکم
نفسی الفداء لقبر انت ساکنہ	فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم

باب التوبہ زمانہ قحط میں یا کسی اور مصیبت کے وقت کھولا جاتا ہے اور آنحضرت کا واسطہ دے کر دعا کی جاتی ہے۔ یہ دستور کوئی پانسو برس سے چلا آرہا ہے موجودہ عہد میں یہ دروازہ کئی برس سے نہیں کھولا گیا۔ اللہ تعالیٰ ایسا موقع بھی نہ لائے [۲]

---

[۱] ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ:۔ اے بہترین خلق آپ کی ہڈیاں ایسی ہموار زمین میں دفن ہیں جن کی خوشبو سے یہ زمین معطر ہوگئی ہے۔ میری جان اس قبر پر فدا ہو جہیں آپ مقیم ہیں اور جو عفت وجود و کرم کا معدن ہے۔

[۲] اس کا ذکر علیحدہ بھی کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں حالات قبۂ شریف و گنبد خضرا۔

حجرہ شریف کی جنوبی جالی کی کیفیت میں مختصراً عرض کر چکا۔ باقی تین طرف جو جالی ہے اس کو بعض لوگ تانبے کا کہتے ہیں۔ بعض ہشت دھات کا بعض پنچ رسی کہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوہے کی ہے۔ اور اس کا لوہا اس قسم کا ہے جس کے ڈھلے ہوئے کٹہرے ہوتے ہیں۔ اس کی موٹائی کوئی ایک انچ ہے اور اگرچہ ڈھلی ہوئی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاول بھر موٹی انچ بھر چوڑی پتیوں کو موڑ موڑ کر پان کی سی شکل کی بیلیں بنا دی گئی ہیں۔ جالی کے ایک ایک ٹکڑے میں جو گز بھر چوڑا اور چھ گز اونچا ہے۔ بیل کی چار چار قطاریں اوپر کی جانب چلی گئی ہیں۔ ہر طرف جالی کے سترہ اٹھارہ ٹکڑے ملا کر برابر برابر کھڑے کر دیے ہیں۔ جن سے ایک طرف کا پاکھا بنگیا ہے۔ جہاں دو ٹکڑے ملے ہیں وہاں نہایت صفائی کے ساتھ نامعلوم طور پر ایک پتی اوپر جڑ دی ہے اور کیلوں سے کس دیا ہے۔ اس طرح ہر طرف مختلف ٹکڑے مل کر پندرہ سولہ گز لمبی چوڑی ایک ہی جالی بن گئی ہے۔ چونکہ مسجد کی چھت جس میں یہ جالیاں نصب کی گئی ہیں اوپر کی طرف محراب دار ہے۔ اس وجہ سے یہ جالیاں بھی اوپر کی جانب گولائی نما ہیں اور چاروں طرف سے پورا حجرہ شریف بلا تشبیہ ایک عظیم الشان پنجرہ نظر آتا ہے جس کی لمبائی جنوب سے شمال میں (۵۰) فٹ چوڑائی مشرق سے مغرب میں ۴۵ فٹ اور بلندی ۱۸ فٹ ہے۔ جنابہ سیدہؑ کے مقصورہ کی لمبائی شرقاً و غرباً (۴۰) فٹ اور چوڑائی جنوباً و شمالاً (۲۲) فٹ ہے۔ جالی کا رنگ تینوں طرف سبز ہے مگر دروازوں کی چوکھٹیں پیتل کی ہیں۔ استداد زمانہ کے باعث جالی کا رنگ اکھڑ گیا ہے اور جا بجا سے لوہا نظر آرہا ہے۔ جالی میں علاوہ مواجہ شریفہ کی تین کھڑکیوں کے اور طرف بھی چھوٹے چھوٹے حلقے موجود ہیں جن کا کام بتہایا جالی کے زیادہ چھدرا ہے ہر طرف جالی میں سے اور بالخصوص ان حلقوں میں سے زائر گیلری کی کیفیت دیکھ سکتے ہیں مگر سایہ ہونے کی وجہ سے دن میں بمشکل آنکھ جمتی ہے۔ البتہ جالی سے منہ لگا کر کھڑے ہوں اور بیرونی روشنی سے آنکھوں کو بچانے کے لیے دونوں ہتھیلیوں کی آڑ کریں تو گیلری کی حالت کسی قدر صاف نظر آتی ہے۔ سب طرف غلاف سے ڈھکا ہوا حجرہ شریف دکھائی دیتا ہے اور اوپر کی جانب غلاف حجرے کی چھت سے لٹکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۱۹) مزارِ اقدس کے اطراف گیلری

حجرہ شریف کے چاروں طرف بطور گردش کے چھت یا گیلری ہے۔ اسے مقصورہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی چوڑائی مختلف اطراف میں مخمس حجرے کے پہلوؤں کے اعتبار سے مختلف ہے کہیں زیادہ سے زیادہ چار گز اور کہیں کم سے کم پونے دو گز ہے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حجرہ شریف اور جنابِ سیدہ ع کے مکان کے بیچ میں پتھر کا ایک چوکا پڑا ہوا تھا۔ جس پر آنحضرت ص نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ اس پتھر کی نسبت امام علی ابن موسیٰ رضا علیہم السلام سے روایت ہے کہ وہ امام حسن و امام حسین علیہم السلام کی ولادت گاہ تھا۔ اس بارے میں متضاد روایتیں ہیں کہ آیا عمر بن عبد العزیز نے حجرہ شریف کے گرد پتھر کا فرش کرایا تھا یا نہیں۔ البتہ زمانہ خلافت جعفر متوکل علی اللہ میں (جو ۲۳۲ھ سے ۲۴۵ھ تک رہا) حجرہ شریف کے گرد پتھر کا فرش بنوایا گیا پھر خلیفہ مقتفی باللہ کے زمانہ میں جمال الدین اصفہانی نے ۵۴۸ھ میں اس فرش کی تجدید کرائی۔

(خلاصۃ الوفا صـ ۱۴۴)

اس کے بعد مورخین کچھ ذکر نہیں کرتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ حریق اول کے بعد یقیناً نیا فرش کرانے کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ سنگ مرمر بہت جلد جل کر چونا بن جاتا ہے اور اس آگ میں پتھر کے بہت سے ستون تک جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔ سید سمہودی کے زمانے میں سلطان قایتبائی نے گیلری میں دو مرتبہ فرش کرایا۔ پہلی دفعہ ۸۸۱ھ میں ترمیم حجرہ کے وقت دوسری مرتبہ آتشزدگی کے بعد ۸۸۶ھ میں۔ اس کے بعد پتہ نہیں لگتا کہ اور کب کب اس فرش میں ردوبدل ہوا۔ ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے دیکھا کہ یہ گیلری جس کے اندر کسی زمانے میں مختلف قسم کے بیش بہا تحفے رکھے جاتے تھے اور اس کی چھت میں بکثرت قندیلیں آویزاں کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اس کے اندر بجز صندوق صندل[۱]۔ صندوق مصحف[۲]۔ چند شمعدانوں

---

[۱] صندوق صندل کا ذکر مواجہہ شریفہ کے زیر عنوان ملاحظہ ہو۔

[۲] صندوق مصحف کا تفصیلی ذکر مسجد نبوی کی پہلی آتشزدگی کے بیان میں کیا گیا ہے۔

اور قندیلوں وغیرہ کے کوئی اور چیز نظر نہیں آتی۔ مگر دلکشی کے سامان یہاں دوسرے ہی ہیں شتاقانِ جمالِ محمدی جالی سے منہ لگائے ٹکٹکی باندھے دربارِ احمدی کا سماں دیکھتے ہیں اور گو بشکل گیلری کی کچھ کیفیت اور غلاف سے ڈھکی ہوئی دیواریں ہی نظر آتی ہیں۔ مگر اللہ اللہ رے شوقِ دید دل سیر ہی نہیں ہوتا۔ میں نے بغیر دیکھے یہ شعر کہے تھے۔ مگر جب آستانۂ اقدس پر حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ میرے دل کو پہلے سے سب کچھ خبر تھی۔

عجب کیا ہے جو آنکھیں روزنِ دیوار ہو جائیں — تمہارے روضہ کی یا شاہ جب ہم جالیاں دیکھیں

نظر آتا ہے روضے کا ہمیشہ اک نیا عالم — نگاہِ شوق سے شبیر جب دیکھیں جہاں دیکھیں

رات کو روشنی سے یہ حصہ بقعۂ نور بنجاتا ہے[1]۔ غلاف گیلری اور اس کی ہر چیز آئینہ ہوجاتی ہے۔ خدام حجرۂ شریف کے سوا عام زائروں کی رسائی اس گیلری تک بھی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کسی معزز یا متمول یا مقدس حاجی کو شرفِ باریابی حاصل ہوجاتا ہے۔ مجھ جیسے گنہگار باوجود موقع پانے کے اس زمین پر اپنے ناپاک قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔

شام کے وقت اس گیلری کا فرش عرقِ گلاب سے دھویا جاتا ہے۔ خدام روشنی کرنے حجرے کی دیواروں میں عطر ملنے اور عود بتیاں سلگانے کے لیے گیلری کے اندر داخل ہوتے ہیں اس وقت یہاں کی معطر و معنبر ہوا دماغ پر ایک خاص کیفیت و سرور پیدا کرتی ہے۔ عود و عنبر کی مہک اور عطر کی لپیٹیں زائروں کو کسی اور ہی عالم میں پہنچادیتی ہیں اور مجھ سے خوش عقیدہ شخص کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔

کیوں عطر میں ڈوبی ہوئی آتی ہیں ہوائیں

طیبہ ہی کی سرحد میں مگر خلد بریں ہے

جس وقت خدام اپنے فرائض انجام دیکر حجرۂ شریف سے باہر نکلتے ہیں تو عاشقانِ رسول ﷺ مصافحہ کرنے کے لیے دیوانہ وار اُن کی طرف جھپٹتے ہیں۔ دس بارہ سال قبل میں نے عام زائروں کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔ خدام حجرۂ شریف کے مدارج و مراتب کا اس پر قیاس فرما لیجیے۔

---

[1] میں نے ذیحجہ ۱۳۴۵ھ میں یہاں برقی روشنی۔ زیتون کے گلاس اور موم بتیاں روشن ہوتے دیکھی تھیں شعبان ۱۳۴۶ھ میں حکومتِ نجد نے اس روشنی کو خلافِ شرع و اسراف سمجھکر موقوف کر دیا۔ اب مسجد نبوی میں برقی روشنی ہوتی ہے جس کا اُجالا یہاں تک پہنچتا ہے

کس زمین کی خاکِ عطر افشاں سے گزرے حاجیو
مجھ کو تم سے آتی ہے جنت کے پھولوں کی ہوا

(۲۰) علامتِ مواجہ شریفہ

آنحضرت صلعم کے مواجہہ شریفہ یعنی سرہانے کے امتیاز کے لیے زمانۂ قدیم سے کچھ نہ کچھ علامت چلی آرہی ہے تاکہ زایر اس کے متصل یا اس کے اندازہ سے کھڑا ہو کر سلام عرض کرسکے۔

(الف) قندیل۔

چوتھی صدی ہجری میں مسجد نبوی کی چھت میں ایک قندیل لٹکی ہوئی تھی۔ سلام پڑھتے وقت زایر اس کے نیچے کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ حجرے کی دیوار میں جنوب کی طرف پیتل کی ایک کیل بھی گڑی ہوئی تھی۔ امام محمد غزالی کے زمانہ زیارت تک جو ۴۸۸ھ ہے یہی حالت رہی۔

(ب) مسمار فضہ

ابن جبیر کے زمانہ یعنی ۵۸۰ھ میں چاندی کی ایک کیل جسے مسمار فضہ کہتے تھے مواجہہ شریفہ کی علامت تھی۔ ابن نجار جن کی وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی۔ مسمار فضہ کا ذکر کرتے ہیں ۷۱۰ھ میں یہ ٹوٹ گئی تو چار برس بعد ۷۱۴ھ میں دوسری لگا دی گئی۔ چنانچہ ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ۸۸۱ھ ہجری میں حجرے کی تعمیر کے وقت اِس کیل کو علٰحدہ کیا گیا۔ اور بعد تعمیر چاندی کی ایک کیل جنوبی دیوار میں اور دو کیلیں مغربی دیوار میں نصب کی گئیں۔ ۸۸۶ھ کی آتشزدگی میں جب یہ جل گئیں۔ تو پھر کوئی مسمار فضہ نہ لگائی گئی اور صرف صندوق صندل علامت مواجہہ کافی سمجھی گئی۔

(ج) صندوق صندل

یہ ایک صندوق ہے۔ جس کے رکھنے کا دستور زمانہ دراز سے چلا آرہا ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر ابن جبیر نے کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

اس دیوار کے پاس آبنوس کا ایک صندوق رکھا ہوا ہے جس میں صندل بھرا ہوا ہے اور اس پر چاندی کے پترے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ آنحضرت کے سرہانے کے امتیاز کی علامت ہے اس کا طول (۵) بالشت عرض (۳) بالشت اور اونچائی (۴) بالشت ہے۔

(سفرنامہ ابن جبیر عربی مطبوعہ جرمنی (ص ۱۹۳))

سمہودی کے زمانہ تک یہ صندوق موجود تھا وہ کہتے ہیں۔

یہ نہیں معلوم کہ اس صندوق کے یہاں رکھنے کی ابتدا کب سے ہوئی سب سے پہلے ابن جبیر نے اس کا ذکر اپنے سفرنامے میں کیا ہے جب دوسری آتشزدگی (۸۸۶ھ) میں یہ صندوق جل گیا تو اس کی جگہ ایک دوسرا صندوق رکھدیا گیا اور اس صندوق کے اوپر لکڑی کی ایک منقش تختی جو پہلے نصب تھی اس کی بجائے سنگ مرمر کی ایک لوح لگا دی گئی۔ جس پر صلوٰۃ وسلام وغیرہ لکھدیا گیا۔

(خلاصۃ الوفا عربی مطبوعہ مصر باب (۴) فصل (۱۱) ص ۱۴۳)

سید جعفر برزنجی فرماتے ہیں کہ کچھ عجب نہیں کہ اس صندوق کی ابتدا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی ہو۔ اُس وقت مسجد نبوی کی خوشبو کے لیے صندل و عود وغیرہ اس میں رکھتے ہوں گے۔ اس کے بعد دوسرے خلفا وسلاطین نے بھی اس کی پیروی کی۔ جب صندوق وغیرہ متعدد ہو گئے تو عود وغیرہ دوسری جگہ رکھنے لگے اور یہ صندوق صندل کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ (نزہۃ الناظرین عربی مطبوعہ مصر ص ۷۲ و ۷۳)

۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے بھی حجرہ شریف کی گیلری کے مغربی و جنوبی گوشہ میں ایک صندوق سال کی لکڑی کا رکھا ہوا دیکھا۔ یہ کوئی سوا گز اونچا اور پون گز چوڑا ہے

یہ الماری کی سی شکل کا ہے۔ علاوہ ڈھکنا کھلنے کے اس کی تین درازیں بھی باہر کھینچی ہیں۔ مغرب کی طرف سے اگر جالی کے اندر دیکھیں تو یہ صندوق کونے میں رکھا ہوا نظر آتا ہے اس صندوق ہی کی وجہ سے اُس ستون کو جس کے قریب یہ صندوق رکھا ہے قدیم سے اسطوانۂ صندوق کہتے ہیں بعض مورخین مثلاً مولوی صبغۃ اللہ صاحب مولف آئینہ باخبار مدینہ نے جو نقشہ حجرہ شریف کا دکھایا ہے۔ اس میں جالی کے اندر اس صندوق کو بھی ظاہر کیا ہے۔ اب سے چند سال قبل تک اس صندوق میں صندل رکھنے نکالنے کی رسم ہر سال بڑی دھوم سے ادا کی جاتی تھی۔ پرانا صندل نکال کر تبرکاً زائروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے اور نیا صندل عطر و عرق گلاب میں گوندھکر صندوق میں رکھدیتے تھے۔ نیا صندل شیخ الحرم کے مکان سے لایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اغوات (خواجہ سرا) خدام مسجد و مشایخ حرم کی عورتیں اور بعض اہل مدینہ کی مستورات بھی نعتیہ اشعار پڑھتی ہوئی آتی تھیں اس کے بعد سب کے لیے نفیس کھانوں کا دسترخوان چُنا جاتا تھا اور اغوات و تکبیر و تہلیل کہتے ہوئے صندوق میں صندل رکھتے تھے۔ اہل نجد اس قسم کے کاموں کو خلافِ شرع سمجھتے ہیں اور عورتوں مردوں کا اس طرح ایک جگہ جمع ہونا اور مستورات کا مردوں کے ساتھ گاتے ہوئے چلنا خواہ نعتیہ قصاید ہی کیوں نہ ہوں ناجائز سمجھتے ہیں۔ اس لیے اب خاموشی کے ساتھ صندل کی اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔

میں نے کپتان برٹن کے اعتراضات کے جواب میں آئندہ ایک فصل میں اس صندوق کا ذکر صراحت سے کیا ہے۔

(د) کوکب الدّری۔

مواجہہ شریفہ کی ایک اور ممتاز علامت تھی جو حجرۂ شریف میں کئی سو برس تک رہی۔ وہ مشہور چمکدار ہیرا کوکب الدری تھا جسے سنہ ۱۰۱۱ھ میں سلطان احمد خاں اول نے حجرۂ شریف کی نذر کیا تھا اور یہ جنوبی دیوار میں روئے مبارک کے محاذی نصب تھا۔ اس کے اوپر سے غلاف کتر دیا گیا تھا اور شبکۃ النبی میں سے زایروں کو یہ نظر آتا تھا۔ میں نے حجرۂ شریف کے تحائف کے ضمن میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جنگِ عمومی میں ترک مدینے کا تخلیہ

کرتے وقت دوسری بیش بہا چیزوں کے ساتھ اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

(۴) شبکہ نبی

اس زمانے میں مواجہہ شریف کی بڑی علامت وہ گول کھڑکی ہے جو قبلہ رخ جالی میں ہے اس کے قریب کھڑے ہوکر زائرین صلواۃ وسلام وزیارت وفاتحہ پڑھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ عرصۂ دراز سے اصل علامت مواجہہ شریفہ یہی کھڑکی تھی امتیاز مزید کے لیے مسمار نقشہ کوکب الدری وصندوق وغیرہ رکھے گئے تھے۔

(۲۱) مواجہہ شریفہ کے سامنے جنازے

زمانۂ قدیم سے مدینے میں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ نماز کے لیے جنازے مسجد نبوی ؐ میں لائے جاتے ہیں اور مواجہہ شریفہ کے سامنے تھوڑی دیر رکھ کر بقیع میں دفن کے لیے لے جاتے ہیں۔

سب سے پہلا جنازہ جو مواجہہ شریفہ میں رکھا گیا وہ امام حسن علیہ السلام کا تھا ان کی وصیت تھی کہ بعد وفات ان کا جنازہ ان کے نانا کی خدمت میں پہنچایا جائے۔ اور نانا کی پائنتی دفن کیا جائے۔ امام مظلوم کی ایک وصیت پوری ہوئی مگر دوسری پوری نہ ہوسکی بعض مخالفوں نے مزاحمت کی اور مجبوراً جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ نویں صدی کے وسط تک تمام مسلمانوں کے جنازے خواہ سُنی ہوں یا شیعہ نماز کے لیے مسجد نبوی میں لائے جاتے تھے اور مواجہہ شریفہ کے پاس رکھے جاتے تھے۔ ۸۴۲ھ میں الظاہر جقمق[۱] سلطان مصر نے مسجد نبوی ؐ میں بجز سادات کے عام شیعوں کے جنازوں کے لانے کی ممانعت کردی۔ یہ بھی صرف مسجد میں لائے جاتے تھے۔ مواجہہ شریفہ تک نہیں پہنچائے جاتے تھے۔ چنانچہ چند سال

---

[۱] یہ بادشاہ ربیع الاول ۸۴۲ھ سے ۸۵۷ھ تک سلطان مصر وحجاز رہا ہے۔ اس کا لقب ملک الظاہر سیف الدین ابوسعید جقمق ہے۔

قبل تک یہی طریقہ جاری تھا اور سنیوں کے جنازوں کو (بجز مسافروں اور محتاجوں کے) مسجد نبوی میں لانے کی عام اجازت تھی۔ شیعوں میں سے صرف سیدوں کی نماز جنازہ مسجد نبوی میں ہوتی تھی۔ باقی کی نماز مسجد سے باہر۔ عام شیعوں کو بقیع میں دفن کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ۱۳۴۵ھ میں مجھے معلوم ہوا کہ سلطان عبد العزیز ابن سعود موجودہ فرمانروائے حجاز نے یہ قید اٹھادی۔ اب شیعوں کے جنازے بھی بلا شرط مسجد میں لائے جاتے ہیں۔ مواجہہ شریفہ میں رکھے جاتے ہیں۔ اور جنت البقیع میں دفن کیے جاتے ہیں۔

(۲۲) مزار اقدس کے تحفے اور ہدیے

شاہانِ اسلام اور اُمراء عرصہ دراز سے حجرۂ شریف کے لیے جواہرات۔ زیورات نادر اشیاء اور سونے چاندی کے برتن بھیجتے رہے ہیں۔ یہ چڑھاوے حجرے کی گیلری میں رکھے جاتے تھے یہ ظاہر ہے کہ وہ بادشاہِ دوجہاں جو فقیری پر ہمیشہ فخر کرتا رہا جو مساکین کے ساتھ زندہ رہنے مسکین مرنے اور مسکینوں کے زمرے میں قیامت کے دن اُٹھنے کی عمر بھر دعا کرتا رہا۔ اس کو مرنے کے بعد سونے، چاندی، زر و زیور اور الماس و زمرد سے کیا سروکار؟ مگر نیک نیت ارباب دولت کی غرض اس قسم کی چیزیں حجرۂ شریف پر چڑھانے سے یہ ہوتی تھی کہ بادشاہ اسلام اِس خزانہ سے مجاہدین کی امداد کرے۔ یا اُس کا روپیہ مسجد نبوی و حجرۂ شریف کی تعمیر و ترمیم میں لگایا جائے یا کسی مصیبت و قحط کے وقت رسول اللہ کے پڑوسی اس سے مستفید ہوسکیں۔ وقف کرنے والوں کی نیت ہمیشہ اسی قسم کی ہوتی ہے۔ لیکن وقف کے متولی عموماً کچھ اور نیت رکھتے ہیں۔

حجرۂ شریف کا خزانہ جس طرح جمع ہوتا رہا ہے اس کے متعلق الجبری کی تاریخ "المتغالین فی الدین" سے چند فقرے اس جگہ لکھدینا ہم مناسب سمجھتے ہیں۔

"آنحضرت تو اس قسم کے سامان و اسباب سے منزہ تھے۔ مال کا ان کے

حجرے میں جمع کرنا اور مستحقین ومساکین وفقرا کو اس سے محروم رکھنا خلاف شریعت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس مال کا جمع کرنا اس غرض سے تھا کہ گردشِ زمانہ ومصائب کے وقت اس سے مدد لی جائے اور کفار ومشرکین سے جہاد کے وقت کام آئے اور اس سے بادشاہِ اسلام کو تقویت پہنچے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے زمانے کے بادشاہوں کو دیکھا کہ دولِ یورپ کے غلبہ کی وجہ سے وہ بے انتہا مصائب میں مبتلا ہوئے۔ ان کے خزانے خالی تھے۔ فرنگیوں نے ان پر بڑے بڑے تاوانِ جنگ عاید کرکے صلح کی شاہانِ اسلام نے وہ روپیہ اپنی رعایا پر بھاری بھاری ٹیکس لگا کر اور تاجروں کے مال پر ناجائز قبضہ کر کے اکٹھا کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاجر دیوالیہ ہوگئے اور رعایا فقیر بنگئی۔ مگر حجرۂ شریف کے مالِ مجتمعہ سے کبھی کسی بادشاہ کو فائدہ نہ پہنچا۔ البتہ حرم کے خادم اس سے مستفید ہوتے رہے۔ مگر غریب اولادِ رسول علماء مساکین اور مسافر سب بھوکے مرتے رہے"

(مراۃ الحرمین عربی مطبوعہ مصر جلد اول ص۵۵)

منجملہ اُن بیشمار چیزوں کے جو حجرۂ شریف کے خزانے میں تھیں چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

سلطان احمد خاں اول نے سنہ ۱۱۰۰ھ میں کبوتر کے چھوٹے انڈے کے برابر ایک ہیرا نذر کیا تھا۔ روشنی اور چمک کی وجہ سے اس کو کوکب الدری[1] کہتے تھے یہ ایک تختی میں جڑا ہوا تھا۔ اس کے گرد قیمتی جواہرات کے (۲۲۷) ٹکڑے اور تھے اس کے نیچے سونے کا ایک آویزہ تھا وہ بھی جواہرات سے مرصع تھا۔ کوکب الدری کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ کیا جاتا تھا یہ حجرۂ شریف کی دیوار پر جانبِ جنوب روئے مبارک کے محاذی نصب تھا۔ اور شبکہ نبی میں سے زائروں کو دکھائی دیتا تھا

سنہ ۱۰۴۷ھ میں سلطان مراد رابع ابن سلطان احمد خاں نے ایک ہیرا بھیجا تھا جو کوکب الدری کے نیچے حجرۂ شریف میں آویزاں تھا اسی بادشاہ کے زمانہ میں مصطفےٰ پاشا سپہ سالار نے بھی ایک ہیرا جس کے گرد اور کئی ہیرے جڑے تھے چڑھایا تھا

سنہ ۱۱۵۴ھ میں ملک بلغاریہ کی فتح میں جو جواہرات ترکوں کے ہاتھ آئے تھے ان میں سے بہت جواہر شامی قافلہ کے ہمراہ بہ نگرانی علی پاشا فاتح بلغاریہ حجرۂ شریف کے لیے بابِ عالی سے روانہ کیے گئے تھے۔

سنہ ۱۲۹۱ھ میں سلطانہ عادلہ بنت سلطان محمود خاں نے ایک سنہری تختی روانہ کی تھی جس پر ہیروں سے کلمہ

[1] کوکب کے معنی ستارے کے ہیں اور دُرّی بڑے روشن ستارے کو کہتے ہیں۔ کوکب الدری کے معنے بڑا اسنور ستارہ۔

لکھا ہوا تھا۔ یہ کوکب الدری کے قریب نصب تھی۔ ایک اور طلائی تختی بھی اس نے بھیجی تھی جس پر ہیروں سے حضرت فاطمہؑ کا نام لکھا ہوا تھا ان کے علاوہ حجرے میں اور بھی بہت سے قیمتی جواہرات تھے۔ حضرت فاطمہؑ کے حجرے کے اندر موتیوں اور مونگوں کے بہت سے ہار آویزاں تھے اور طلائی شمعدانوں کے قریب موتیوں کے جھاڑ۔ مرصع پنکھے جڑاؤ انگشتیاں۔ عود سوز مرصع قرآن مختلف زیورات۔ کنگن۔ بالیاں وغیرہ بہت سی چیزیں مصری وترکی مالدار عورتوں نے چڑھائی تھیں۔ خدیو عباس حلمی پاشا کی ماں نے بہت سی قیمتی الماریاں حجرۂ شریف کے نذر کی تھیں اس تمام سامان کی مجموعی قیمت کا اندازہ دس کرور پچاس لاکھ روپیہ کیا جاتا ہے۔

(نزہتہ الناظرین۔ رحلتہ الحجازیہ۔ مراۃ الحرمین)

(۴۰)

(درعہ ۴) مزار اقدس کے خزانہ میں تغلّب و تصرف

ہدیے اور تحائف

واکرمتی کا صحیح پتہ لگانا دشوار ہے کہ خلفائے بغداد وسلاطین مصر نے جو تحفے اور ہدیے حجرہ شریف کو دیے یا بھیجے تھے وہ کس کس زمانہ میں یہاں سے نکالے گئے اور جائز یا ناجائز طور پر صرف کیے گئے۔ ہم نے اوپر جو چند اشیاء کا ذکر کیا ہے وہ سلاطین آلِ عثمان کے زمانہ میں داخل ہوئے ہدیے تھے۔ ان سے قبل کے ہدیوں کا صحیح پتہ نہیں کہ کیا کیا نایاب چیزیں یہاں موجود تھیں اور وہ کب یہاں سے علیحدہ کر دی گئیں۔ سید سمہودی نے نویں صدی ہجری کے حسب ذیل چار واقعات بیان کیے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اس وقت بعض لوگوں نے اس خزانہ پر دست درازی کی تھی۔

(۱) الناصر فرج سلطان مصر وحجاز نے ۸۱۱ھ میں جماز بن ہبتہ حسینی کو جو مدینہ کا والی تھا امارت مدینہ سے معزول کیا تو اس نے بہت سے مفسدوں کو جمع کر کے بغاوت کی۔ اہل مدینہ کے گھر لوٹ لیے اور حجرۂ شریف کا سامان بھی اڑا لے گیا۔ جس میں کوئی ۲۰ من چاندی کی اور کئی من سونے کی قندیلیں وغیرہ تھیں ۸۱۲ھ میں وہ اور اس کے ساتھی

قتل کر دیے گئے مگر مال غنیمت جو اُس نے کہیں دفن کر دیا تھا اس کا کچھ پتہ نہ لگا۔

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفٰے جلد اول صہ ۴۱۹)

(۲) امیر عزیز بن ہیازع بن ہبۃ الحسینی نے امیر مدینہ سے ۸۲۴ھ میں قرض کے نام سے حجرہ شریف کا مال و اسباب نکال لیا۔ اور تمرد و سرکشی اختیار کی۔ اس کے پاداش میں اس کو قاہرہ لے گئے اور یہ وہیں مر گیا۔

(۳) برغوث بن تبیر اور دیوس بن سعد جو مدینہ کے سربرآوردہ اشخاص تھے۔ ۲۰ ذیحجہ ۸۶۰ھ کو رات کے وقت حجرہ شریف سے خزانہ نکال لے گئے۔ مدت تک کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ آخر معلوم ہوا تو امیر مدینہ نے ان کو سولی پر چڑھایا۔ کچھ تھوڑا سا مال اُن سے واپس مل گیا۔

(۴) اسی طرح ۹۰۱ھ میں حسن بن زبیر المنصوری نے دست برد کی۔

(خلاصۃ الوفا صہ ۱۵۵)

سلاطین عثمانیہ کے چڑھائے ہوئے تحفے پہلی مرتبہ تیرھویں صدی ہجری ۱۲۱۹ھ میں حجرہ شریف سے نکالے گئے جو خدام حجرہ شریف غالب اور سعود بن عبد العزیز نے حاصل کیے مگر اس کا تمام الزام اہل نجد پر ہی لگایا جاتا ہے۔ مثلاً سید جعفر برزنجی مؤلف رحلۃ الحجازیہ یہ تحریر فرماتے ہیں:۔

سعود ابن عبد العزیز وہابی نے ۱۲۱۹ھ میں حجاز پر قبضہ کر کے حجرہ شریف میں جو کچھ نقد و جواہر اور چاندی و سونا تھا سب لوٹ لیا جس میں ایک سو مرصع تلواریں بھی تھیں۔ سعود نے طلائی و نقرئی قندیلوں کو کسوٹ کر اپنے ساتھیوں کو تقسیم کیا۔ اور باقی کے سکے ڈھال کر مدینے میں رواج دیے یہ سکے سابقہ سکوں سے جدا تھے اور مدینہ میں رائج تھے۔ وہابیوں نے شریف غالب کے ہاتھ اس لوٹ کا کچھ حصہ پچاس ہزار ریال (یعنی لاکھ روپیہ) میں فروخت کر دیا تھا اور کچھ سامان سعود کے پاس رہا۔ جب عبد اللہ ابن سعود اور طوسون پاشا کے درمیان صلح ہو گئی تو طوسون پاشا نے عبد اللہ سے

"کچھ سامان دو ہزار مصری گنی یعنی کوئی تیس ہزار روپے میں خرید کر حجرۂ شریف میں پھر رکھ دیا۔ اسی طرح عبداللہ بن سعود نے گرفتار ہوجانے کے بعد جو چیزیں محمد علی پاشا کی نذر کیں۔ وہ بھی اُس نے حجرے میں واپس کردیں"۔

آخرالذکر واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم[1] پاشا فرزند محمد علی پاشا نے جو جنگ وہابیہ کا خاتمہ کردینے کے لیے بلکہ وہابیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے حجاز گیا تھا۔ عبداللہ ابن سعود کو بتاریخ ۱۸ رجب ۱۲۳۳ھ مع اُس کے اہل وعیال اور خدم وحشم کے جن کی تعداد چارسو تھی گرفتار کرکے قاہرہ بھیجدیا۔ عبداللہ[2] کے وہاں پہنچنے پر بڑی خوشی منائی گئی۔ شہر آراستہ

---

[1] - ابراہیم پاشا بانی خاندان خدیویۂ مصریہ محمد علی پاشا کا متبنٰی لڑکا تھا۔ یہ ۱۷۸۹ء میں مقام قوالا علاقۂ البانیا میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸۱۶ء میں اس نے مصر صعید میں مملوکوں اور عربوں کی شورش فرو کی۔ ۱۸۱۷ء میں وہابیوں کے استیصال کے لیے حجاز ونجد گیا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے وہابیوں کے مختلف مقامات فتح کرلیے اور اُن کے پایۂ تخت درعیہ کو جو اُس زمانہ میں اپنی عمارات۔ مساجد مدارس وباغات وغیرہ کی وجہ سے نجد کا بہترین شہر تھا اور تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ چھ مہینے کے محاصرے کے بعد فتح کرلیا۔ اور سارے شہر کو کھدواکر مٹی کا ڈھیر کردیا۔ بہت سے علما ورؤسا کو قتل کیا درعیہ کے قاضی احمد بن رشید کے سارے دانت اُکھڑوا دیے۔ امیر نجد عبداللہ بن سعود کے لڑکے سعود کو گرفتار کرکے قتل کرایا اور ۱۸۱۹ء میں عبداللہ بن سعود امیر نجد کو پکڑ کر مصر بھیجدیا۔ یہ سب حرکات ابراہیم پاشا نے اُس وقت کیں جبکہ صلح کے بعد درعیہ میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بعد خلیج فارس میں جہاں وہابیوں کے حملے ہوا کرتے تھے انتظام قایم کرنے کے لیے گیا۔ پھر حجاز واپس ہوا اور اسی سال حج کے بعد مصر واپس چلا گیا۔ ۱۸۲۴ء میں جب یونانیوں نے ترکوں کے خلاف جنگ آزادی چھیڑی تو سلطان کی مدد کے لیے وہاں پہنچا اور یونانیوں کے بہت سے شہر فتح کیے اور ۱۸۲۷ء میں مصر آگیا۔ ابراہیم پاشا کی سب سے بُری حرکت اُس کا شام کا حملہ ہے۔ جو اُس نے والی عکہ سے تکرار ہوجانے پر ۱۸۳۱ء میں کیا اور اپنے آقا ترکوں سے جنگ کرکے ملک شام فتح کرلیا۔ اس موقع پر دول یورپ بیچ میں کود پڑیں۔ ملک مفتوحہ ترکوں کو واپس دلادیا اور محمد علی پاشا پدر ابراہیم پاشا نے ملک مصر اپنے خاندان کے لیے ہمیشہ کے واسطے مخصوص کرالیا۔ جنوری ۱۸۴۸ء میں محمد علی نے بوجہ ضعف وپیری عزلت اختیار کرکے (بقیہ حاشیہ بر صـ۱۲۲)

کیا گیا۔ ایک ہزار توپیں چھوڑی گئیں اور شہر میں اُس کی تشہیر کی گئی۔

عبداللہ کو اسماعیل پاشا ابن محمد علی کے محل واقع بولاق میں ٹھہرایا۔ دوسرے دن پاشا نے اس سے ملاقات کی۔ محمد علی نے اس سے پوچھا کہو کیا حال ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ فتح و شکست خدا کے ہاتھ ہے۔ محمد علی نے کہا میں تم کو سلطان کی خدمت میں بھیجدوں گا عبداللہ نے جواب دیا جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ضرور ہوگا۔ عبداللہ نے پاشا کو ایک صندوقچہ نذر کیا جس میں تین مرصع قرآن تین سو بڑے بڑے دانوں کے موتی اور کئی بڑے بڑے زمرد تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱)

ابراہیم پاشا کو والی مصر مقرر کیا۔ چند مہینے بعد نومبر ۱۸۴۸ء میں ابراہیم پاشا نے وفات پائی۔ حملہ شام کی یادگار میں قاہرہ کے کئی راستوں پر ابراہیم پاشا کی مجسم تصویر استادہ ہے جس میں وہ ایک زبردست گھوڑے پر سوار تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ گویا مصریوں سے کہہ رہا ہے کہ شام کی طرف بڑھے چلو۔

۵۳۔ عبداللہ بن سعود ربیع الثانی ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) میں اپنے باپ کے انتقال کے بعد امیر نجد ہوا تھا۔ اسی سال محمد علی پاشا تکمیل فتوحات کے لیے حجاز گیا تھا اس نے اپنے روپیہ اور حکمت عملی سے عربوں کو اپنی طرف بلا لیا۔ عبداللہ نے خوف زدہ ہو کر صلح کی۔ مگر جنگ کا سلسلہ پھر بھی ۱۸۱۵ء تک چلتا رہا۔ آخر عبداللہ نے ترکوں کی حکومتِ حجاز کو تسلیم کر کے صلح چاہی۔ مگر محمد علی پاشا نے منظور نہ کیا اور اپنے فرزند ابراہیم پاشا کو وہابیوں کا نام و نشان مٹا دینے کے لیے حجاز کی طرف بھیجا اس نے مختلف لڑائیوں کے بعد عبداللہ کو قید کر کے قاہرہ روانہ کر دیا۔ محمد علی اور اس کے لڑکے ابراہیم پاشا نے ان لڑائیوں میں جس جس طرح عہد شکنی کی اور صلح پسندوں امن طلب کرنے والوں اور قیدیوں کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا اُن کے لحاظ سے یہ لڑائی جس کو جہاد کہا جا رہا تھا ایک بُری قسم کی دنیوی جنگ تھی۔

۵۱۔ دریائے نیل کے مشرقی بندرگاہ کا نام بولاق ہے۔ کسی زمانے میں یہ جزیرہ تھا مگر اب خشکی سے ملا دیا گیا ہے۔ تجارت کی بڑی منڈی ہے۔ تجارتی مال کی کشتیاں بکثرت یہاں آتی رہتی ہیں۔ کپڑا بننے کے کارخانے۔ ہتیار بنانے کا کارخانے اور سرکاری مطبع یہیں واقع ہے۔

۵۲۔ یہ زمانہ سلطان محمود خاں ثانی کا تھا جس کا عہد حکومت ۱۲۲۳ھ سے ۱۲۵۵ھ تک رہا۔

عبداللہ نے کہا کہ یہ وہ سامان ہے جو میرے والد نے حجرے میں سے لیا تھا۔ پاشا نے پوچھا کہ حجرے کے مال کثیر میں سے کیا تمھارے والد نے صرف اتنا ہی لیا تھا۔ عبداللہ نے جواب دیا یہ خیال کہ ہمارے فتوحات کے وقت حجرے کا سامان جوں کا توں رکھا ہوا تھا غلط ہے۔ امرائے عرب۔ اہلِ مدینہ اور حرم شریف کے اغوات بہت سے سامان پر پہلے ہی تصرف کر چکے تھے۔ پاشا نے جواب دیا واقعی یہ صحیح ہے۔ ہم نے بھی شریف غالب کے پاس لباس وخلعت وغیرہ کی قسم سے بہت سی چیزیں دیکھی تھیں۔ ۱۹/محرم ۱۲۳۴ھ کو عبداللہ مع اُس کے ساتھیوں کے قسطنطنیہ بھیجدیا گیا۔ جہاں تشہیر کے بعد باب ہمایوں کے پاس اس کو قتل کر دیا۔ اس کے ساتھی شہر کے دوسرے مقامات پر قتل کیے گئے۔

(مراۃ الحرمین جلد اول صـ۴۵۶)

فرنگی سیاح برکھارٹ جو ۱۲۳۳ھ میں مدینے گیا تھا وہ حجرۂ شریف کے مال واسباب کی نسبت حسبِ ذیل ریمارک کرتا ہے۔ معاصر ہونے کی وجہ سے اس کا بیان خاص اہمیت رکھتا ہے:۔

مدینے کے محاصرے کے زمانے میں اِن خزانوں کا بڑا حصّہ خصوصاً سونے کے تمام برتن شہر کے بڑے آدمیوں نے نکال لیے تھے۔ حیلہ یہ کیا تھا کہ غریبوں میں تقسیم کریں گے مگر اصل میں اُنھوں نے آپس میں ہی بانٹ لیے۔
جب امیر سعود نے مدینہ فتح کیا تو وہ خود حجرے میں داخل ہو کر غلاف تک پہنچ گیا اور جو کچھ اُس کو وہاں ملا اُس پر قبضہ کر لیا۔ اِس لوٹ میں سے اُس نے ایک حصہ شریف مکہ کے ہاتھ فروخت کیا اور باقی درعیہ لے گیا۔ سب سے زیادہ بیش قیمت چیز جو سعود کے ہاتھ لگی وہ کوکبُ الدری تھا۔ یہاں ہر قسم کے برتن بھی جمع تھے۔ علاوہ ان کے جڑاؤ زیور۔ گچھے۔ بالیاں۔ گلوبند ہیکلیں اور دوسرے زیورات بھی تھے۔ جو سلطنت ٹرکی کے مختلف صوبوں سے لوگوں نے بطور تحفہ بھیجے تھے اور بڑے بڑے مالدار حاجیوں نے یہاں آکر چڑھائے تھے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ کل ذخیرہ ملا کر بڑی قیمت کا

ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کی قیمت کا اندازہ ہی نہ ہو سکے۔ جیسا کہ
بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ شریف غالب نے جو سامان خریدا تھا۔ اس کا تخمینہ
ڈھائی لاکھ روپیہ کیا جاتا ہے۔ شہر کے امراء تخمیناً ایک من سولہ سیر سونے کے
برتن اڑالے گئے تھے۔ جو زیادہ سے زیادہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے کے ہوں گے
سعود نے جو کچھ لیا وہ خصوصاً سونے کی چیزیں تھیں اور یقیناً شریف غالب
کے حصے کی قیمت سے زیادہ کی نہ تھیں۔ غرضکہ حجرے کے کل مال کی قیمت
سات آٹھ لاکھ روپیہ ہوگی۔ طوسون پاشا نے مدینے پہنچکر سونے کے ان
برتنوں کی تلاش کی جو یہاں کے امیروں نے شہر والوں کے ہاتھ بیچے تھے
اور جو ابھی تک گلائے نہیں گئے تھے چنانچہ بہت سے برتن اس کو مل گئے
جو اس نے پچیس ہزار روپے میں خرید لیے اور پھر ان کو حجرے میں
رکھ دیا۔" (سفرنامہ برکھارٹ جلد دوم)

برکھارٹ نے حجرۂ شریف کے اس خزانے کی کیفیت بیان کی ہے جو غالباً سلاطینِ
آلِ عثمان کے حجاز پر قابض ہونے کے بعد سے ۱۲۱۹ھ تک جمع ہوا تھا برکھارٹ
نے مالِ غنیمت میں کوکب الدری کا شمار بھی کیا ہے۔ لیکن جعفر برزنجی وغیرہ دوسرے مورخ
بصراحت اس کا نام نہیں لیتے۔ واپس شدہ جواہرات میں بھی اس کی گنتی نہیں ہے اس کا
وجود وہابیوں کے قبضۂ حجاز اٹھ جانے کے بعد سے حجرۂ شریف میں برابر پایا جاتا ہے
چودھویں صدی کے تمام سیاح اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہابیوں نے
اسے نہیں لیا تھا ورنہ ایسی بیش بہا چیز جس کی قیمت ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ بتائی جاتی
ہے۔ خاموشی کے ساتھ کہاں سے آگئی۔ کیونکر آئی۔ کس وقت آئی۔ وہابیوں نے خود بخود رکھ دی
یا کسی نے ان سے لیکر یہاں پہنچادی۔

ترکوں کے دوبارہ حجاز پر قابض ہونے کے بعد سے یعنی ۱۲۳۳ھ سے ۱۳۳۲ھ تک
ایک سو برس میں جو چڑھاوے حجرۂ شریف میں چڑھائے گئے اور جو کچھ زر و جواہر یہاں
جمع ہوا اس کی قیمت کا تخمینہ حسب اندازہ صاحب مرآۃ الحرمین و رحلۃ الحجازیہ والسکینہ وغیرہ

دس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ہے۔ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عمومی شروع ہوئی۔ اور شریف مکہ حسین پاشا نے ترکوں سے بغاوت کی تو پھر یہ زمانہ آ گیا کہ جو جس کے ہاتھ آیا وہ اس نے دھر گھسیٹا بہت سی بیش قیمت چیزیں یہاں سے جاتے وقت خود ترک لے گئے۔ کچھ سامان خدام و اغوات[1] نے غائب کر دیا۔ باقی سب شریف نے ہضم کر لیا اور ۱۳۴۳ھ میں جب وہابیوں نے بسر کردگی سلطان عبد العزیز ابن عبد الرحمان آل سعود شریف کو نکال کر حجاز پر قبضہ کیا۔ تو ان کو حجرۂ شریف کی صرف دربانی ملی۔ تیرھویں صدی کے آخر میں اور چودھویں صدی کے ایک ربع حصے تک حجرے کے خزانے جواہرات و زیورات و بیش قیمت اشیاء سے بھرے ہوئے تھے۔ اور گیلری میں لاکھوں کروڑوں روپے کا مال تھا اب وہاں معمولی چند طلائی قندیلیں کچھ شمعدان اور چند عود سوز ہیں۔

(۲۴) مزارِ اقدس میں روشنی

زمانہ قدیم سے شاہان اسلام و امراء و حکام مسجد نبوی اور حجرۂ شریف میں روشنی کرنے کے لیے بیش قیمت قندیلیں اور طلائی فانوس وغیرہ بھیجتے رہے ہیں۔ جن کی توضیح سید سمہودی نے اپنی کتاب وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ میں کسی قدر کی ہے۔ قندیلوں اور فانوسوں کی کثرت کی وجہ سے یہ مضمون ایسا وقیع ہو گیا تھا کہ اس پر امام سبکی نے ایک رسالہ تالیف کیا جس کا نام "تنزیل السکینۃ علی قنادیل المدینۃ" ہے۔ اس میں مولف نے قندیلوں کی تاریخ اور حجرۂ شریف میں ان کی روشنی کے جواز و عدم جواز پر بحث کی ہے۔

(خلاصۃ الوفا ص ۱۴۶)

کبھی کبھی بطور منت یا بغرض حصول ثواب بھی حجرہ شریف میں قندیلیں لٹکائی جاتی تھیں

---

[1] آغا کی جمع اغوات ہے۔ مسجد نبوی و مزار اقدس کے خادموں کو جو خواجہ سرا ہیں آغا کہتے ہیں۔ ان کے تفصیلی حالات ایک مستقل عنوان کے تحت میں تحریر کیے گئے ہیں۔

مثلاً الناصر محمد بن قلاؤن سلطان مصر نے جس کا عہدِ حکومت ۷۰۹ھ سے ۷۴۱ھ تک رہا ہے کی ایک بہت بڑی قندیل جس پر سنہری کام کیا ہوا تھا اور سونے کے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ تیار کرائی اور حجرۂ شریف میں اپنے ہاتھ سے اُسے لٹکایا۔

حجرۂ شریف کی قندیلیں اور فانوس کئی مرتبہ چُرائے بھی گئے ہیں۔ بعض امرائے مدینہ نے ان پر تصرف بھی کیا ہے اس طرح ان میں کمی بھی ہوتی رہی ہے۔ جن کی بھرتی پھر ہو گئی۔ ۱۲۲۸ھ میں محمد علی[1] پاشا والی مصر کے فرزند طوسون[2] پاشا نے اپنے والد کی

---

[1] محمد علی پاشا کے حالات جنت المعلّٰے کے ضمن میں تحریر کیے جا چکے ہیں۔

[2] طوسون پاشا بانی خاندان خدیویہ مصر کا منجھلا لڑکا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں جبکہ اس کی عمر صرف تیرہ چودہ سال کی تھی اُس نے مملوکوں کی جنگ میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اکتوبر ۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا نے اس لڑکے کو بری و بحری فوج کا کمانڈر بنا کر وہابیوں کے مقابلہ کے لیے حجاز روانہ کیا تھا۔ اُس نے وہاں مختلف لڑائیوں میں دادِ شجاعت دی۔ شکست کے موقعوں پر بھی اُس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی تھی۔ اوائل ۱۸۱۲ء میں جب بمقام حدیدہ پچیس ہزار وہابیوں نے آٹھ ہزار ترکوں کو شکست فاش دی تھی اُس وقت بھی یہ میدانِ جنگ میں ڈٹا رہا حالانکہ اس کے تمام ساتھی بھاگ گئے تھے اور صرف دو سوار اس کے پاس رہ گئے تھے۔ اسی طرح جنگِ طرابہ میں بھی اس نے بھوک، پیاس اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر اپنی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ یہ لڑائی نومبر ۱۸۱۳ء میں وہابیوں سے ہوئی تھی۔ اس کے دو ہزار ساتھیوں میں سے چار سو سوار بچے تھے۔ طوسون پاشا پانچ سال تک حجاز میں وہابیوں سے جنگ کرتا رہا۔ اسی دوران میں محمد علی پاشا بھی حجاز پہنچ گیا اور ان باپ بیٹوں نے بالآخر اپنی زرپاشی و حکمتِ عملی و سازشوں سے ملک حجاز وہابیوں سے واپس لے لیا۔ مدینہ منورہ و ینبوع وغیرہ مقامات طوسون پاشا کے ہاتھ پر فتح ہوئے تھے۔ ۷ نومبر ۱۸۱۵ء کو جب طوسون پاشا قاہرہ واپس گیا تو اسکے آنے کی خوشی میں مصر کو آراستہ کیا گیا۔ اور تمام ملک نے اس کمسن فاتح کا پُرجوش استقبال کیا۔ ستمبر ۱۸۱۶ء میں بمقام بندرگاہ رشید جہاں وہ ساحل کی حفاظت کے لیے ایک بڑی فوج کی کمان کر رہا تھا بیس سال کی عمر میں طاعون سے اُس کا انتقال ہوا۔

فرنگی سیاح اس کے اخلاق و فیاضی کے بہت معترف ہیں۔ وہابیوں کو بھی (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۲۷)

طرف سے خالص سونے کا ایک بڑا شمعدان اور چاندی کے دو شمعدان نذر کیے تھے۔
جن پر یہ عبارت کندہ تھی۔

"العبد المذنب محمد علی والی مصر ۱۲۳۸ھ"

۱۲۷۴ھ میں سلطان عبد المجید خاں نے دو شمعدان بھیجے تھے جن کی بلندی
قدِ آدم تھی۔ یہ خالص سونے کے تھے اور اوپر سے نیچے تک ان میں ہیرے جڑے
ہوئے تھے۔ جن کی چمک سے آنکھیں چوندھیا جاتی تھیں۔ ان کی قیمت تخمیناً اکیس لاکھ
روپیہ بتائی جاتی ہے۔ یہ دونوں شمعدان حجرۂ شریف کی گیلری میں جنوب کی طرف رکھے
ہوئے تھے۔ ایک آنحضرت ؐ کے فرق مبارک کے محاذی۔ دوسرا پائے مبارک کے قریب
ان میں بہت موٹی موٹی موم بتیاں جلتی تھیں۔ زائر ان کا پگھلا ہوا موم جو نیچے گر جاتا تھا تبرکاً
لے جاتے تھے اور وہ پیٹ کے درد کے لیے نہایت مفید ہوتا تھا۔
حیدر آباد کے وزیر اعظم نواب سر آسمان جاہ مرحوم نے بھی دو طلائی قندیلیں چڑھائی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶

اس کا اعتراف تھا کہ ترکوں کی فوج میں صرف یہی ایک بہادر تھا۔ برکھارٹ نے اس کی نسبت یہ
رائے ظاہر کی ہے کہ اپنے خاندان بھر میں صرف یہی ایک شخص تھا جس کے دل میں شریفانہ خیالات
تھے لیکن چالبازیوں میں وہ اپنے باپ اور اپنے بھائی ابراہیم پاشا سے اُسی قدر گھٹا ہوا تھا جتنا کہ
اخلاق میں بڑھا ہوا تھا۔ فنائی ایک دوسرا سیاح حجاز کہتا ہے: "کہ مارچ ۱۸۱۱ء میں جب اسکے
باپ کے حکم سے مملوک چُن چُن کر قتل کیے جا رہے تھے۔ بہت سے مملوک خاندانوں نے اپنے
تئیں اس کی حفاظت میں دیدیا۔ اور اُس نے کسی کو پناہ دینے سے انکار نہ کیا۔ یہ بڑا مروت والا
بیواؤں کا سہارا اور یتیموں کا کفیل تھا" طوسون نے اپنی وفات پر ایک چھوٹا سا لڑکا چھوڑا تھا جو
۱۸۴۹ء میں عباس پاشا اول کے نام سے خدیو مصر ہوا۔

لے حضرت غفراں مکاں نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے زمانہ میں وزیر اعظم تھے
۸ ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ سے جمادی الاول ۱۳۱۱ھ تک وزیر رہے۔ ان کا ذاتی علاقہ جو پچیس تیس لاکھ روپیہ
کا ہے اس پر اب اُن کے فرزند عالیجناب نواب معین الدولہ بہادر وزیر افواج آصفیہ قابض و متصرف ہیں۔

تھیں جو حجرہ شریف کی گیلری میں رکھی رہتی تھیں۔

یورپ کی جنگِ عمومی سے قبل گیلری کی چھت چاندی سونے کے جھاڑوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ خصوصاً روئے مبارک کے سامنے جنوبی جانب بکثرت زرین فانوس تھے جن میں سے (۳۱) فانوسوں میں جواہرات جڑے تھے اور طلائی زنجیروں میں لٹک رہے تھے۔ حجرہ شریف کے کل چراغوں کی تعداد (۱۰۶) بیان کی جاتی ہے۔ پرانے چراغوں کے علاوہ حجرہ شریف میں برقی روشنی بھی تھی۔ جب شریف حسین[1] نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ یہ قندیلیں اور فانوس کچھ ترک لے گئے۔ کچھ شریف نے جھپٹ لیے۔ اس کے بعد مدینہ پر اہلِ نجد کا قبضہ ہوا اور بجز برقی چراغوں کے اُن کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ زمانہ کا رنگ بدل گیا اب یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ جس نے پُرانی روشنی کو مدّھم کر دیا۔ برقی روشنی کے مقابلہ میں چراغ ٹمٹمانے لگے اور قندیلوں کی آنکھیں جھپک گئیں میں نے ۱۳۴۵ھ میں دیکھا ایک بڑا برقی گولا جانب جنوب مواجہہ شریفہ کے قریب گیلری میں روشن کیا جاتا ہے۔ ایک جانب شمال اور چھوٹے چھوٹے گولے مشرق و مغرب کی طرف روشن ہوتے ہیں ان کے علاوہ موم بتیاں بھی روشن کیجاتی ہیں اور بحیثیت مجموعی یہ روشنی اور مسجد کی برقی روشنی ملکر حجرہ شریف میں کافی روشنی ہو جاتی ہے۔ جس سے گیلری کی ہر چیز صاف نظر آتی ہے[2]۔

---

[1] شریف حسین پاشا ۱۳۲۳ھ میں شریف مکہ مقرر ہوا۔ ۱۳۳۲ھ میں جبکہ یورپ کی جنگِ عظیم چھڑی تو ترکوں سے بغاوت کر کے علمِ آزادی بلند کر کے سلطانِ حجاز لقب اختیار کیا۔ دس بارہ برس تک شریف حسین کی بادشاہت رہی۔ حجاز کی تاریخ میں یہ زمانہ انتہائے ظلم و استبداد کا زمانہ تھا کوئی ایسی مصیبت نہ تھی جو شریف اور اس کے بیٹے علی نے حاجیوں پر خصوصاً اور اہلِ حجاز پر عموماً نہ توڑی ہو۔ آخر ۱۳۴۳ھ میں اللہ تعالے نے اس کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور ملک حجاز جلالۃ الملک سلطان عبد العزیز ثانی ابن سعود امیر نجد کے تصرف میں آ گیا۔

[2] ۱۳۴۶ھ میں جو حاجی مدینۂ منورہ سے واپس آئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ اب حکومت حجاز نے گیلری کے اندر کی روشنی خلافِ شریعت و اسراف سمجھکر موقوف کر دی۔ البتہ مسجد کی روشنی سے یہ حصہ بھی منور رہتا ہے۔

(۲۵) مزارِ اقدس کا غلاف

سب سے پہلے ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید کی ماں خیزران[51] نے حجرے پر غلاف ڈالا تھا۔ اُس میں حزام یعنی بیچ میں ایک خوشنما پٹی بھی تھی۔

۵۵۵ھ میں حسین ابن ابی الہیجا نے جو ملک الصالح سلطانِ مصر کا خسر اور وزیر تھا۔ دیبائے سفید کا غلاف مصر سے روانہ کیا تھا۔ اس پر زرد و سرخ ریشم کے نقش و نگار تھے اس کا حزام سُرخ ریشم کا تھا جس پر سورہ یٰسین کڑھی ہوئی تھی۔ امیر مدینہ قاسم بن مہنا نے حجرے پر اس کے ڈالنے سے انکار کیا۔ کہ جب تک خلیفۂ وقت مقتضی لامر اللہ[52] اس کی اجازت نہ دے یہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ آخر خلیفہ مذکور کی اجازت کے بعد ڈالا گیا۔ اس کے چند برس بعد خلیفۂ المستضی بامر اللہ[53] نے بنفشئی رنگ کا اطلس کا غلاف بھیجا جس پر چار یار کے نام اور بادشاہِ وقت کا نام بنا ہوا تھا یہ غلاف حجرے پر ڈالا گیا اور ابن ابی الہیجا کا غلاف حضرت علی کے مزار پر ڈالنے کے لیے نجف اشرف بھیجدیا گیا۔ اس کے بعد خلیفہ ناصرلدین اللہ نے جس کا زمانہ حکومت ۵۷۵ھ سے ۶۲۲ھ تک تھا سیاہ اطلس کا ایک غلاف روانہ کیا اس کو بنفشئی غلاف کے اوپر ڈالا۔ جب خلیفہ ناصرلدین اللہ کی ماں حج سے واپس ہوئی تو اُس نے بھی اسی قسم کا ایک غلاف بھیجا جس کو سابقہ غلاف کے اوپر ڈال دیا گیا۔ ابن نجار[54] جو خلیفہ

---

[51]۔ ہارون الرشید بغداد کے خلفائے عباسیہ میں پانچواں خلیفہ ہے۔ اس کی مدت حکومت ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک ہے۔ ملکہ خیزران نے ۱۷۱ھ میں حج کیا تھا۔ مکہ و مدینہ میں اس کے بعض کام یادگار ہیں۔ ہارون الرشید کی بیگم زبیدہ کی بھی زبردست یادگار نہر زبیدہ مکہ معظمہ میں اب تک ایک فیض جاریہ ہے۔

[52]۔ اس کا زمانہ حکومت ۵۳۰ھ سے ۵۵۵ھ تک ہے۔

[53]۔ مستضی بامر اللہ ۵۶۶ھ سے ۵۷۵ھ تک خلیفہ رہا۔

[54]۔ ابن نجار محب الدین ابو عبداللہ محمد بن محمود بغدادی شافعی بڑے محدث و مورخ ہیں ان کی تاریخ بغداد مشہور ہے ان کی ولادت ۵۷۸ھ میں اور وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی۔

ناصر کے ہم عصر ہیں کہتے ہیں کہ ان کے زمانے میں حجرہ شریف پر [illegible] تین غلاف تھے ۷۶[illegible]ھ میں سلطان الصالح اسماعیل بن الناصر محمد بادشاہ مصر نے کسوہ کعبہ و کسوہ حجرہ شریف کے لیے رقم بیت المال سے ایک گاؤں خرید کر کے وقف کر دیا۔ کسوہ کعبہ ہر سال بھیجی جاتی تھی اور غلافِ حجرہ چھٹے سال یہ سیاہ دیبا کا ہوتا تھا جس پر سفید ریشم سے کتبے نقش و نگار اور دائرے کڑھے رہتے تھے۔ اور حزام پر سنہری روپہلی کام بھی ہوتا تھا۔

جب ملک مصر و حجاز سلاطین آلِ عثمان کے قبضے میں آیا[a] تو یہ خدمت ان کے ذمے ہو گئی اور ہر نئے سلطان کی تخت نشینی کے وقت قسطنطنیہ سے غلاف آنے لگا۔ چنانچہ سلطان عبد المجید خاں[2] ثانی کا تیار کرایا ہوا غلاف ۱۲۷۹ھ میں سلطان عبد العزیز خاں کے عہد میں آیا۔[3] اس کے ساتھ ایک پردہ سرخ اطلس کا بھی آیا تھا۔ جس پر آنحضرت اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے نام کڑھے تھے۔ اور یہ قبروں کے سامنے لٹکایا گیا تھا۔ اس کے بعد سبز اطلس کا غلاف جس پر سفید ریشم سے کلمہ و درود و آیات قرآنی و بادشاہِ وقت کا نام بنا ہوا ہوتا تھا آنے لگا۔ اس گنہگار نے چودھویں صدی ہجری کے زائروں کے پاس درود کڑھے ہوئے غلاف کے ٹکڑے دیکھے ہیں۔ ۱۳۴۵ھ میں جب یہ فقیر زیارت سے مشرف ہوا تو اس نے حجرہ شریف پر سبز اطلس کا غلاف دیکھا۔ جس میں سفید ریشم سے "اِنَّ اللہَ وَ ملٰئکتہ یصلّون علی النّبیّ" اور اس کے نیچے درود بنا ہوا ہے اور یہی دو چیزیں مسلسل اوپر سے نیچے تک کڑھی ہوئی ہیں۔ نیز بعض جگہ آیہ "ما کان محمدٌ ابا احدٍ الخ" اور کلمہ بنا ہوا ہے اور ان کے درمیان بہت سے دائرے ہیں جن پر آنحضرتؐ کے

---

[1] سلطان سلیم خاں اول کے زمانے میں ۹۲۴ھ میں ملک مصر و حجاز سلاطین ٹرکی کے قبضے میں آ گئے۔ سلطان سلیم کا عہد حکومت ۹۱۸ھ سے ۹۲۶ھ تک رہا۔

[2] سلطان عبد المجید خاں ثانی کا عہد حکومت ۱۲۵۵ھ سے ۱۲۷۷ھ تک رہا۔

[3] عبد العزیز کا زمانہ سلطنت ۱۲۷۷ھ سے ۱۲۹۳ھ تک ہے۔ سلطان عبد المجید خاں کی زندگی نے وفا نہ کی تو اس کا بنوایا ہوا غلاف اس کے جانشین کے زمانہ میں روانہ کیا گیا۔

اسمارِ مبارک مرقوم ہیں۔ زمین سے کوئی تین گز کی بلندی پر، آدھ گز چوڑی سرخ مخمل کی ایک پٹی جسے حزام کہتے ہیں۔ حجرے کے چاروں طرف چلی گئی ہے۔ اس پر زردوزی کے کام میں سورہ انا فتحنا کڑھی ہوئی ہے جو دیوار جنوبی سے شروع ہو کر غربی و شمالی دیوار و ہوتی ہوئی مشرقی جانب تمام ہوتی ہے۔ آخر میں اس پر بادشاہ وقت سلطان عبدالحمید خاں کا نام بھی لکھا ہے۔ حجرے کی جنوبی دیوار کے غلاف پر سرخ مخمل کے چار ٹکڑے ٹکے ہوئے ہیں۔ ان پر زردوزی حروف میں حسب ذیل کتبے کڑھے ہیں۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ‏ ‏ ‏ ‏ هذا قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم

هذا قبر ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ

هذا قبر عمر فاروق رضی اللہ عنہ

موجودہ غلاف سلطان عبدالحمید خاں کی تخت نشینی کے وقت ۱۲۹۳ھ میں آیا تھا یہ گیارہ ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ امتدادِ زمانہ سے اب اس کا سبز رنگ دھیما پڑ گیا ہے اس کے بعد سلطنتِ ٹرکی میں انقلابات ہوتے رہے اور جدید غلاف نہیں آیا۔ ۱۳۴۵ھ میں خدام حجرہ کے پاس میں نے پرانے غلاف کے ٹکڑے دیکھے تھے۔ بعض ان میں ایسے تھے جن پر کچھ بھی نہیں کڑھا تھا۔ بعض پر آیۂ مذکورہ اور درود بنا ہوا تھا۔ آدھ گز کے ایک ایک ٹکڑے کا ہدیہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ بیان کیا گیا ہے۔ حجرۂ شریف کے پرانے غلاف کی خرید فروخت کے متعلق وہی احکام ہیں جو غلاف کعبہ کے ہیں۔ پرانا غلاف شیخ الحرم کا حق ہوتا ہے۔ وہ اس غلاف کے خاص خاص حصے مثل حزام وغیرہ کے قسطنطنیہ بھیج دیتا ہے۔ وہاں شہزادوں اور بادشاہوں کے مقبروں پر ڈالے جاتے ہیں معمولی ٹکڑے خدام میں ہی تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ جو حاجیوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ مدینہ والوں نے مجھ سے بیان کیا کہ بازار میں غلاف کے مصنوعی ٹکڑے بھی فروخت ہوتے ہیں اور سبز اطلس پر سفید ریشم سے کلمہ وغیرہ مشین سے کاڑھ کر اصلی غلاف بتایا جاتا ہے۔ میں نے مدینہ منورہ کے بازار میں غلاف تلاش کیا مگر نہ اصلی دکھائی دیا نہ نقلی۔ صرف خادموں کے پاس چند ٹکڑوں کی زیارت کی جو اصلی تھے ان کی سبز زمین بہت مدھم ہو گئی تھی۔

(۲۶) جالی کے اندر کے پردے

اس کا پتہ نہیں لگتا کہ جالی مبارک پر اندر کی جانب جو پردے لٹکے ہوئے ہیں ان کی ابتداء کس زمانے سے ہوئی۔ سید جعفر برزنجی کہتے ہیں کہ ۱۲۵۲ھ میں حجرہ شریف کا جو غلاف قسطنطنیہ سے آیا تھا اس کے ساتھ جالی کے واسطے پردے بھی آئے تھے۔ ان کی سبز ریشم کی زمین تھی اور اس پر سنہری کام کیا ہوا تھا۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۳۲۵ھ میں جو پردہ انھوں نے دیکھا تھا وہ ہرے ریشم کا بالکل سادہ تھا۔ ۱۳۴۵ھ میں بھی اس فقیر نے جو پردے دیکھے وہ بھی بالکل سادہ تھے ان کا رنگ گہرا کاہی تھا کپڑا مثل ریشمی ساٹن کے تھا۔ خدام سے معلوم ہوا کہ پانچ برس قبل یہ لٹکائے گئے تھے۔ انکی کل تعداد اٹھارہ ہے۔ ہوا اور کھولنے لپٹنے کی وجہ سے یہ جلد خراب ہوجاتے ہیں اور پانچ سات برس بعد ان کے بدلنے کی ضرورت ہوجاتی ہے۔ ان پردوں کی لمبائی جالی کے بالائی حصے سے سطح زمین تک ہے۔ صبح جب مسجد میں جھاڑو ہوتی ہے تو ان کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ حجرہ شریف میں گرد نہ جائے اس کے بعد اٹھا کر ستونوں کے برنجی کنڈوں سے باندھ دیتے ہیں۔ اس طرح زائروں کو ہر وقت جالی مبارک کے اندر مشاہدہ کا موقعہ مل جاتا ہے۔

(۲۷) جالی کے اندر چھوٹے بچّوں کو پہنچانا

مدینے والوں میں دستور تھا کہ چلّے کے بعد دوشنبہ و پنجشنبہ کے دن زچائیں اپنے بچوں کو نہلا دھلا کر اور اچھے کپڑے اور پھول کے ہار پہنا کر حجرہ شریف میں داخلی کے لیے لاتی تھیں۔ بچوں کے پیٹ سے ایک ایک روٹی بندھی رہتی تھی۔ جس خواجہ سرا کی

باری اُس دن روشنی وغیرہ کے لیے جالی مبارک میں داخل ہونے کی ہوتی وہ بچے کو اپنی گود میں لیکر حجرۂ شریف کی گیلری میں داخل ہوتا تھا اور چند منٹ تک بچے کو مواجہہ شریفہ کے قریب حجرے کے غلاف میں رکھکر اُس کی ماں کے پاس پہنچا دیتا تھا۔ ان بچوں پر حاضرین مسجد اور زایروں کا ہجوم ہوتا تھا اور بچوں کے پاس کی روئی اور پھول تبرکاً لینے کے لیے ان پر گرتے تھے اور ان کو چھوتے چومتے اور پیار کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ عصر کے وقت ان بچوں کو غسل کراتے تھے اُس وقت سے دوسرے دن صبح تک یہ گم صم ہوجاتے تھے نہ دودھ پیتے تھے اور نہ بول وبراز کرتے تھے۔ یہاں والوں کا خیال ہے کہ ان بچوں کے منھ پر آنحضرت ؐ کا دستِ مبارک پھرتا ہے اس کے اثر سے ان پر یہ حالت بیخودی طاری ہوجاتی ہے۔ ایک بدعقیدہ شخص نے مجھ سے کہا کہ بچوں کو کوئی مخدّر دوا کھلادی جاتی تھی جس سے وہ انٹاغفیل ہوجاتے تھے۔ سنہ ۱۳۴۵ھ میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل نجد نے اس رسم کی ممانعت کردی ہے کہ ایسے ناسمجھ بچوں کو جو اپنی حوائج پر قابو نہ رکھتے ہوں حجرہ شریف میں پہنچانا خلافِ ادب واحتیاط ہے۔

(۲۸) حجرۂ شریف کی کنجی اور بچے

جس طرح بیت اللہ کی کنجی کے متعلق کئی سو برس سے یہ خیال چلا آرہا ہے کہ جو بچہ گونگا۔ ہکلا۔ یا الکن ہو اُس کے منھ میں کلید کعبہ دینے سے فصیح وبلیغ ہوجاتا ہے۔ اسی قسم کا خیال حجرہ مزار اقدس کی کنجی کی نسبت بھی ہے اور خوش عقیدہ لوگ تبرکاً یہ کنجی بچوں کے منھ میں دیتے ہیں۔ لوگوں کا تجربہ ہے کہ اس کی برکت سے بہت سے ایسے بچے فصاحت کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ اس معجزے سے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ منکرین معجزہ غور کریں کہ قوت ارادی وخیالی کے دنیا میں کیا کیا کرشمے ہورہے ہیں۔ میرا چھوٹا لڑکا محسن دس گیارہ برس کی عمر تک تُتلاتا تھا بہت سی تدبیریں کی گئیں مگر یہ عیب کسی طرح رفع نہ ہوا

آخر اس نے ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھے اور یہ تہیہ کی کہ شاید اس کی برکت سے توتلا پن دور ہو جائے۔ خدا کی قدرت کہ دس پانچ روزوں کے بعد اس کا یہ نقص جاتا رہا۔

(۲۹) مزار اقدس کا غسل

حجرۂ شریف کی دیواروں اور گیلری کو سال میں تین بار دھوتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۹۔ ربیع الاول کو۔ دوسری بار یکم رجب کو پھر ۱۸/ ذیقعدہ کو۔ اگر آندھی وغیرہ کی وجہ سے ضرورت ہو جائے تو ان تاریخوں کے علاوہ بھی غسل دیتے ہیں۔ غسل کے وقت حجرۂ شریف کے گرد بڑا مجمع ہوتا ہے اور غسل کا پانی لوگ شیشیوں میں بھر بھر کر تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں۔

(۳۰) حجرے کی دیواروں سے عطر ملنا

حجرۂ شریف کی دیواروں پر عطر ملنے کی رسم بہت قدیم ہے۔ سب سے پہلے خلیفہ ہارون الرشید کی ماں خیزران نے جو ۱۷۰ھ میں زیارت کے لیے مدینۂ منورہ گئی تھی اپنی ایک کنیز مونسہ نامی سے حجرے کی دیواروں پر عطر ملوایا تھا۔ سید سمہودی کے زمانہ (نویں صدی) میں یہ طریقہ موقوف ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دسویں صدی ہجری میں سلاطین عثمانیہ نے پھر جاری کیا۔ اور محمل شامی کے ساتھ جہاں دوسری بہت سی چیزیں مدینۂ منورہ بھیجی جاتی تھیں۔ عطر و عود و عنبر بھی آتا تھا۔ بعض زایرین بھی اپنے گھروں سے عطر لے کر چلتے ہیں۔ اور حجرے کی دیواروں پر ملنے کے لیے خادموں کی نذر کرتے ہیں اہل نجد نے بھی اس طریقہ کو

برقرار رکھا ہے۔ [illegible] میں احقر نے دیکھا کہ شام کے وقت گیلری کا فرش عرقِ گلاب سے دھویا جاتا ہے۔ خدام روشنی کرنے حجرے کی دیواروں میں عطر ملنے اور عود بتیاں سلگانے کے لیے گیلری کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہاں کی معطر و معنبر ہوا دماغ پر ایک خاص کیفیت و سرور پیدا کرتی ہے۔ اور عود و عنبر کی مہک اور عطر کی لپٹیں زائرین کو کسی اور ہی عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔ خوش عقیدہ شخص کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔

کیوں عطر میں ڈوبی ہوئی آتی ہیں ہوائیں
طیبہ ہی کی سرحد میں مگر خلدِ بریں ہے

جس وقت خدام اپنے فرائض انجام دے کر حجرۂ شریف سے باہر نکلتے ہیں تو عاشقانِ رسول مصافحہ کرنے کے لیے دیوانہ وار اُن کی طرف جھپٹتے ہیں۔ دس بارہ سال قبل میں نے زائروں کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔ خدام حجرۂ شریف کے مدارج و مراتب کا اس پر قیاس فرمالیجئے۔

کس زمیں کی خاکِ عطر افشاں سے گزرے حاجیو
مجھ کو تم سے آتی ہے جنت کے پھولوں کی ہوا

---

(۳۱) مزارِ اقدس کے خدام و اغوات

حجرۂ شریف کی نگرانی۔ جاروب کشی۔ روشنی و صفائی اور انتظام کے لیے دو قسم کے ملازم مامور ہیں۔ ایک تو معمولی اہلِ مدینہ یا مہاجر دوسرے خواجہ سرا یعنی خوجے[1] جن کو اغوات کہتے ہیں۔

---

[1] عہدِ مصری و بابلی سے اس وقت تک خوجوں کا دستور چلا آ رہا ہے۔ یونانی مورخ ہیرو دوٹس ان کا موجد ایرانی بادشاہوں کو بتاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے محلات کے ساتھ ساتھ خواجہ سراؤں کا نام بھی چلا آتا ہے۔ لفظ خواجہ بگڑ کر خوجہ ہو گیا ہے (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۳۶)

تعظیماً ان کو آغا (آقا) کہتے ہیں۔ آغا کی جمع اغوات ہے۔ علامہ ابن سلیمان اپنی کتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۵)

روم کے عیسائی بادشاہوں میں بھی خوجے بڑا رسوخ رکھتے تھے۔ ایشیا و یورپ دونوں جگہ ان کو سلطنت میں بعض اوقات بڑے بڑے عہدے ملتے رہے ہیں۔ علاء الدین خلجی کا سپہ سالار ملک کافور فاتح دکن دنیا میں مشہور ہے۔ اسیطرح شہنشاہ روم جسٹینین کا قانون [illegible] یورپ میں خاص شہرت رکھتا ہے۔

خوجے بنانے کا طریقہ زمانہ جاہلیت کی وحشیانہ رسوم کی یادگار ہے اور غالباً یہ افریقہ والوں کی ایجاد ہے۔ وہاں سے ایشیا ہوتا ہوا یورپ پہنچا۔ اٹلی، یونان و انگلستان فرانس میں خوجے گانے والوں کا کام دیتے تھے اور عموماً اسی غرض سے ان کو خوجہ بنایا جاتا تھا۔ محض آواز باریک ہو جانے کے خیال سے اٹلی میں اٹھارہویں صدی عیسوی تک باوجود پاپائے روم کی مخالفت اور قانونی روک تھام کے چار ہزار لڑکے سالانہ گانے کے لیے خوجے بنائے جاتے تھے جب پوپ سینٹ دہم ۱۸۷۸ء میں مسند نشین ہوا تو اس نے قطعی احکام جاری کیے اور اس وقت سے یہ طریقہ موقوف ہوا۔ قبل بلوغ خوجہ بنا دینے سے رجولیت کم ہو جاتی ہے اور اکثر باتوں میں زنان پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاڑھی مونچھیں نکلتی ہی نہیں اور اگر نکلتی بھی ہیں تو بہت کم۔ بعد بلوغ اگر کسی کو خوجہ کیا جائے تو اس کی آواز بتدریج گھٹتی ہے۔ اور رجولیت ضایع ہونے میں کچھ عرصہ لگتا ہے۔ چونکہ اس عمل سے اکثر لڑکے مر جاتے ہیں۔ اس وجہ سے معمولی غلاموں سے خوجے غلام کی قیمت بھی چوگنی ہوتی ہے۔ عموماً شمالی و مشرقی افریقہ میں۔ غلاموں کو خوجہ بنایا جاتا تھا۔ وہاں سے دور دراز مقامات پر ان کو بھیجتے تھے۔ بعض لوگ پرہیزگاری کے خیال سے بھی خوجے بن جاتے تھے۔ تیسری صدی عیسوی میں یورپ میں اس خیال کے لوگ بہت تھے روس میں اب بھی ایک بہت بڑا فرقہ موجود ہے۔ جو ہٹری نامی کسی درویش کی تقلید میں خوجہ بنتا ہے۔

ے۔ چونکہ ان لوگوں کا مردوں میں شمار نہیں ہے۔ اس لیے مونث جمع بنا دی گئی۔

ذخیرۃ النافع میں لکھتے ہیں کہ حجرۂ شریف کے تقدس کے خیال سے سب سے پہلے سلطان نور الدین محمود شہید بادشاہ شام و مصر نے یہاں خوجے مامور کرنے کا ارادہ کیا۔ اس بارے میں اس کے وزراء نے بھی مدد کی۔ اور بارہ خوجے جو حافظ قرآن و عابد و زاہد تھے مدینہ منورہ روانہ کیے۔ ان کے انتخاب کے وقت یہ امر بھی ملحوظ رکھا کہ وہ اہل حبش سے ہوں۔ رومی۔ تکروری۔ یا ہندوستانی ہوں۔

اس کے بعد سلطان صلاح الدین بن ایوب فاتح بیت المقدس نے بارہ خوجے اور بھیجے بعض کہتے ہیں کہ اولاً سلطان صلاح الدین نے ہی چوبیس خوجے روانہ کیے تھے اور ان کی تنخواہوں کے مصارف کے واسطے مصر صعید میں دریائے نیل کے کنارے دو گاؤں نقادہ و قبالہ اور قریہ سندبیس کی ایک تہائی آمدنی وقف کردی تھی۔ ان خوجوں کا سردار بدر الدین الاسدی تھا۔ جب ملک الصالح کا زمانہ آیا تو اس نے قریہ سندبیس کی باقی دو ثلث آمدنی بھی ان کے اخراجات کے لیے وقف کردی۔ اس کے بعد سلاطین مغرب و شاہان سوڈان نے خوجے روانہ کیے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد ایک سو ہو گئی اور ملازمین وغیرہ ملا کر دو سو ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ قیود جو شروع میں عائد کیے گئے تھے سب اٹھ گئے اور بڑی تعداد یہاں کے اغوات میں ہندیوں کی ہو گئی۔

(نزہۃ الناظرین صفحہ ۹ و مراۃ الحرمین جلد اول ص۔)

حجرۂ شریف کے خوجے ملازموں کی تین قسمیں ہیں۔ اول بواب جن کا کام محض نگرانی یا پاسبانی ہے۔ دوسرے خبزیہ جو مسجد نبوی کے اندرونی حصوں اور حجرۂ شریف کی جاروب کشی

۱۔ اس بادشاہ کا مجمل تذکرہ قبل ازیں ذکر خندق الرصاص میں تحریر کیا جا چکا ہے۔

۲۔ تکروری افریقہ کے باشندے اور حبشیوں ہی کی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر ان سے زیادہ وحشی اور نیم برہنہ۔ حجاز میں یہ لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں اور بڑے غریب ہوتے ہیں۔ ان کے مرد بھی ایک تہمت باندھتے ہیں اور عورتیں بھی صرف ایک تہمت سینہ کے اوپر باندھتی ہیں۔ عورتوں کے سر پر بال بھی نہیں ہوتے اس لیے سرسری نظر میں عورت مرد میں مشکل سے تمیز ہوتی ہے۔

۳۔ مغرب سے مراد اسپین ہے۔

کرتے ہیں۔ تیسرے بطابین جن کے ذمے فراشی۔ صفائی اور ہر قسم کے معمولی ادنےٰ کام ہیں۔ ان تینوں گروہوں میں ہر گروہ کا ایک ایک شیخ علیحدہ ہے جس کو مستلم یعنے داروغہ کہتے ہیں۔ خوجے چونکہ عالم انسانیت سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا جسم بھی غیر فطرتی ہو جاتا ہے۔ یہ عموماً حبشی ہوتے ہیں۔ ڈاڑھی مونچھیں ان کے نکلتی نہیں۔ خوجے ہو جانے سے ان کی شکل و شمائل بہت ہی مہیب ہو جاتی ہے۔ ان کے کالے جھریوں دار نیچے کی طرف کھچے ہوئے چہرے۔ موٹے ہونٹ۔ سفید دانت۔ لمبے قد۔ مُردوں کا سا ڈھانچ بدن۔ پتلے دبلے سوکھے ہاتھ پاؤں اغوات کی کھلی ہوئی علامتیں ہیں۔ ان کی آواز مردانہ تو رہتی ہی نہیں مگر عورتوں کی سی بھی نہیں ہوتی۔ ان کا مزاج تلخ اور لہجہ درشت ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ اپنے مریل جسموں کو چھپانے کے لیے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتے ہیں۔ مگر ایک نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کپڑوں کے اندر ہڈیوں کا ہار ہے۔ ان کا لباس بھی خاص قسم کا ہوتا ہے۔ یہ سر سے پاؤں تک سفید رہتے ہیں۔ ان کی قبائیں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ دو خوجے ان میں چھپ سکیں۔ آستینیں ہاتھ بھر چوڑی ہوتی ہیں۔ اور اتنی بڑی کہ چھوڑیں تو انگلیوں سے آدھ گز نیچے لٹکنے لگیں۔ سر پر ہندوستان کے فوجیوں کے سے فٹ فٹ بھر اونچے سفید عمامے باندھتے ہیں۔ کمر سے پٹکے لپیٹتے ہیں جن کے نیچے نیچے دونوں پلو لٹکتے رہتے ہیں۔ ہاتھوں میں لمبی لمبی لکڑیاں رکھتے ہیں۔

اغوات اپنی خدمت کی وجہ سے مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ عوام و حاجی ان کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آتے ہیں اور بادشاہ و شہزادے تک ان کے ہاتھ چومتے ہیں۔

برکھارٹ جو ۱۲۳۲ھ میں مدینہ گیا تھا۔ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ باب عالی سے جس طرح جدے کا والی بطور سزا کے بھیجا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی بڑے خواجہ سرا کو بھی سزا دینے کے لیے جلا وطن کر کے مدینے بھیجدیتے ہیں۔ اس کے زمانہ کا شیخ الاغوات ایک بڑے مرتبہ کا شخص تھا جو ہز ہائینس کے درجے تک پہنچا تھا۔ یہ لوگ نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے مکانوں میں فرنیچر و ساز و سامان امیرانہ ہوتا ہے۔ جوان اغوات زر خرید لونڈیوں سے شادی بھی کرتے ہیں۔ مسجد نبوی ؐ کے جانب مشرق محلہ حارۃ الاغوات میں

ان کے مکانات ہیں۔ مسجد نبوی میں جانب شمال ان کے اٹھنے بیٹھنے کے لیے ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ جسے دکتہ الاغوات کہتے ہیں۔ سامان وغیرہ رکھنے کو ایک حجرہ بھی ان کے لیے مخصوص ہے۔ اغوات میں قوت انتظامی بہت ہوتی ہے۔ ان کی بے مروتی وقساوت قلبی بھی ان کے خاص جوہر ہیں۔ بہادری کے اوصاف بھی ان میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ ضرورت کے وقت ہتیار خوب چلاتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں اور اہل مدینہ میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہے ہیں۔ اور پٹیا کے ہاتھ جھاڑنے اور سیف کے ہاتھ نکالنے میں جواں مردوں سے کبھی کم نہیں رہے۔

حجرہ شریف کے اغوات کی تعداد مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہے۔ فوتی فراری کی وجہ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی بھرتی بھی ہو جاتی ہے۔ ۱۲۳۲ھ میں برکھارٹ نے ان کی تعداد چالیس پچاس لکھی ہے۔ ۱۲۶۹ھ میں جبکہ مشہور فرنگی سیاح برٹن نے مدینے کا سفر کیا تھا۔ اس وقت (۱۲۰) تھے۔ ۱۳۲۱ھ میں صاحب مراۃ الحرمین نے ان کی تعداد (۵۷) بتائی ہے۔ ۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار مدینے گیا تھا معلوم ہوا کہ گزشتہ پندرہ سولہ برس میں ان کی تعداد امراض وقحط وجنگ کی وجہ سے بہت گھٹ گئی۔ اور اب صرف (۲۸) اغوات رہ گئے ہیں۔ عرصہ دراز سے کوئی نیا آغا آیا بھی نہیں۔ موجود ہیں (۲۷) حبشی ہیں ایک بخاری ہے اس کا نام حسن آغا ہے۔ اس کو بخارا کے کسی امیر نے حجرہ شریف کی خدمت کے لیے بھیجا تھا بمقابلہ دوسرے اغوات کے اس کی شکل وشمائل اتنی بھونڈی نہیں ہے اس کے چہرے پر کچھ گوشت بھی ہے اور اس کا بدن بھی نری ہڈیوں کی مالا نہیں ہے۔ اس کی عمر کوئی پچاس سال ہے حبشی اغوات میں سب سے زیادہ بڈھا عبداللطیف آغا ہے۔ اس کو سلطان عبدالحمید خاں نے بھیجا تھا صورت وشکل میں یہ اغوات کا خالص نمونہ ہے۔

شرعاً ان لوگوں کو حجرہ شریف یا مسجد نبوی یا بیت اللہ کی خدمت کے لیے متعین کرنا بدعت ہے۔ مگر انتظاماً ان مقامات پر ان کی تعیناتی مناسب سمجھی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ بہت سی مکروہات سے یہ مبرا ہوتے ہیں۔ عورتیں جو زیارت کے لیے آتی ہیں۔ ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو ایک جگہ سے اٹھانے اور کہیں دوسری جگہ بٹھانے میں ان کو

چھو بھی سکتے ہیں اور یہ کام ایسے ہیں جو دوسرے مرد ملازم نہیں کر سکتے۔

ترکوں کے زمانے میں معمولی اغوات کی تنخواہ بیس پچیس روپیہ ماہوار سے لگا کر چالیس پچاس تک اور ان کے شیوخ کی تنخواہیں پچاس ساٹھ سے سو روپے تک تھیں شیخ الحرم یعنی ان سب کا صدر چار سو روپیہ ماہوار پاتا تھا۔ اس زمانے میں ملک کی آمدنی کے لحاظ سے ان کی تنخواہوں میں کمی کر دی گئی ہے۔ قرشوں کے حساب سے ان کو ملتا ہے۔ معمولی خوجوں کو بیس پچیس روپیہ ماہوار ہے۔ اغوات کے شیوخ تخمیناً تیس تیس روپیہ پاتے ہیں اور شیخ الحرم آغا محمد سرور کی تنخواہ کوئی ڈھائی سو روپیہ مہینہ ہے۔

پیشتر اغوات کو اسلامی ممالک سے نذرانے اور تحفے تحائف بھی بہت آتے رہتے تھے اور حاجی و زائرین بھی ان کو کچھ نہ کچھ نذر کرتے رہتے تھے۔ اب سلطان کے لیڈروں اور بعض عالموں کی مہربانی سے اس زمانے میں حج و زیارت ہی حرام ہے ان کو کون بھیجے۔ جو لوگ زیارت کو جاتے ہیں ان سے جو کچھ بن پڑتا ہے ان کو بھی دیدیتے ہیں۔ میں نے بعض اغوات سے باتیں کیں ان کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

یہ لوگ وہابیوں کے اتنے شاکی نہیں ہیں جتنے ہمارے مولویوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے۔

(۳۲) حضرت شفیع المذنبین کی خدمت میں ایک گنہگار کی حاضری

۱۳۴۴ھ میں جب اللہ تعالیٰ نے اس گنہگار کو حج و زیارت کی توفیق عطا کی۔ تو غلبۂ شوق و جوش مسرت سے بے اختیار یہ شعر زبان پر آگیا۔

بخت بیدار مدینے لیے جاتا ہے مجھے
ہر طرف کعبہ ہی کعبہ نظر آتا ہے مجھے[1]

اسی دھن میں مکہ معظمہ پہنچا۔ مگر بحری سفر کی ناموافقت سے بیماری میرے ساتھ تھی۔ اور ناتوانی میرے ہمراہ۔ حج کے بعد ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ کو سب سے پہلی موٹر جو مکے سے مدینے روانہ ہوئی۔ اس میں اس فقیر کو بھی جگہ مل گئی تھی۔ اس وقت بھی ضعف میرا رفیق اور شوق میرا رہنما تھا۔ جب ہماری موٹر مدینے کے کوہ وصحرا میں سپاٹے بھرتی چلی جا رہی تھی میں یہ اشعار گنگنا رہا تھا اور ان کا ہر لفظ میرے لیے حدی خوانی[3] کا کام کر رہا تھا۔

---

[1]۔ آخر میں یہ ایک غزل ہو گئی جس کے دو شعر یہ ہیں:-

خاکِ صحرائے عرب ہے مری قومی تاریخ — ذرہ ذرہ یہاں اخبار سناتا ہے مجھے
رہ نوردانِ حجازی کی یہ ہمت دیکھو — بحرِ زخار بھی قطرہ نظر آتا ہے مجھے

[2]۔ جاتے وقت سمندر کی آب و ہوا مجھے بہت ناموافق آئی تھی جس سے ایک بدترین قسم کا ضیق النفس ہو گیا تھا اس کے ساتھ اختلاج قلب و ضعف دماغ وغیرہ مختلف عارضے اٹھ کھڑے ہوئے تھے جب میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں تو بہت بیمار اور نہایت کمزور تھا۔ مگر الحاج پروفیسر مولوی محمد الیاس صاحب برنی قادری الچشتی کی دعا و دوا کی برکت۔ حاجی حکیم بشیر احمد صاحب طبیب خانہ حیدرآباد کی توجہ اور حاجی عبدالقادر صاحب محاسب محکمہ آرائش بلدہ حیدرآباد کی زبردست ہمدردی سے اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت و سکون قلب بخشا۔ تمام مناسک حج و مراتب زیارت میں نے ادا کیے جن سے ملنے کا تھا ملا اور جو کچھ دیکھنے کا تھا دیکھا۔ الحمد للہ الحمد للہ۔

[3]۔ حدی ان گیتوں کو کہتے ہیں جو ساربان اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے گاتے ہیں۔ ان کے اثر سے اونٹوں پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پھر نہ ان کو تکان معلوم ہوتی ہے اور نہ بوجھ۔ جھوم جھوم کر منزل طے کرنے لگتے ہیں۔ اور سست قدم میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ عرفی کا یہ شعر یاد رکھنے کے قابل ہے۔

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

اب مدینے حاجیوں کا کارواں آنیکو ہے ۔۔۔ یا محمد اک ہجوم عاشقاں آنے کو ہے

تو نے وہ بخشی ہے قوت ادھوائے یثربی ۔۔۔ جو کڑی بھرتا ہوا ہر ناتواں آنے کو ہے

کھینچ مشتاقوں کو اپنے اے مبارک سرزمیں ۔۔۔ قافلہ پردیسیوں کا میہماں آنے کو ہے

سفر حج سے اکیس برس قبل جو خواب میں نے دیکھا تھا اس کی تعبیر اب پوری ہوئی جب وہ شعر میں نے کہے تھے اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ چوکڑی بھرنے والا ناتوان حاجی میں ہی ہوں گا۔ اور میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی تصدیق اس وقت ہو گی جب حجاز میں موٹریں چلنے لگیں گی۔ جل جلالہ میں سمجھا تھا کہ مدینے پہنچکر میں اپنی کیفیت دلی واردات قلبی کو نظم کر سکوں گا اور وہاں میرا قال کچھ حال کی صورت اختیار کرے گا۔ مگر میں اُس افصح العرب کے دربار میں بالکل عجم (گونگا) بن گیا سوائے ان دو شعروں کے جو حوالی مدینے میں ہو گئے تھے ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

درِ اقدس پہ ہم اے شاہ اُمم پہنچے ہیں ۔۔۔ اللہ اللہ کہاں اپنے قدم پہنچے ہیں

تشنگی اب تو ہماری بھی بجھانی ہو گی ۔۔۔ تیرے ساحل پہ ہم اے بحر کرم پہنچے ہیں

اب یہ گنہگار حضرت شفیع المذنبین کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔

سلاموں کا تحفہ دل میں۔ کتاب زیارت ساتھ۔ ایک خطاوار حرم اقدس کی طرف چلا جا رہا ہے۔ باب جبریل میں قدم رکھا اب پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ جوں توں مسجد کے مشرق رویہ دالان سے گزرتا ہوا حجرۂ شریف کے قریب پہنچ گیا۔ اس طرف حضور سرور عالم کی پائنتی ہے۔ عقل کہتی ہے۔

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ ست

شوق کہہ رہا ہے

زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

آخر ایک بزرگ مطوف نے اس سیہ کار کو باب التوبہ پر پہنچا دیا۔ اب مواجہہ شریف سامنے ہے۔ ایک نالائق غلام اپنے آقا کے حضور میں سر جھکائے کھڑا ہے۔ اب اس کے ہوش بجا نہیں رہے۔ اس کی زبان میں تشنج اور ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ اِس کو تاب

سلام یا درہانہ صلواۃ۔ اس کا بدن کانپ رہا ہے اور آنکھیں مینہ برسا رہی ہیں۔ اس کا مزدور سلطانِ دوجہاں کی خدمت میں سلام عرض کر رہا ہے اور یہ ہچکیاں لے لیکر اس کا ساتھ دے رہا ہے:۔

السّلام علیك ایھا النّبی۔ السّید الکریم والرسول العظیم والحبیب الرؤف الرّحیم ورحمة الله وبرکاتہ۔ الصّلوٰة والسّلام علیك یا سیدنا ومولانا الصّلوٰة والسّلام علیك یا شفیع المذنبین الصّلوٰة والسّلام علیك یامن ارسلہ الله تعالیٰ رحمة للعالمین۔ الصّلوٰة والسّلام علیك یا محمّد بن عبد الله بن عبد المطلب ابن ھاشم۔ یاطٰہٰ۔ یا یٰسین۔ یا مقدم جیش الانبیاء والمرسلین وھا انا یا سیّدی یا رسول الله۔ قد جئتك ھاربًا من ذنوبی ومن علمی ومستشفعًا ومستجیرًا بك الیٰ ربّی۔ فاشفع لی یا شفیع الامّة۔ اشفع لی یاکاشف الغمّة یا سراج الظلمة۔ اجرنی من النار۔ یانبیّ الرّحمة۔ یا رسول الله آتیناك زائرین وقصدناك راغبین۔ وعلیٰ بابك العالی واقفین وبحقك عارفین فلا تردنا خائبین ولا عن باب شفاعتك محرومین اشھد انّك یا رسول الله قد بلّغت الرّسالة وادّیت الامانة ونصحت الامّة وکشفت الغمّة وجلیت الظلمة وجاھدت فی سبیل الله حق جھادہ وعبدّت ربك حتیٰ اتاك الیقین۔ جزاك الله تعالیٰ عنّا وعن والدینا وعن الاسلام خیر الجزاء۔ ونسئلك الشّفاعة۔ ان تشفع لنا عند الله یوم العرض۔ یوم الفزع الاکبر۔ یوم لا ینفع مال ولا بنون۔ اشفع لنا ولوالدینا ولجیراننا ولمن احسن الینا ولمن اوصانا وقلدنا عندك بہ دعاء الخیر والزیارة۔ الصلوٰة والسلام علیك یا سلطان الانبیاء والمرسلین ورحمة الله وبرکاتہ۔

ترجمہ[۱]۔ اے نبی ص۔ اے مہربان سردار۔ اے عظیم الشان پیغمبر۔ اے خدا کے حبیب۔ اے امت پر شفقت و رحمت کرنے والے آپ پر خدا کی رحمت اور برکتیں نازل ہوں۔ اے

---

[۱]۔ عربی کی مقفیٰ عبارت اور اس کی تاثیر اردو میں نہیں آسکتی پھر بھی یہ ترجمہ دلوں کو پگھلا دینے کیلیے کافی ہے

ہمارے آقا۔ اے ہمارے مولا آپ پر سلام۔ اے گنہگاروں کی خدا سے شفاعت کرنیوالے آپ کی ذات اہلِ عالم کے لیے خدا کی رحمت ہے۔ آپ پر سلام۔ اے محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ابن ہاشم اے طٰہٰ۔ اے یٰسین۔ اے فوج انبیاء کے سرلشکر آپ پر رحمت وسلام۔

اے میرے سرکار اب مجھ پر نظرِ عنایت ہو جائے۔ میں نے اپنے گناہوں اور بداعمالیوں سے بھاگ کر آپ کے در پر پناہ لی ہے۔ اب آپ کی مدد درکار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ سے آپ میری شفاعت فرمائیں گے۔ اے شافع امت اے مایوسی کو دور کرنے والے اب میری سفارش کیجیے۔ اے اندھیرے کے چراغ۔ اے نبی رحمت مجھے آتشِ دوزخ سے بچائیے۔ یا رسول اللہ۔ ہم آپ کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ ہمارا اشتیاق ہمیں یہاں تک کھینچ کر لایا ہے۔ آپ کے آستانہ پر ہم مقیم ہیں آپ کے مرتبہ کو ہم پہچانتے ہیں۔ ہم کو ناکام واپس نہ کیجیے۔ اپنے دروازے سے ہمیں خالی نہ پھیریے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے خدا کا پیغام ہم تک پہنچا دیا۔ آپ نے اپنی امانت ادا کر دی۔ آپ نے امت کو نصیحت فرمائی۔ جہالت کی گھٹا کو دور کیا۔ اندھیرے کو اُجالا بنا دیا۔ اللہ کی راہ میں آپ نے وہ کوشش کی جو کوشش کا حق تھا اور آخر دم تک آپ عبادت الٰہی میں مصروف رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے۔ ہمارے والدین کی طرف سے اور دینِ اسلام کی طرف سے جزائے خیر دے۔

جس دن نامہ اعمال پیش ہوں اور جب نہ مال کام آئیگا نہ اولاد اور جو بڑا خوفناک دن ہوگا اس روز آپ ہماری۔ ہمارے والدین کی ہمارے محسنوں کی۔ ہمارے پڑوسیوں کی اور جنھوں نے ہم سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچا دینے کی خواہش کی ہے۔ اُن سب کی شفاعت فرمائیے گا۔ اے نبیوں کے سرتاج آپ پر درود وسلام۔ آپ پر خدا کی رحمت وبرکت۔

میرا پہلا دن بیخودی وبیہوشی میں گزرا۔ دوسرے روز مجھے ہوش آیا۔ اور اب میں سمجھا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں اب مجھے کسی مرشد و رہنما کی ضرورت نہ تھی۔ حضرت

رؤف ورحیم کی شفقت نے مجھے گستاخ بنا دیا تھا۔ روزانہ دس بارہ گھنٹے حضرت کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ہر طرف الا گھلا پھرتا تھا۔ مزار اقدس کے قریب جہاں چاہتا تھا بیٹھ جاتا تھا۔ پہروں تک تجلیات ربانی و انوار الٰہی کا مشاہدہ کیا کرتا تھا اور عربی فارسی اردو جس زبان میں چاہتا تھا سلام عرض کرتا تھا۔ میں نے کوئی پندرہ برس قبل منت مانی تھی کہ اگر اس آستانہ پر میری رسائی ہو گی تو یہ سلام پڑھوں گا۔ الحمد للہ میں وہاں پہنچا اور میں نے عرض کیا۔

یا حبیبِ خدا سلام علیک — یا شفیع الوریٰ سلام علیک
رہبر و رہنما سلام علیک — مرشد و پیشوا سلام علیک
وعلیک السلام یا ہادی — یا امام الہدیٰ سلام علیک
زبدۂ کائنات صلِّ علیٰ — فخرِ ارض و سما سلام علیک
مرحبا یا مدثر و طٰہٰ — احمدِ مجتبیٰ سلام علیک
سید المرسلین تعالیٰ اللہ — خاتم الانبیا سلام علیک
قاطع کفر و شرک صلی اللہ — شیرِ دشتِ وغا سلام علیک
حبذا شاہ مسندِ الفقر — خرقہ پوشِ رضا سلام علیک
معدنِ خُلق و منبع رحمت — بحرِ حلم و حیا سلام علیک
قبلۂ دین و کعبۂ ایمان — مرجعِ اصفیا سلام علیک
افتخار زمین درود و سلام — نورِ عرش العلیٰ سلام علیک
التحیات یا رسول اللہ — یا شہِ دوسرا سلام علیک
مصدرِ وحی و مہبطِ جبرئیل — مرکزِ حق نما سلام علیک
بارک اللہ شافعِ محشر — صدرِ روزِ جزا سلام علیک

دست بستہ بصد ادب شبیرؔ
کہہ رہا ہے شہا سلام علیک

ایک دن میں نے عالمِ شوریدگی میں یہ غزل پڑھی۔ میری حالت غیر تھی اور سننے والوں پر بھی خاص اثر تھا۔

الٰہی یہ ہیں مرے سامنے ہے درِ رسالت مآب کیسا
میں جاگتا ہوں کہ سو رہا ہوں یہ دیکھتا ہوں میں خواب کیسا
کہاں یہ شبیر پُرمعاصی کہاں جنابِ رسول ہاشمی
ہوئی ہے کایا پلیٹ یہ کیسی ہوا ہے یہ انقلاب کیسا
جو میں ہوں محو ملوانِ کعبہ تو دل ہے مصروف سیرِ طیبہ
یہ دو دو ہاتھوں سے لوٹتا ہوں جنابِ عالی ثواب کیسا
حضور میرے امام میرے جنابِ خیر الانام میرے
بنا دو اب سارے کام میرے غلام پر ہے عتاب کیسا
ہزار تم سے جدا پڑا ہوں اسیرِ حرص و ہوا پڑا ہوں
مگر جو در پر اب آ پڑا ہوں تو مجھ پہ شاہا عذاب کیسا
اگرچہ کی ہیں بہت خطائیں بجا ہے بھگتیں جو ہم سزائیں
مگر جو سرکار بخشوائیں تو عیب کیسا صواب کیسا
متاعِ عصیاں کو ہم نے بیچا تمہاری رحمت نے ہے خریدا
ہوا ہے سب لین دین پورا ہمارے ذمے حساب کیسا
تمہارا جب نام لے کے شاہا گھسیں گے جنت میں بے تحاشا
تو منہ تکیں گے ملک ہمارا سوال کس کا جواب کیسا

ایک مرتبہ جالی مبارک سے منہ لگا کر میں اپنی ایک نظم کے دو شعر پڑھ رہا تھا اور اس کے الفاظ "صلے اللہ علیہ وسلم" کو ایک خاص لہجے میں بار بار دُہرا کر فقیروں کی طرح ضربیں لگا رہا تھا۔ ایک وہابی سپاہی میرے قریب آ کر سننے لگا۔ جب میں نے اُسے سمجھایا کہ میں حضرت کی خدمت میں کیا عرض کر رہا ہوں تو وہ بھی جھومنے لگا اور میرے ساتھ ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" "صلی اللہ علیہ وسلم" کہنے لگا وہ اشعار یہ تھے۔

سرورِ عالم احمدِ مرسل صلے اللہ علیہ وسلم
ختمِ رسالت اکبر و اکمل صلی اللہ علیہ وسلم

ہاتھ میں اُن کے دوزخ وجنت سر پر اُن کے تاجِ شفاعت
پھر اس پر اوڑھیں کالا کمل صلّی اللہ علیہ وسلّم

مدت ہوئی میں نے ایک غزل لکھی تھی جس کا مقطع مجھے ہمیشہ کھٹکتا تھا میں جذبات مذہبی کے اظہار میں مبالغہ جائز سمجھتا ہوں لیکن اپنے ہی متعلق تعلّی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ عالمِ تصور میں ایک بڑی بات منہ سے نکل گئی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ جب میں اُس دربار میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرا دعویٰ بالکل بے دلیل نہ تھا۔ وہ غزل یہ تھی۔

مدینے جو مرا پہنچا دے ایک بار سلام — کروں ادب سے میں جھک جھک کے اُسکو چار سلام
صبا تو روضۂ اقدس پہ میری جانب سے — بصد ہزار ادب عرض کر ہزار سلام
غریب پہنچے نہ دربارِ شاہِ طیبہ تک — وطن ہی آگئے کر کر کے مالدار سلام
حضورِ سرورِ عالم بلائیے اس کو — پڑھے غلام بھی آ کر سرِ مزار سلام

بہادوں آنکھوں سے تشبیہِ چشمۂ زمزم
پڑھوں جو روضے پہ رو رو کے زار زار سلام

یہ گنہگار، ۱۷ ذی حجہ ۱۳۴۵ھ کو جمعہ کے دن بعد عشا مدینہ منورہ پہنچا تھا۔ موٹروں میں جانے والوں کو آنے جانے کے دو دن نکال کر کامل تین روز مدینے میں ٹھہرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس سے زیادہ ٹھہرنے میں موٹر والوں کا نقصان ہے آخر ۲۱ ذیحجہ کو ہماری روانگی کا دن آگیا۔ اگرچہ مدینے کے گورنر امیر مشاری ابن جلیوی ابن سعود نے جو موجودہ سلطان حجاز کے چچا ہیں۔ مجھ سے ازراہِ مہربانی یہ فرمایا تھا کہ اگر تم چاہتے ہو تو تمہاری موٹر کو ہم روک لیں مگر میں نے عرض کیا کہ یہ مناسب نہ ہوگا کہ جس موٹر والے نے بڑے بڑے امیروں کے سوال رد کر کے حج کے بعد سب سے پہلے مجھے یہاں پہنچایا اُس کے بدلے میں اُس کی خلاف مرضی یہاں ٹھہر کر میں اس کا نقصان کروں۔ غرضکہ منگل کے دن بعد نمازِ عصر میں اپنے آقا و مولا کی خدمت میں آخری والوداعی سلام عرض کر کے بادلِ بریاں وبا چشمِ گریاں یہ کہتا ہوا رخصت ہوا کہ

"سرکار میری یہ زیارت آخری زیارت نہ ہو پھر بھی اس غلام کو بھی یاد فرمائیے۔"

ہم مدینے سے جدے چلے۔ ہماری موٹر ہوا میں اُڑنے لگی اور ہم سے قبل جو موٹریں روانہ ہوئی تھیں اُن سب کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ کئی کوس تک ہم گنبد خضرا کو حسرت سے دیکھتے ہوئے چلے جا رہے تھے اور کوئی امید باقی نہیں رہی تھی کہ پھر ہم کو زیارت نصیب ہوگی۔ مدینے سے ہم کوئی پچیس میل نکل آئے تھے کہ یکایک موٹر کی کمانیاں ٹوٹ گئیں اور اب یہ ایک پہاڑ کے نیچے رُک گئی۔ پیچھے والی موٹریں آئیں اور ہم کو چھوڑتی ہوئی چلی گئیں۔ ہم نے سمجھ لیا تھا کہ اب جدے سے کوئی موٹر اسی کمپنی کی جس کی موٹر میں ہم سوار تھے۔ آکر ہمیں جدے لیجائے گی۔ یہ خیال نہ تھا کہ مدینے واپس جانا بھی ہوسکتا ہے۔ آخر ایک موٹر مدینے سے آئی اس کے ڈرائیور اور ہمارے ڈرائیور نے ٹوٹی ہوئی کمانیوں کو اوپر نیچے تختے رکھ کر اس طرح باندھ دیا جیسے کہ ٹوٹا ہوا ہاتھ۔ اب یہ چلنے کے قابل ہوگئی۔ مگر جدہ بہت دور تھا اور مدینہ قریب۔ صلاح یہ ٹھہری کہ مدینے ہی چلے چلیں۔ ہم آہستہ آہستہ چلکر صبح پھر مدینے پہنچ گئے اور مدینے والوں نے کہا تم کو جانے کی ابھی اجازت نہیں ہے۔ میں دراقدس پہ حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"یارسول اللہ۔ یہ نالایق غلام پھر حاضر ہوا ہے۔"

یہ دوسری زیارت ہوئی۔ چارشنبہ کا سارا دن گزرا۔ موٹر کی مرمت ہوگئی۔ جمعرات کی صبح کو پھر چلنے کی تیاری ہوئی۔ اور میں نے بعد نماز فجر نہایت شرمندگی کے ساتھ اجازت مانگی اور عرض کیا کہ

"اے میرے آقا۔ اے میرے مولا۔ جس طرح اس غلام کو دو مرتبہ زیارت سے سرفراز فرمایا گیا ایک دفعہ اور بھی۔"

ہمارا سامان موٹر میں رکھ دیا گیا ہم بھی جا بیٹھے مگر ہماری موٹر کی کمپنی والوں نے چلنے سے بعض وجوہ پر عذر کر دیا۔ اور پھر ہم واپس ہوئے پھر شرفِ باریابی حاصل ہوا اور پھر یہ خطاوار ہنستا اور روتا حضور شفیع المذنبین میں حاضر ہوا اور اس طرح الحمد للہ ایک زیارت میں تین زیارتیں نصیب ہوئیں۔ آخر جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد الوداع یارسول اللہ الفراق یارسول اللہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ اور رخصت ہی ہوگیا۔

(۳۳) سلام و زیارت

حضور سرورِ عالم کے دربار میں پہلی حاضری کے لیے زائر نہا دھو کر عطر لگا کر حاضر ہوتے ہیں اور باب جبرائیل سے داخل مسجد ہو کر سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے مرقد منورہ کے قریب پہنچکر ٹھہر جاتے ہیں اور اذنِ سلام طلب کرتے ہیں یعنی کلمۂ شہادت اور تیس مرتبہ اللہ اکبر کہکر سکون و وقار کے ساتھ ایک دو قدم آگے بڑھتے ہیں پھر چالیس مرتبہ اللہ اکبر کہتے ہیں۔ اس کے بعد مرقدِ پُر نور کے قریب کھڑے ہو کر سلام عرض کرتے ہیں۔ بہت سے زایر بغیر اذن کے بھی سلام پڑھتے ہیں۔ بعض دوسرے طریق پر بھی اذن طلب کرتے ہیں۔ پہلی زیارت کے بعد داخلۂ باب جبریل اور اجازت طلبی کا اہتمام باقی نہیں رہتا۔ البتہ سلام پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

مرقدِ مبارک حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی قبلہ رو جالی کے وسط میں ایک گول حلقہ ہے۔ جس کو شبکۂ نبی کہتے ہیں۔ اس سے ڈھائی گز کے فاصلہ پر مودب و سرنگون کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھا جاتا ہے۔ اوقات سلام عموماً پنج وقتہ نماز کے بعد اور خصوصاً نماز صبح و مغرب کے بعد ہیں۔ اِس کے علاوہ اور وقت بھی سلام عرض کر سکتے ہیں۔ حضورِ اقدس کی خدمت میں کوئی خاص سلام پڑھنے کی پابندی نہیں ہے عام طور پر زبان عربی میں سلام پڑھا جاتا ہے۔ مدینے میں جو سلام رائج ہے اور جو وہاں کے تمام مزدوروں اور معلموں کو یاد ہے وہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے۔ ضرورت و موقع کے لحاظ سے اس میں کمی و بیشی کی جا سکتی ہے۔ خلاصۃ الوفا۔ نزہۃ الناظرین۔ اور ملا کہی کی کتاب "حسن التوسل فی زیارت افضل الرسول" اور حلیۃ المتقین مولفہ ملا باقر مجلسی میں اور بھی بعض سلام موجود ہیں۔ جن کا مضمون قریب قریب اسی سلام کے ہے۔ خلاصہ یہ کہ "حضور اقدس کے مختلف اسمائے ذات و صفات کے اعتبار سے جس جس طرح چاہیں سلام و زیارت پڑھی جا سکتی ہے کم سے کم صرف اس قدر کہدینا بھی کافی ہے۔

"السلام علیک یا رسول اللہ"

جب کسی غیر کی طرف سے سلام پڑھا جاتا ہے تو اکثر یہ مختصر صورت ہی اختیار کی جاتی ہے۔ اہلِ مدینہ مختلف ممالک کے لوگوں کی طرف سے بھی حسب فرمائش چند روز تک یا سال بھر تک نیابتہً سلام عرض کر دیتے ہیں۔ جس کے معاوضہ میں اُن کو کچھ نذر کرنا پڑتا ہے۔ مدینے میں کوئی خط باہر سے ایسا نہیں آتا جس میں کاتب کی طرف سے روضۂ اقدس پر سلام عرض کرنے کی استدعا نہ کیجاتی ہو اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا کون مسلمان ہوگا جو مدینے خط بھیجے۔ وہاں والوں کو خط میں سلام لکھے اور اُس سلطانِ دوجہاں کو بھول جائے۔

عام حاجی چونکہ سلام پڑھنے کے طریقے سے ناواقف ہوتے ہیں اور بہت سے حاجیوں کو سلام یاد بھی نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے مزور کے ساتھ ساتھ پڑھتے ہیں زیارت کرانے والے کو مزور کہتے ہیں ان کا دوسرا نام معلم بھی ہے مدینہ منورہ کے مزوّروں نے مختلف ملکوں کو اپنے درمیان تقسیم کرلیا ہے پنجابیوں کے معلم علٰحدہ ہیں۔ بنگالیوں کے الگ۔ حیدرآبادیوں کے جُدا۔ حاجی اپنے معلم یا اُس کے نائب کے ہمراہ زیارت پڑھتے ہیں معلم کا یہ فرض ہے کہ نماز کے بعد وہ اپنے حاجیوں کو سلام پڑھائے۔ جس شخص کا کوئی معلّم نہیں ہوتا تو وہ کسی دوسرے معلم کے حاجیوں کے ساتھ ہوکر سلام کے الفاظ دوہرا دیتا ہے۔ شام کے وقت جب روشنی سے مسجد نبوی ؐ بقعۂ نور بن جاتی ہے۔ حاجیوں کے غول اپنے اپنے مزور کے ساتھ سلام پڑھنے کے لیے مواجہہ شریفہ پر حاضر ہوتے ہیں مزوروں کا مناسب آواز سے سلام پڑھنا۔ حاجیوں کا ادب و وقار کے ساتھ الفاظ کا دُہرانا اہلِ درد کا سلام پڑھتے وقت روتے ہوئے لہجے اور ہچکیوں سے مضمون سلام کو رقت انگیز بنانا۔ ختم سلام کے بعد حاجیوں کا مرقدِ پُرنور کے اطراف پھر کر اپنی پیاسی آنکھوں کو سیراب اور اپنے مشتاق دلوں کو مطمئن کرنا ایک ایسا نظارہ ہے جس کی تصویر لفظوں میں نہیں کھینچی جاسکتی۔ اس گنہگار نے سولہ برس قبل اپنی نظم " مدینے کی چاندنی" میں یہ سماں اِس طرح دکھایا تھا۔

صل علی سلام کی اب مچ رہی ہے دھوم
روشن ہوئے ہیں معنی اصحابی کالنجوم
سیارے آفتاب کے گرداب رہے ہیں گھوم
ہے روضہ شریف پہ حجاج کا ہجوم

منڈلا رہی ہیں بلبلیں باغوں کے اردگرد
پروانے اڑ رہے ہیں چراغوں کے اردگرد

سلام کا دوسرا نام زیارت بھی ہے۔ شیعہ سلام پڑھنے کو زیارت پڑھنا کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سلام پڑھا جاتا ہے اس میں شیعہ سنیوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اہل سنت آنحضرت و اہلبیت و صحابہ پر سلام پڑھنے کے بعد فاتحہ بھی پڑھتے ہیں شیعہ صرف سلام پر اکتفا کرتے ہیں۔ اہل سنت مرقد منورہ کی جنوبی دیوار کی طرف منھ کرکے شبکۂ نبی کے محاذی جسے مواجہہ شریفہ کہتے ہیں سلام پڑھتے ہیں شیعہ مغربی جانب جالی کے پاس کھڑے ہوکر سلام عرض کرتے ہیں۔ جہاں آنحضرت ؐ کا بالکل سرہانا ہے شبکۂ نبیؐ سے ایک قدم داہنی جانب ایک چھوٹی سی مدور کھڑکی اور ہے۔ اسے شبکۂ ابوبکرؓ کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ پر سلام کے بعد یہاں سلام پڑھا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ سلام رائج ہے۔ ضرورت ہو تو اسے گھٹا بڑھا بھی سکتے ہیں۔

السلام علیک یا سیدنا ابوبکر الصدیق۔ السلام علیک یا خلیفۃ رسول اللہ فی التحقیق السلام علیک یا صاحب رسول اللہ۔ السلام علیک یا خلیل حبیب اللہ۔ السلام علیک یا ثانی اثنین اذ ہما فی الغار السلام علیک یا امام المہاجرین والانصار۔ السلام علیک یا من انفق مالہ کلہ فی حب اللہ وحب رسولہ حتی تخلل بالعبا۔ رضی اللہ تعالی عنک وارضاک احسن الرضاء وجعل الجنۃ منزلک ومسکنک ومحلک وماولک۔ السلام علیک یا اول خلفائے راشدین وتاج العلماء المہدیین السلام علیک صہر المصطفی النبی الامین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یعنی اے ہمارے سردار ابوبکر صدیق رضؓ آپ پر سلام۔ اے رسول اللہؐ کے حقیقی جانشین آپ پر سلام۔ اے رسول اللہؐ کے صحابی آپ پر سلام۔ اے اللہ کے حبیب کے دوست

آپ پر سلام۔ آپ وہ ہیں کہ آپ کی شان میں "غار کے دو چھپنے والوں میں دوسرا" وارد ہوا ہے آپ پر سلام۔ آپ وہ ہیں کہ آپ نے اپنا تمام مال خدا و رسول کی محبت میں خرچ کر دیا یہاں تک کہ آپ کے پاس ایک عبا رہ گئی۔ آپ پر سلام۔ اللہ آپ سے راضی ہو اور آپ کو اچھی طرح راضی کرے جنت کو آپ کا گھر، آپ کا مسکن اور آپ کا ملجا و ماویٰ بنائے۔ اے خلفائے راشدین میں سب سے پہلے خلیفہ۔ اے ہدایت پائے ہوئے علما کے سرتاج۔ اے نبی امین محمد مصطفےٰ کے خسر آپ پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت آپ پر نازل ہو۔

شبکۂ ابوبکرؓ سے ایک قدم داہنی طرف ہٹ کر شبکۂ عمرؓ ہے یہاں بالعموم حسب ذیل سلام پڑھتے ہیں۔ موقع و محل کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدیل بھی کر دیا جاتا ہے۔

السلام علیک یا سیدنا عمر ابن الخطاب۔ السلام علیک یا ناطق بالعدل والصواب السلام علیک یا مظھر دین الاسلام۔ السلام علیک یا مکسر الاصنام۔ السلام علیک یا ابا الفقراء والضعفاء والارامل والایتام۔ انت الذی قال فی حقک سید البشر لو کان نبی من بعدی لکان عمر رضی اللہ تعالیٰ عنک وارضاک احسن الرضاء وجعل الجنۃ منزلک ومسکنک ومحلک وماویٰک السلام علیک یا ثانی خلفاء وتاج العلماء وصھر النبی المصطفےٰ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔ اے ہمارے سردار عمرؓ ابن خطاب آپ پر سلام۔ اے انصاف و حق کی بات کہنے والے آپ پر سلام۔ اے دین اسلام کے پھیلانے والے آپ پر سلام۔ اے بتوں کو توڑنے والے آپ پر سلام۔ اے فقیروں ضعیفوں بیواؤں اور یتیموں کے ماں باپ آپ پر سلام۔ آپ وہ ہیں کہ آنحضرتؐ نے آپ کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو بیشک عمرؓ اس کے مستحق تھے" اللہ آپ سے راضی ہو اور اچھی طرح آپ کو راضی کرے اور جنت کو آپ کا مکان و مسکن و ملجا و ماویٰ قرار دے۔ اے دوسرے خلیفہ اے علماء کے تاج اے محمد مصطفےٰ کے خسر آپ پر سلام۔ اور آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت۔

ترکوں کے زمانے میں بعض اوقات شیعوں کو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ پر بھی سلام پڑھنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ انگلستان کے مشہور سیاح برٹن نے جو سنہ ۱۲۶۹ھ میں مدینے گیا تھا اپنے سفرنامے میں حضرت شیخینؓ پر ایرانیوں کے سلام پڑھنے کی کیفیت لکھی ہے اس کا بیان یہاں درج کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا وہ کہتا ہے:۔

جب کوئی پرجوش بدنی کسی ایرانی کے پاس سے گزرتا ہے تو اس سے
کہتا ہے کہ اے عزیز حضرت عمر کے نام پر فاتحہ پڑھ اور اشاعت اسلام میں جو
انھوں نے سعی بلیغ کی ہے اس پر آفرین و مرحبا کہہ۔ یہ فرمائش ایرانیوں کو
موت سے زیادہ ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت اُن کے دل میں غیظ و
غضب کا جو طوفان برپا ہوتا ہے اس کے آثار ان کی پیشانی کی غضبناک
کشمکش سے آنکھوں کی ڈراؤنی گردش اور منھ کے پاس کی رگوں کے پھڑکنے
سے ظاہر ہوتے ہیں"۔

(سفرنامہ برٹن انگریزی جلد اول ص۳۴۵)

موجودہ فرمانروائے حجاز سلطان عبد العزیز ابن عبد الرحمان آل سعود نے شیعوں کو اس بارے میں کامل آزادی دیدی ہے اور اب یہ باطمینان تمام کسی مزدور کے ساتھ یا کسی کتاب میں دیکھکر یا زبانی جس طرح چاہیں زیارت پڑھ سکتے ہیں۔ خلاف عقیدہ کوئی کام کرنے پر اُن کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ عام طور سے بھی اہل نجد نے زیارت حضرت سرور کائنات صلعم کے متعلق کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی ہے۔ صلواۃ و سلام و فاتحہ کی سب کو اجازت ہے۔ ہر فرقہ و مذہب کا آدمی اپنے طریق پر جس طرح چاہے پڑھ سکتا ہے۔ مرقد منورہ کو سجدہ و طواف تو پہلے بھی حرام تھا۔ اسی خوف سے اگلے لوگوں نے قبر شریف کو بند کردیا اور حجرے کو باہر سے مربع نہ بنایا کہ لوگ اسے کعبہ سمجھکر کہیں اس کا بھی طواف نہ کرنے لگیں۔ اب رہا جالی مبارک کا چومنا یہ مسئلہ مسلمانوں میں مختلف فیہ ہے۔ امام محمد غزالی نے کیمیائے سعادت میں ادب سے دور کھڑے ہوکر سلام عرض کرنا ہی مناسب سمجھا ہے۔ اور جالی کو چومنا خلاف ادب لکھا ہے۔ خیر ان باتوں کا تصفیہ علماء کریں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ جالی کو چھونا۔ چومنا۔ اس سے لپٹنا یہ سب محبت کے کرشمے ہیں۔ ہر شخص اپنے جوش و جذبہ کی مناسبت سے خلوص کا اظہار کرتا ہے۔ دیکھنے والے سمجھ نہیں سکتے کہ یہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ میں خود بارہا جالی سے منھ لگا کر کھڑا ہوا گستاخانہ اور بے ادبانہ جالی کے اس پاس ہر جگہ بیٹھا۔ مجھے کسی نے نہیں ٹوکا۔ مگر ایک مصری عورت کو میں نے دیکھا کہ وہ جالی مبارک کی

طرف بڑھنا چاہتی تھی تاکہ اس کو چھو کر اپنے ہاتھوں کو منہ پر پھیرے۔ نجدی سپاہی نے اشارہ سے اُس کو منع کر دیا کہ ایسا مت کر۔ تاہم مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض حاجیوں نے مختلف طریقوں سے جالی مبارک سے اظہار عقیدت کیا۔

(۳۴) مزار اقدس کی نسبت عیسائیوں کے شبہات

الف۔ کپتان برٹن اور پادری زویمر کے خیالات۔

دنیا کے بیشمار انبیاء و مرسلین میں صرف دس بارہ پیغمبر ہی ایسے ہیں جن کی قبروں کی اس وقت نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے اور ان قبروں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ان کی نسبت بھی ایسی مسلسل و متواتر صحیح روایتیں موجود نہیں ہیں جن کی بناء پر ان کے اصلی ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔

دنیا میں یہ شرف صرف ہمارے ہی آقا حضور سرور عالم محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے کہ ان کے مزار پُر انوار کے متعلق بہت سے جزوی جزوی حالات موجود ہیں اور سلف سے آج تک کبھی کسی مورخ کو اس بارے میں شبہ نہیں ہوا کہ آنحضرتؐ کا مرقد شریف جو وقت وفات سے آج تک مسلمانان عالم کا زیارت گاہ چلا آرہا ہے وہ اصلی مدفن نہیں ہے یا یہ کہ قبر شریف اس جگہ نہیں۔ مدینے میں کسی اور جگہ ہے۔ یا دنیا میں کسی اور مقام پر ہے یا کہیں ہے ہی نہیں مگر حیرت کی بات ہے کہ کپتان برٹن صاحب جو حاجی برٹن کے نام سے مشہور ہیں۔ جن کو اہل یورپ بہت بڑا محقق اور علوم عربی و فارسی کا زبردست فاضل مانتے ہیں اور جن کی قابلیت کے ڈنکے یورپ میں بج رہے ہیں۔ اپنے سفرنامۂ حجاز میں آنحضرت کے مزار اقدس کی نسبت یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ "وہ ایک فرضی قبر ہے"۔ برٹن صاحب اگر صرف قیاسی دلائل پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتے تو اتنا مضائقہ نہ تھا مگر غضب یہ کیا کہ اپنے شبہات کو تقویت پہنچانے کے لیے

انھوں نے بعض عربی مورخوں کے حوالے بھی دیدیے ہیں جن سے بظاہر اُن کی صحت کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اصل کتابوں سے جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو برٹن صاحب کی قلعی کھل جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آنکھوں میں خاک ہی جھونکی ہے۔

اکثر غیر مسلم ماہرین علوم مشرقی کی یہ عادت دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ یا تو (۱) ناقابلیت کی وجہ سے یا (۲) تعصب کے باعث یا (۳) اس نیت سے کہ ان کی کتاب کھڑا کھڑ فروخت ہو جائے اسلام واہل اسلام کے صحیح حالات لکھتے لکھتے بعض ایسے واقعات بھی تحریر کر جاتے ہیں جو اُن کے ہم مذہب اہل ملک کی دلچسپی کا باعث ہوں۔ برٹن صاحب کا آنحضرت کی قبر شریف کی نسبت شبہ کرنا بھی انھیں تین وجوہ میں سے کسی وجہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ برٹن صاحب کی دیکھا دیکھی بلکہ انھیں کے اعتراضات لے کر اور ان میں کچھ بے تکی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے امریکن پادری زویمر صاحب نے بھی اپنی کتاب "کریڈل آف اسلام" (گہوارہ اسلام) میں جو عراق وعرب وعمان کے حالات پر مشتمل ہے اور سنہ ۱۸۹۹ء میں انگریزی میں شایع ہوئی ہے۔ آنحضرت صلعم کے مرقد مبارک کو اپنے معمولی پادریانہ لہجے میں فرضی قبر بیان کیا ہے۔ پادری صاحب سے ہمارے حیدرآباد والے خوب واقف ہیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں یہاں آئے تھے اور عربی کتابوں کا حوالہ دے دیکر جابجا لکچر دیے تھے۔ لوگ ان کو بڑی معلومات کا آدمی سمجھتے تھے لیکن اگر ان کی کتاب کریڈل آف اسلام ملاحظہ فرمائی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ زویمر صاحب نے اسلام وبانی اسلام پر جو اعتراض کیے ہیں اور جس لہجے سے کیے ہیں وہ کسی ذی علم و ذی اخلاق آدمی کے قلم سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی کارخانہ اخبار وطن لاہور نے چھاپا ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں بجز دو ایک اعتراضات کے نہ تمام اعتراض درج ہیں اور نہ ان کی تردید چونکہ زویمر صاحب دراصل مسٹر برٹن ہی کے ریزہ چیں ہیں اس لیے ان کو علحدہ بالتفصیل جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے تاہم برٹن صاحب کے شبہات رفع کرنے کے بعد ان کے اعتراضات نمبروار لکھکر اُن پر بھی مختصر ریمارک کر دیا جائے گا۔

چونکہ برٹن صاحب بڑی شخصیت رکھتے ہیں اس لیے ان کے شبہات ایسے نہ تھے جن کو

نظر انداز کر دیا جاتا۔ چنانچہ اس ہیچمداں نے ان کے اعتراضات کا مفصل و مشرح جواب اس سے کئی برس قبل اپنی کتاب "حجاز کے فرنگی سیاح" میں تحریر کیا ہے جو ربیع الاول ۱۳۴۴ھ میں حیدر آباد کے ایک ادبی و تاریخی رسالہ ترجمان میں بھی شایع ہوا تھا۔ اب اس کتاب کی مناسبت سے ضرورت ہے کہ اس مضمون کو بہ ترمیم یہاں درج کیا جائے تاکہ مزار اقدس کے حالات نامکمل نہ رہ جائیں۔ لیکن برٹن صاحب کے شبہات رفع کرنے سے قبل مناسب یہ ہے کہ پہلے ان کی سوانح عمری لکھدی جائے تاکہ ان کا مرتبہ بلند و پایگاہ رفیع معلوم ہو جائے۔ اور ناظرین دیکھیں کہ ایسے بڑے بڑے آدمی کیسی بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔

(ب) کپتان برٹن صاحب کی سوانحعمری۔

حجاز کے فرنگی سیاحوں میں حاجی عبد اللہ عرف کیپٹن سر رچرڈ فرڈرک برٹن صاحب سب سے زیادہ مشہور ہیں یہ زبردست سیاح و مصنف جن کے علم و فضل کے ڈنکے یورپ میں بج رہے ہیں۔ اور جن کی عربی و فارسی قابلیت اور اسلامی واقفیت پر اہل یورپ ناز کرتے ہیں۔ ۱۹ر مارچ ۱۸۲۱ء کو بمقام ہرٹفورڈ شائر[1] پیدا ہوئے تھے ان کا لڑکپن فرانس و اٹلی میں گزرا۔ جہاں کچھ یوں ہی بے قاعدہ طور پر تعلیم ہوئی اس کے بعد "ٹرنٹی کالج آکسفورڈ[2]" میں تعلیم پائی اور یہیں عربی زبان بھی شروع کی۔ ۱۸۴۲ء میں وہ "اٹھارہویں بمبئی پلٹن" میں لفٹنٹی کے عہدے پر مامور ہو کر ہندوستان آئے اور ریاست بڑودہ میں متعین ہوئے یہاں کپتانی تک ترقی پائی۔ لیکن یہ ملازمت ان کو پسند نہ تھی اس لیے فوجی زندگی سے اکتا کر محکمہ پیمایش میں تبادلہ کرا لیا اور اس طرح ان کو سندھ کی سیر اور مختلف زبانوں کے سیکھنے کا موقعہ ملگیا۔ ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب میں انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی ہو رہی تھی انھوں نے اس جنگ میں ترجمان مقرر ہونے کے لیے درخواست کی مگر وہ نامنظور ہو گئی اور اس سے ان کی اس قدر دلشکنی ہوئی کہ وہ تین سال کی

---

[1] ہرٹفورڈ شائر صوبہ لندن کا ایک ضلع ہے۔ اس کی آبادی تخمینناً تین لاکھ ہے۔ [2] انگلستان کا ایک شہر ہے یہاں کی یونیورسٹی اور ٹرنٹی کالج نہایت مشہور ہے۔

رخصت غیر معمولی حاصل کر کے ولایت چلے گئے۔ ۱۸۵۲ء تک اہلِ یورپ کو مشرقی و وسطی عرب کے حالات کافی طور پر معلوم نہ تھے۔ برٹن صاحب کی طبیعت بہت ہی متلاشی واقع ہوئی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا کام کریں جو ان کے ملک و قوم کے لیے مفید ہو اس لیے اب انھوں نے سفر حجاز کی ٹھان لی۔ اور لندن کی "رایل جیوگرفیکل سوسائٹی[۱]" سے زادراہ کا بندوبست کر کے اپریل ۱۸۵۳ء میں وہ انگلستان سے مصر روانہ ہوئے اور اسلامی طرز معاشرت اور عربی سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ڈھائی تین مہینے قاہرہ میں گزارے اور وہاں کے ایک مشہور عالم شیخ محمد العطار[۲] کے شاگرد ہو گئے اور اُس سے شافعی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ بقول برٹن صاحب اس میں مصلحت یہ تھی کہ فقہ شافعی بمقابلہ دوسرے مذاہب کے آسان ہے۔ نیز شیعوں کے مسائل اس فقہ کے مسائل سے ملتے جلتے ہیں۔ جن سے برٹن صاحب ایرانیوں کی صحبت میں بہت واقف ہو گئے تھے۔ برٹن صاحب نے اپنا نام مرزا عبداللہ خاں رکھا تھا لیکن حاجی ولی عرف ڈاکٹر ویلن[۳] کی رائے سے بعد میں عبداللہ خاں رکھ لیا۔ اور جہاں کہیں پوچھ گچھ ہوئی اپنے تئیں رنگون کا رہنے والا سنی المذہب شافعی مشرب پٹھان بتا دیا۔ برٹن صاحب کو علم طب میں بھی دخل تھا۔ اس وجہ سے لوگ ان کو حکیم عبداللہ خاں کہنے لگے تھے۔ جولائی ۱۸۵۳ء میں وہ حج کے ارادے سے چند مصریوں کے ساتھ قاہرہ سے روانہ ہوئے اور سوئز تک اونٹوں پر سفر کیا یہاں سے جہاز پر سوار ہو کر ینبوع داخل ہوئے۔ پھر حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مدینہ منورہ

---

[۱] لندن کی ایک مشہور کمیٹی تھی جس کے مقاصد و اغراض دنیا کے نامعلوم حصوں کے حالات معلوم کرنا تھے۔

[۲] یہ شخص کسی زمانے میں سرکاری خطیب تھا۔ ان دنوں محلہ جمالیہ واقع قاہرہ میں اس کی عطاری کی دکان تھی۔

[۳] ڈاکٹر ویلن ایک روسی سیاح تھا جس نے ۱۸۵۲ء میں عرب کے بعض حصوں کی سیاحت کی تھی اور حج بھی کر آیا تھا مگر اس نے اپنا سفرنامہ نہیں لکھا۔ ہماری کتاب حجاز کے فرنگی سیاح میں اس کے تفصیلی حالات درج ہیں۔

پہنچے۔ اس کے بعد شامی قافلے کے ہمراہ مکے گئے اور حج میں شریک ہوکر جدّے کی راہ سے انگلستان واپس ہو گئے۔

۱۸۶۱ء میں انھوں نے محکمۂ خارجہ کی ملازمت اختیار کی اور امریکہ۔ افریقہ۔ ایشیا یورپ کے مختلف ممالک میں وہ انگریزی سفاوت کے عہدے پر فائز رہے آخر عمر میں اٹھارہ برس تک سلطنت آسٹریا کے بندرگاہ "ٹرسٹ"[۱] میں قونصل کے عہدے پر مامور رہکر وہیں ستر برس کی عمر میں ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو انتقال کیا۔ ان کی لاش کو کافور وغیرہ لگا کر انگلستان لے گئے اور وہاں قصبۂ مارٹلیک[۲] میں سپردِ خاک کیا۔ برٹن صاحب کی عربی سیاحت کی یادگار میں ان کی قبر پر سنگِ مرمر کا ایک عربی وضع کا خیمہ ان کی بیوی آئیسل برٹن نے بنوا دیا اور اب یہ سیاحِ عرب اس میں سو رہا ہے۔

اسٹینلی لین پول[۳] جس نے برٹن صاحب کے سفرنامۂ حجاز مطبوعہ ۱۸۹۸ء پر دیباچہ لکھا ہے تحریر کرتا ہے کہ:۔

"وہ اٹھارہ زبانوں میں مہارت رکھتے تھے انگریزی ان کی مادری زبان تھی اس کے علاوہ فرانسیسی۔ اطالی۔ اردو۔ فارسی۔ عربی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ ملتانی پنجابی و سندھی زبان وہ اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی مادری زبان بولتا ہے
۱۸۴۷ء میں رخصت بیماری پر جب وہ بغرض تبدیل آب و ہوا دکن گئے تھے

---

[۱] ٹریسٹ آسٹریا کا بندرگاہ بڑی تجارت کی جگہ ہے۔ عمارتی لکڑی۔ آرائشی سامان۔ اور مَل و شکر یہاں کی دساور ہے۔

[۲] ۔ مارٹلیک دریائے ٹیمز کے کنارے لندن سے جانب غرب و جنوب آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے یہاں اکثر مشہور آدمیوں کی قبریں ہیں۔

[۳] ۔ یہ ایک مشہور مورخ اور عالم آثار قدیمہ ہے ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ عربی کا ماہر سمجھا جاتا ہے ۱۹۰۴ء تک ٹرنیٹی کالج ڈبلن میں عربی کا پروفیسر رہا ہے۔ اس کی تصنیفات میں مورس ان اسپین" (تاریخ اسپین) "آرٹ آف سرسینز" (مسلمانوں کے علوم و فنون) "مصر ازمنہ متوسط میں" اور "قاہرہ کی کہانی" مشہور ہیں۔

تو وہاں تامل و تلنگی وغیرہ زبانیں سیکھ لی تھیں۔ ان کے سوا ترکی، سنسکرت
پشتو اور ارمنی زبان بھی اچھی طرح بول سکتے تھے۔"

مذکورہ بالا بیان بہت ہی مبالغہ آمیز ہے۔ اہل یورپ اپنی اصطلاح میں جس کو زبان جاننا کہتے ہیں ہم اسکو زبان بگاڑنا سمجھتے ہیں۔ یورپ میں برٹن صاحب کو عربی کا بہت بڑا محقق و ماہر خیال کیا جاتا ہے مگر ہم آگے ثابت کریں گے کہ وہ عربی عبارت کا مطلب نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے سفر نامہ حجاز میں بہت سے محققانہ و عالمانہ مضامین ہیں مگر بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن سے ان کی قابلیت و تحقیق پر پانی پھر گیا۔ چنانچہ مضمون ہذا ایک اسی قسم کی غلطی کی اصلاح کی غرض سے تحریر کیا گیا ہے۔ برٹن صاحب کی تصنیفات بکثرت ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

مغربی افریقہ کا سفر۔ کمرونس[۱] کے حالات۔ شاہ دھومی[۲] کی خدمت میں وفد۔ گوریلا[۳] کی سرزمین۔ کانگو[۴] کا راستہ۔ مدین[۵] کی سنہری کانیں۔ سرزمین مدین۔ ترجمہ الف لیلہ

۱۔ کمرونس افریقہ کا مشہور پہاڑ ہے۔ کبھی کبھی آتش فشانی بھی کرتا ہے۔ جنگ یورپ سے قبل یہ جرمنی کا علاقہ تھا اب وہاں انگلستان و فرانس کا قبضہ ہے۔

۲۔ دھومی مغربی افریقہ میں فرانسیسیوں کا ایک ملک ہے۔

۳۔ مغربی افریقہ کے بعض مقامات کیمیا وغیرہ میں ایک قسم کا بہت بڑا بندر ہوتا ہے۔ اسے گوریلا کہتے ہیں۔

۴۔ کانگو افریقہ کا بہت بڑا دریا ہے اس میں افریقہ کے تمام دریاؤں سے زیادہ پانی ہے۔ اس کی ملیٹی میں گھنے جنگل ہیں جن میں ربڑ کے درخت۔ تاربین کا تیل اور ہاتھی دانت پایا جاتا ہے۔ یہاں بلجیم کی حکومت ہے۔

۵۔ مدین بحر احمر کے مشرقی ساحل پر ایک پرانی بستی اور بڑی تجارت گاہ تھی یہیں کے تاجروں کے قافلے کے ہاتھ حضرت یوسف فروخت کیے گئے تھے (قرآن شریف سورۂ قصص و توریت کتاب پیدائش باب (۳۷) حضرت موسیٰ بھی فرعون کے پاس سے بھاگ کر مدین پہنچے تھے اور اسی مقام پر شعیب کی لڑکی صفورہ سے شادی کی تھی (توریت خروج باب ۲) اس شہر کے کھنڈر اب تک (بقیہ مضمون برصفحہ ۱۶۱)

زنجبار ۵ اور ملک شام کا نامعلوم حصہ۔ ان کتابوں میں سے اکثر دو دو جلدوں میں ہیں برٹن صاحب کا ترجمہ الف لیلہ نہایت ہی دلکش و سلیس مانا گیا ہے۔ جس پر انھوں نے بیش بہا حاشیہ چڑھایا ہے۔ برٹن صاحب کی سوانح عمری ان کی بیوی "ازابیل برٹن" نے دو جلدوں میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ تحریر کی ہے۔

برٹن صاحب نے ۱۸۶۱ء میں چالیس برس کی عمر میں اس عورت سے شادی کی تھی۔ سوانح عمری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس عورت سے بڑھ کر کسی عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی۔ اور لیڈی برٹن کو اپنے شوہر سے جو عقیدت ہے وہ تعظیم سے گزر کر عبادت و پرستش کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس وجہ سے اس سوانح عمری پر مبالغہ کا ایک گہرا رنگ چڑھ گیا ہے۔ برٹن صاحب کا سفرنامہ حجاز جو ہمارے مضمون کا ماخذ ہے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول کا نام المصر۔ حصہ دوم کا المدینہ۔ اور حصہ سوم کا المکہ ہے۔

یہ سفرنامہ کئی مرتبہ شایع ہو چکا ہے۔ آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں "جارج بیل اینڈ سنز لندن" نے اس کو دو جلدوں میں مع تصاویر و نقشہ جات طبع کرایا اور یہی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۹)

موجود ہیں۔ ابوالفدا کے زمانہ ۷۳۲ھ تک وہ کنواں جس پر حضرت موسیٰؑ نے شعیب کی بکریوں کو پانی پلایا تھا۔ زیارت گاہ تھا۔ واضح ہو کہ اس مدین کو مدائن صالح نہ سمجھ لینا چاہیے جو علاقہ شام میں حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن ہے اور جہاں حضرت صالح کے زمانہ کی صدہا عمارتیں ویران پڑی ہیں۔ عراق عرب میں نوشیروان کا پایہ تخت مدین بھی اس کے علاوہ تھا۔ جہاں مشہور کاخ کسرا کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ جن کے مرثیہ میں خاقانی ان کی زبان حال سے کہتا ہے۔

ما بارگاہ دادیم این رفت ستم بر ما ۔۔۔ بر کاخ ستمگاراں آیا چہ رود خذلاں

۵ زنجبار مشرقی افریقہ میں انگریزی علاقہ کا ایک بندرگاہ اور تجارت کا مرکز ہے۔ لونگ کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ برائے نام یہاں ایک مسلمان سلطان بھی ہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں اس درویش نے اردو میں اس سفرنامے کا ترجمہ شروع کیا تھا اور تقریباً نصف کتاب کا ترجمہ کر بھی ڈالا تھا مگر اُس وقت اشاعت کا انتظام چونکہ ہو نہیں سکتا تھا اس لیے کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں دفتر "اخبار وطن" لاہور کی کتب مطبوعہ کی فہرست میں سفرنامہ برٹن کے ترجمہ کا اشتہار شایع ہوا۔ جسے دیکھکر میں اس کے ترجمہ کے خیال سے دست بردار ہو گیا۔ دفتر وطن کے اس ترجمہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ صرف مدینہ منورہ کے حالات کا ترجمہ ہے جو "سفر دار المصطفےٰ" کے نام سے چھاپا گیا ہے اس کے مترجم مولوی محمد انشاء اللہ صاحب اڈیٹر اخبار وطن اور مولوی مصباح الدین صاحب ہیں۔ اس میں اکثر عربی الفاظ و اصطلاحات و مقامات وغیرہ کے نام غلط لکھ دیے ہیں۔ بعض جگہ ترجمہ بھی غلط کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض فاش غلطیاں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برٹن صاحب کے اعتراضات و نکتہ چینی اور خصوصاً اُن شبہات کی جو انھوں نے آنحضرتؐ کے روضہ کی نسبت کیے ہیں اور اُس کو ایک فرضی قبر بیان کیا ہے۔ کافی تردید بھی نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ برٹن صاحب نے شبہات مذکورہ کے ضمن میں سمودی۔ قلقشندی۔ وغیرہ کے جو غلط حوالے دیے ہیں۔ اُن کا اصل عبارت سے مقابلہ تک نہیں کیا۔ اڈیٹر صاحب موصوف نے سفرنامہ برٹن کے باقی دو حصوں کے ترجمے کا وعدہ بھی دیباچہ میں فرمایا ہے۔ اس لیے ان حصوں کی اشاعت بھی دوسرے شخص کے لیے اخلاقاً ممنوع ہو گئی۔ قصہ مختصر اس طرح میں نے اس سفرنامے کے ترجمے کا خیال ہمیشہ کے لیے ترک کر کے ترجمہ شدہ حصّے کو کسی مناسب مقام پر دفن کر دینے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

اِس موقع پر برٹن صاحب کے بھیس بدلنے کے متعلق چند سطریں لکھنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ مولوی محمد انشاء اللہ صاحب اپنے ترجمہ دار المصطفےٰ کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نہایت تعجب خیز اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کپتان برٹن نے اس اہم و پُرخطر سیاحت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا اور لطف یہ ہے کہ ان کی کوئی اصلی شناخت نہ کر سکا۔"

مولوی صاحب موصوف نے اس رائے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس مصلحت سے انھوں نے حقیقت کا اخفا فرمایا۔ برٹن صاحب کی اہلیت و قومیت کے متعلق جو شکوک سفرِ حجاز میں ان پر کیے گئے اُن کے بارے میں وہ خود اپنے سفر نامے میں قاہرہ سے سوئز تک کے حالات میں لکھتے ہیں۔

"باوجود ہر قسم کی ہوشیاری کے کئی مرتبہ مجھ پر شبہ ہوا اور ایک دفعہ تو مجھ سے بھی غلطی ہوگئی۔ میں نے اپنے قافلے کے حاجیوں کو ایک آلۂ پیمائش دکھایا جس سے وہ لوگ چونک گئے۔"

اس سے بڑھ کر اور ثبوت ملاحظہ ہو۔ برٹن صاحب اپنے ملازم و مطوف محمد البسونی[1] کی نسبت کہتے ہیں۔

"جب وہ نماز پڑھتا تو میرے پیچھے کھڑا ہوتا اور اس طرح وہ اُس شک کا جو میری جانب سے اس کے دل میں تھا ثبوت دیا کرتا تھا اس کو ابتدا ہی سے مجھ پر کم سے کم کافر ہونے کا شبہ تھا۔"

اہلِ حجاز کی اصطلاح میں کافر سے ہمیشہ انگریز مراد ہوتی ہے۔ برکھارٹ و برٹن کے سفرناموں میں جابجا اس کی تفصیل موجود ہے۔ جدّے کے حالات میں برٹن صاحب اسی لڑکے محمد کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"وہ بہت سرد مہری کے ساتھ مجھ سے رخصت ہو کر چلا گیا اور اس کا سبب چند روز بعد میرے ملازم شیخ نور نے مجھ سے بیان کیا۔ اس لڑکے (محمد) کو میں اپنے ساتھ جہاز پر لے گیا تھا وہاں اس کے دل میں بہت بُرا شُبہ ہو گیا اس نے شیخ نور سے کہا "اب میں سمجھا تمھارا آقا ہندوستان کا صاحب لوگ ہے۔ وہ ہماری ڈاڑھیوں پر ہنس گیا۔"

---

[1] ۔ محمد البسونی مکے کا رہنے والا ایک لڑکا تھا۔ برٹن صاحب نے قاہرہ میں اس سے احرام خریدا تھا قاہرہ سے روانگی کے بعد ریگستان سوئز میں اس کو ملازم رکھ لیا تھا۔ مکہ معظمہ میں اسی کے مکان پر قیام کیا تھا اور اُسی کو اپنا مطوف مقرر کیا تھا۔

اس کے علاوہ برٹن صاحب کے سفرنامے سے ظاہر ہے کہ اور بھی کئی مرتبہ ان پر شبہات ہوئے تھے[۱] ان کا راز افشا نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قافلے کے ہمراہیوں کیساتھ بہت داد و دہش کرتے تھے اور خصوصاً محمد البسونی کو تو انھوں نے اپنی تھیلی کا مالک ہی بنا رکھا تھا علاوہ اس کے برٹن صاحب نے اس سفر میں اپنے تئیں ہندوستانی ظاہر کیا۔ اور عربوں کے ساتھ حج و زیارت کی اور انھیں کے پاس قیام کیا۔ اُن کے سامنے اُن کی ہندوستانیت کیا ثابت ہو سکتی تھی۔ اب رہا اُن کا پنجابی ملازم شیخ نور وہ اُردو کیا جانے زیادہ سے زیادہ اُس نے یہی سمجھا ہو گا کہ رنگون میں ایسی ہی اُردو بولتے ہوں گے۔ ہاں اگر وہ ہندوستانیوں کے ساتھ مکہ و مدینہ کی سیر کرتے تو ایک منٹ میں قلعی کھل جاتی۔ پھر بھی ان کے عرب ملازم محمد نے تاڑ ہی لیا تھا کہ یہ ہندوستان کا صاحب ہے مگر "ستار عیوب" یعنے روپیے کا یہ کرشمہ تھا کہ ان کو گرفتار نہ کرایا۔ اس میں شک نہیں کہ برٹن صاحب مسلمانوں کے رسم و رواج سے بہت کچھ واقف تھے۔ فارسی میں ان کی قابلیت معقول تھی۔ ان کی عربی دانی کے متعلق اگرچہ یورپ میں بہت دھوم مچ رہی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ عربی عبارت کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھے۔ البتہ مسلمانوں کے تاریخی حالات سے بہت آگاہی تھی اور بھیس بدلنے میں وہ پرانے مشاق تھے۔ ہندوستان کے دوران قیام میں کئی مرتبہ علاقہ سندھ میں اسی قسم کے بھیس بدل چکے تھے۔ اور ایرانیوں اور افغانیوں کے

---

[۱] کتاب کرسچنیز ایٹ مکہ (مکہ میں پیروان مسیح) جو ہمارے مضمون "حجاز کے فرنگی سیاح" کے گیارہ سال بعد ۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی ہے۔ اس کا مؤلف "اے رالی" بضمن حالاتِ برٹن حاشیہ میں لکھتا ہے کہ مدینہ و مکہ کی راہ میں ایک شخص نے برٹن کو تاڑ لیا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ دوسرے دن صبح خنجر سے مقتول پایا گیا۔ یعنے برٹن نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور یہ حکایت لندن میں عام طور پر مشہور تھی۔ چنانچہ برٹن کی شادی کے وقت ایک دوست ڈاکٹر نے اس سے اس طرح علیک سلیک کی۔

ڈاکٹر۔ کسی آدمی کو قتل کرنے کے بعد تمھارا مزاج کیسا رہتا ہے۔

برٹن۔ نہایت بشاش۔ مزاج شریف ڈاکٹر صاحب۔

عادات و خصائل کی مشق بھی کر لی تھی۔ لیڈی برٹن نے ان کے روپ بھرنے کے متعلق جو دلچسپ ریمارک اپنی مولفہ سوانح عمری میں کیا ہے ہم اس کا ترجمہ درج ذیل کرتے ہیں۔

"کندھوں پر زلفیں لٹکائے سینہ پر لمبی ڈاڑھی لہراتی ہوئی چہرہ اور ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگے ہوئے آپ کا خادم مرزا عبداللہ بوشہری بڑے بڑے کھیل کھیل چکا ہے۔ کبھی وہ بزاز بن جاتا اور ململ خاصہ چھینٹ کی پوٹلی بغل میں مارے گلی کوچوں میں پھیری لگاتا اور اپنا سامان دکھانے کے لیے زنانخانے میں بھی بلا لیا جاتا۔ کبھی وہ ایک امیر سوداگر کا بھیس بنا کر کسی گاؤں کے قریب ڈیرے ڈالتا۔ اور مسلمانوں کا لباس پہنے ہاتھ میں نیزہ لیے کمر میں پستول لگائے باہر نکلتا۔ ڈرپوک گاؤں والے اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور وہ ان سے مختلف قسم کی معلومات حاصل کرتا۔ کبھی وہ کوئی دکان کرایہ پر لیتا اور چکنی ہوئی کھجوریں، گڑ، تمباکو، سونٹھ، تیل، مٹھائی، بیچنے لگتا۔ کبھی مرزا کسی مسجد میں جا اترتا اور ان طالب علموں کے ساتھ جو مسجد کے خاک آلود فرش پر لیٹے عربی، دینیات کی پھٹی پرانی ملی دلی کتابیں مٹی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے پڑھا کرتے تھے رات گزارتا۔ کبھی وہ ریش دار سر گھٹے چندھی آنکھوں والے ملاؤں سے بحث کرتا۔ کبھی وہ بھلے مانسوں کے سے سفید کپڑے پہنے گانے بجانے کی محفل میں جا گھستا اور "السلام علیکم" کہہ کر بے تکلف بیٹھ جاتا۔ کبھی وہ افیمیوں اور گانجہ پینے والوں کی صحبت میں وقت گزارتا کبھی وہ مشاطہ عورتوں سے جو مسلمانوں میں شادی بیاہ کراتی ہیں۔ رسم و رواج کے متعلق ضروری باتیں پوچھتا۔ اللہ اکبر کیا کیا تماشے اس نے دیکھے۔ کیا کیا واقعات اس پر گزرے اگر وہ تفصیل کے ساتھ بیان بھی کرتا تو کسی کو یقین نہ آتا۔"

اب ہم ان کے سفرنامے پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ مصر کے

سلہ۔ علاقہ سندھ میں برٹن صاحب نے مرزا عبداللہ بوشہری کے نام سے سیاحت کی تھی۔

متعلق ہے۔ اور قاہرہ سے ینبوع[1] تک کے حالات اس میں درج ہیں چونکہ برٹن صاحب سے پیشتر اکثر سیاحوں نے مصر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس لیے انھوں نے صرف قاہرہ کے مسافر خانوں کی زندگی اور رمضان کا سماں دکھایا ہے۔ ایک باب مسجد کے عنوان سے ہے جس میں مساجد کی وضع قطع کی تاریخ لکھی ہے اس سے مسلمانوں کے مذاق فن تعمیر پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک باب میں قاہرہ سے سوئز تک رستے کے حالات ہیں۔ دوسرے حصے میں مدینہ منورہ کے تاریخی و معاشرتی ہر قسم کے حالات نہایت وضاحت سے تحریر کیے ہیں اس حصے میں بجز چشم دید حالات کے باقی تمام تاریخی حالات "کتاب جذب القلوب[2] الی دیار المحبوب" مصنفہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی سے لفظاً بہ لفظ اخذ کیے ہیں۔ برٹن صاحب سے قبل کسی یورپین سیاح نے مدینہ منورہ کے حالات ایسی شرح و بسط کے ساتھ نہیں لکھے تھے۔ ان حالات کے متعلق جو نوٹ انھوں نے تحریر کیے ہیں وہ بھی انھیں کا حق ہے۔

تیسرے حصہ میں مکہ معظمہ کے حالات۔ مناسک حج۔ اور مقامات متبرکہ وجدے کے حالات و واقعات ہیں۔ اس حصے میں تاریخی حالات کتاب "تاریخ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام" مولفہ قطب الدین مکی سے لیے ہیں اور بیت اللہ کے مفصل حالات سفر نامۂ برکھارٹ سے نقل کیے ہیں۔ برٹن صاحب نے مکہ معظمہ کے حالات اس وضاحت سے نہیں لکھے جیسے کہ مدینہ منورہ کے اور حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے حالات برکھارٹ سے بہتر آج تک کسی مسلمان یا عیسائی سیاح کے سفر نامے میں نظر سے نہیں گزرے۔ برٹن صاحب نے اپنے سفر نامہ میں عموماً واقعات کا اظہار بے کم و کاست کیا ہے۔ لیکن بعض بعض مقامات پر ان کا فطری قومی تعصب بے اختیار ظاہر ہو گیا ہے اور مدینے کے حالات میں تو زیارت مرقد منورہ کا

---

[1] ینبوع ساحل بحر احمر پر مدینہ منورہ کا مشہور بندرگاہ ہے جدے سے جہاز میں جائیں تو ایک دن میں ینبوع پہنچتے ہیں یہاں سے مدینہ منورہ پانچ منزل ہے۔

[2] کتاب جذب القلوب سنہ۱۰۰۱ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ محدث ممدوح کی وفات سنہ۱۰۵۲ھ ہجری میں ہوئی۔

ذکر کرتے ہوئے وہ تحقیقات کے نشے میں اس قدر بے خود و سرشار ہو گئے کہ ان کی عربی کی کم استعدادی پر جو زبردست ملمع چڑھا ہوا تھا وہ سب انھوں نے کھرچ کر پھینک دیا۔ اور آنحضرت ؐ کی قبر مطہر کو ایک فرضی قبر بیان کر کے اپنی قابلیت کو بٹہ لگا لیا۔ اس وقت ہم برٹن صاحب کی دوسری لغزشوں سے قطع نظر کر کے صرف آنحضرت ؐ کے مرقد مبارک کے متعلق ان کے ہر اعتراض کا جواب اس کے نیچے درج کرتے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(ج) برٹن صاحب کے اعتراضات اور ان کا جواب

اعتراض نمبر (۱)

برٹن صاحب کہتے ہیں "اگرچہ ہر پڑھے اور بے پڑھے مسلمان کا یہ پکا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ؐ کا جسد اطہر مدینے کے حجرے میں دفن ہے لیکن میں یہ شبہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ جگہ بھی ویسی ہی مشتبہ ہے۔ جیسی کہ بیت المقدس میں حضرت عیسیٰ کی قبر"۔

جواب اعتراض نمبر (۱)

حضرت عیسیٰ کی قبر کی نسبت البتہ شبہ ہو سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عیسوی معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ صلیب دینے کے بعد حضرت مسیح کی لاش ان کے ایک شاگرد یوسف نامی نے پلاطس[۱] سے مانگی اور اسے ایک قبر میں جو بہ اختلاف روایت کسی چٹان[۲] یا کسی باغ میں کھودی گئی تھی رکھ کر قبر کے منہ پر ایک بڑا پتھر ڈھلکا دیا۔ مریم مگدلینی اور یوسیس کی ماں مریم قبر کے سامنے بیٹھی دیکھ رہی تھیں[۳]۔ یہودیوں نے اس خیال سے کہ

---

[۱] پلاطس وہ مجسٹریٹ تھا جس نے یہودی علماء سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ کو صلیب پر کھینچنے کا حکم دیا۔
[۲] لوقا و متی چٹان میں قبر بتاتے ہیں یوحنا باغ بیان کرتا ہے۔
[۳] انجیل متی ب ۲۷ آیات (۵۷ لغایت ۶۱)

حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد لاش کو چھڑا نہ لیجائیں[۱] اس قبر پر بھاری پہرہ مقرر کر دیا تھا[۲] مگر اُس روز پہرے والے سپاہی ایک عید منانے میں مصروف ہو گئے تھے اور وہ قبر غیر محفوظ حالت میں ہی چھوڑ دی گئی تھی۔ سویم کے روز مریم مگدلینی اور دوسری مریم جب قبر پر گئیں تو انہوں نے پتھر کو ڈھلکا ہوا پایا اور قبر کے اندر لاش کا پتہ نہ تھا اس کے بعد ایک فرشتے کی شہادت پر ان دونوں عورتوں نے جناب مسیح کے شاگردوں کو مطلع کر دیا۔ کہ آپ زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔ نیز حضرت مسیح نے بھی اپنے شاگردوں پر ظاہر ہو کر اس کی تصدیق فرمائی[۳]

بیانِ مذکورہ بالا سے جو متی و لوقا و یوحنا کی انجیل سے اخذ کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو ایک ہی آدمی نے دفن کیا تھا اور مقام قبر میں بھی اختلاف ہے کہ وہ کسی باغ میں تھی یا کسی چٹان میں۔ قبر پر پہرہ بھی متعین تھا جس کی وجہ سے معتقدان مسیح اس کے پاس جا بھی نہ سکتے تھے اور قبر کو خالی دیکھنے والی بھی باختلافِ روایات دو تین ہی عورتیں تھیں اور حضرت مسیح صرف تین ہی دن قبر میں رہے اور یہ قبر دشمنوں کے علاقے میں واقع تھی جو اُس کے منہدم کر دینے اور مٹا دینے میں بھی تامل نہیں کر سکتے تھے۔ پس ایسی قبر کا اگر پتہ و نشان کسی کو یاد نہ رہے اور اگر کسی فرضی گڑھے کو قبر مسیح مشہور کر دیا جائے تو کچھ حیرت کی بات نہیں ہے علاوہ ازیں چوتھی صدی عیسوی کے آغاز تک قبر مسیح یعنے "ہولی سپلکر" کا وجود تاریخوں میں نہیں پایا جاتا سب سے پہلے ۳۲۶ء میں "قسطنطین[۴]" اول شاہِ روم نے اپنی ماں ملکہ

۱۔ یہودیوں کا اب بھی یہی خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ کو اُن کے شاگرد قبر میں سے نکال لے گئے اور یہ مشہور کر دیا کہ وہ آسمان پر چلے گئے۔ ہمارے زمانہ کے بعض مسلمان علما نے بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت مسیح صلیب کے بعد قبر سے نکال لیے گئے۔ اور تندرست ہو کر عرصہ تک زندہ رہے۔

۲۔ انجیل متی باب ۲۷ آیت ۶۴۔ ۳۔ انجیل متی باب ۲۸۔ ۴۔ "قسطنطین" اول اپنے باپ کونسٹن ٹیس کلارس کے مرنے کے بعد ۳۰۵ء میں روم کا بادشاہ ہوا۔ اس کو ایک جنگ کے وقت آسمان پر ایک آتشیں صلیب نظر آئی تھی اور یہ الفاظ دکھائی دیے تھے کہ "اس صلیب کی خاطر فتح کر" چنانچہ وہ عیسائی ہو گیا اور سلطنت روم کا مذہب عیسائی قرار دیا۔ ۳۳۰ء میں اس نے شہر قسطنطنیہ آباد کر کے اسے اپنی سلطنت کا پایہ تخت قرار دیا یہ ۲۷۹ء میں پیدا ہوا تھا اور ۳۳۷ء میں مرا اس کو قسطنطین اعظم بھی کہتے ہیں۔

ہلینا کے ساتھ بیت المقدس کی زیارت کی اور وہاں "بشپ مکاریس" کی مدد سے قبر شریف جناب مسیح (ہولی سیلکر) اور صلیب عیسیٰ کا پتہ لگایا۔ حضرت عیسیٰ کے ساتھ جن دو قیدیوں کو صلیب دی گئی تھی۔ اُن کی صلیبیں بھی اُسی وقت برآمد ہوئیں مگر اصلی صلیب کی شناخت اس طرح کی گئی کہ ایک بیمار عورت نے اُس کو چھوا اور وہ تندرست ہوگئی اِس معجزے سے ثابت ہوا کہ یہ اصلی صلیب ہے[۲] اس کے بعد قسطنطین اور اس کی ماں نے اس جگہ جہاں سے

[۱] ۔ یہ ایک نان بائی کی لڑکی تھی جس کو روم کے سپہ سالا کونسٹن ٹیئس کلارس نے بیوی بنا لیا تھا یہ شخص شاہی خاندان کا ایک ممبر تھا۔ تخت روم خالی ہونے پر بادشاہت کے لیے اس کا انتخاب کیا گیا۔ ہاں کے رسم ورواج کے لحاظ سے بادشاہ ایک ادنیٰ طبقے کی عورت سے تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ہلینا کو طلاق دیدیا اور وہ اپنے لڑکے قسطنطین (اعظم) کے ساتھ نہایت رنج وغم کی زندگی بسر کرنے لگی۔ جب قسطنطین روم کا فرمانروا ہوا اور اُس نے مذہب عیسوی قبول کر لیا تو یہ بھی عیسائی ہوگئی۔ اور اپنے تئیں خدمت مذہب عیسوی کے لیے وقف کر دیا اور خاوند کے طلاق دیدینے کی وجہ سے جو گوشہ تنہائی میں پڑی ہوئی تھی اس سے باہر نکلی اور کوئی اسّی برس کی عمر میں بیت المقدس کی زیارت کے لیے اپنے فرزند قسطنطین اعظم کے ساتھ روانہ ہوئی اور اصلی صلیب کا پتہ لگایا۔ ہلینا بیت المقدس میں کچھ عرصہ تک رہی اور بیت اللحم اور جبل زیتون پر گرجے بنوائے آخر روم کو واپس ہوئی اور ۳۲۸ء میں اسّی برس کی عمر میں وفات پائی۔ یہ عورت عیسائیوں میں بڑی بزرگ اور ولی سمجھی جاتی ہے اور اسی اعتبار سے اس کو سینٹ ہیلینا کہتے ہیں۔

[۲] ۔ اس صلیب کے بڑے بڑے واقعات ہیں نہایت مختصر یہ کہ ہیلینا نے اس کے دو حصے کر کے ایک حصہ بیت المقدس کے پادری کو دیدیا اور دوسرا حصہ قسطنطنیہ بھیجدیا۔ بیت المقدس اس وقت ہرقل شاہِ روم کی سلطنت میں تھا ایرانی جو ہرقل کی سرحد پر اکثر چھاپے مارا کرتے تھے صلیب کے اس ٹکڑے کو بیت المقدس سے لے گئے۔ ہرقل نے سنہ ۶۱۰ء میں جنگ کے بعد واپس لے لیا اور بغرض حصول برکت قسطنطنیہ اس کو لا کر اولاً کلیسئہ ایا صوفیہ کے گرجے کے مذبح پر رکھا۔ پھر بیت المقدس پہنچا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں اور مجاہدین صلیب کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں اور جنکا سلسلہ ۱۰۹۶ء سے ۱۲۴۹ء تک چلتا رہا۔ اِن میں صلیب کا یہ ٹکڑا کبھی ادھر سے ادھر آیا اور ادھر سے اُدھر گیا۔ (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۶۹)

صلیب برآمد ہوئی تھی۔ مزار شریف اور ایک گرجا تعمیر کرادیا اور قبر جناب مسیح نمودار ہوگئی۔[ل]
آنحضرت کے مرقد مبارک کی یہ حالت نہیں ہے متعدد اشخاص نے آپ کو دفن کیا۔ تخمیناً
۲۵ ہزار آدمیوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ نہ آپ کی قبر شریف مخالفوں کے علاقے میں تھی۔ نہ
اس پر کوئی پہرہ مقرر کیا گیا تھا۔ نہ اس کے محل وقوع میں سلف سے آجتک کسی کو اختلاف
ہوا بلکہ صحابہ ہمیشہ اس کی زیارت کرتے رہے۔ حضرت مسیح کی قبر سوا تین سو برس تک لاپتہ رہی
آنحضرت کی قبر ایک دن بھی بے پتہ نہیں رہی۔

اعتراض نمبر (۲)

برٹن صاحب کہتے ہیں کہ "آنحضرت کی وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی مدینے میں ہل چل
مچ گئی تھی اور لوگوں نے آنحضرت کو غیر فانی سمجھکر آپ کی وفات کا یقین نہیں کیا تھا۔ یہاں تک
کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو دھمکی بھی دی کہ اگر کوئی اس خبر کو سچ سمجھے گا تو قتل کردیا جائے گا
علاوہ ازیں آنحضرت کا جسد (مبارک) ٹھنڈا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خلافت کے متعلق مہاجرین و
انصار میں جھگڑا ہو گیا جس کے بارے میں شیعوں کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کے
مکان کو جو اس جگہ سے جہاں اب روضہ (منورہ) ہے چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع تھا آگ
لگا دینے کی دھمکی دی گئی اور اسی رات کو حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بنائے گئے۔

جواب نمبر (۲)۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلعم کی وفات سے مدینے میں

(بقیہ حاشیہ صہ ۱۶۸)

صلیب کے دوسرے حصے میں سے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے عیسائی دنیا کے تمام بڑے بڑے گرجوں
میں تقسیم کردیے گئے اور یہ تبرک اب بھی بہت سے مقامات پر موجود ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کے رومن کیتھولک
عیسائیوں کے گرجے میں بھی اس صلیب مقدس کا ایک ٹکڑا کوئی پانچ انگل لمبا اور تین انگل چوڑا شیشے کے ایک
فریم میں رکھا ہوا ہے۔ جو یوم صلیب مسیح کی تقریب میں نکالا جاتا ہے۔ یہ گنہگار بھی کئی مرتبہ اس کو آنکھوں سے
لگا چکا ہے۔

ل "تاریخ گبن" "بک آف نالج" "انسائیکلوپیڈیا برٹانکا" "سائیکلوپیڈیا آف انڈیا" "چیمبرز انسائکلو
پیڈیا وغیرہ"۔

کھل بلی ضرور مچ گئی تھی۔ مگر مسلمان آنحضرت ؐ کی زبان مبارک سے انا بشر مثلکم[1] سن چکے تھے اور قرآن شریف میں یہ آیت پڑھ چکے تھے کہ "وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسول افان مات او قتل انقلبتم علے اعقابکم" یعنی محمد بھی خدا کے رسول ہیں۔ جیسے ان سے قبل نبی گزرے ہیں اگر وہ مرجائیں یا مارے جائیں تو کیا تم لوگ اپنے قدیم طریقے پر لوٹ جاؤ گے۔" اس وجہ سے یہ خیال نہیں کیا جاسکتا۔ کہ مسلمان خلاف تعلیم قرآن آپ کو غیر فانی سمجھے ہوئے تھے۔ البتہ آنحضرت ؐ کا مزاج روبا صلاح ہو جانے کے بعد جب کہ کسی کو اندیشہ نہ تھا کہ انتقال ہو جائیگا۔ وفات ہو جانے سے صحابہ حیران و ششدر ہو گئے تھے اب رہی انبیاء و شہدا کی حیات بعد ممات وہ ایک دوسری چیز ہے اور وہ حیات مانع تنا ئےجسمانی نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا آنحضرت ؐ کی وفات کی خبر کو سچ نہ سمجھنا یا اس کے یقین کرنے والے کو قتل کی دھمکی دینا ممکن ہے کہ فرط غم کے باعث ہو یا کسی سیاسی مصلحت پر مبنی ہو جیسا کہ اکثر بادشاہوں اور ناموروں کی موت کا اخفا کیا جاتا ہے اور تنظم و نسق و انتظام قائم ہونے تک اس کا افشا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں اسی طرح کیا عجب ہے کہ حضرت عمرؓ نے بھی اس خیال سے کہ ملحد۔ مرتد۔ یا منافق کوئی فساد برپا نہ کر دیں۔ آنحضرت ؐ کی وفات کی خبر مشہور کر دینا مناسب نہ سمجھا ہو مگر کچھ دیر بعد انہوں نے بھی وفات کا اعلان کر دیا۔ اور پھر وفات یا قبر شریف کے متعلق اُن کو کوئی شبہ نہ رہا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کو وہاں دفن کیا اور خود بھی آنحضرت ؐ کی پائینتی دفن ہوئے۔ اب رہا مسئلہ خلافت اور حضرت فاطمہؑ کے مکان کو جلانے کی دھمکی دینا[2] یہ بالکل بے تعلق بات ہے اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت ؐ کا جسد اطہر حجرہ نبوی میں سپرد خاک نہیں کیا گیا۔

اعتراض نمبر (۳)

برٹن صاحب کہتے ہیں "اگر کوئی شخص حیرت کرے کہ یہ ممکن نہیں کہ آنحضرت ؐ جیسے مشہور

---

[1] میں بھی تمہارے مثل آدمی ہوں۔

[2] یہ واقعات سنی شیعوں میں مختلف فیہ ہیں۔ ان کے متعلق میں کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا جو صاحب تفصیل معلوم کرنا چاہیں وہ کوئی تاریخ ملاحظہ فرمالیں۔

شخص کی قبر لاپتہ ہو تو اس کو مدینے میں ہی ایسی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً حضرت فاطمہ کی قبر مدینے میں تین جگہ بتائی جاتی ہے۔ حالانکہ ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی صاحبزادی اور ائمہ (اطہار) کی والدہ ماجدہ کسی غیر مشہور قبر میں دفن نہ کی گئی ہوں گی۔

جواب۔ حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کی تجہیز و تکفین و تدفین ان کی وصیت کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ ان کے انتقال کی اطلاع کسی کو نہیں کی گئی تھی۔ ان کی نماز جنازہ میں حضرت علیؑ اور اہل بیت میں سے چند آدمیوں کے سوا اور کوئی شریک نہ تھا اور رات کے وقت آپ دفن کی گئیں تھیں۔ غالباً اس عدم تشہیر کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؑ کے ہاتھ سے چونکہ بہت سے دشمنانِ دین مارے گئے تھے اس لیے جنابہ فاطمہؑ کے مدفن کو ظاہر نہ کیا گیا کہ مبادا مقتول کفار کے ورثاء قبر شریف کی بے حرمتی کریں یہی سبب ہے کہ حضرت فاطمہؑ کی قبر کی نسبت مختلف اقوال ہیں اور مختلف گیارہ مقام پر ان کا مدفن بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن جنابہ سیدہؑ کی قبر اطہر کی مثال حضرت سرور کائناتؐ کے مرقد منورہ سے نہیں دی جاسکتی۔ جس کے محل وقوع اور جگہ کے تعین میں آنحضرتؐ کی تاریخ وفات سے آج تک کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ آپ کی تجہیز و تکفین کوئی مخفی طور پر عمل میں نہیں آئی تھی جس کے سبب اہل مدینہ کو آپ کے مدفن کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہوتا۔ علاوہ ازیں یہ ضرور نہیں کہ اگر کسی مشہور و معروف شخص کی قبر کے تعین میں اختلاف ہو تو دوسرے مشاہیر کی قبروں کی نسبت بھی ہم شبہ کرنے لگیں۔

اعتراض نمبر (۴)

برٹن صاحب کہتے ہیں کہ ابتدا سے آج تک آنحضرتؐ کی قبر کی وضع عالم اسلام میں کسی کو معلوم نہیں ہوئی یہی سبب ہے کہ بعض ممالک میں قبریں ابھری ہوئی بنائی جاتی ہیں اور بعض جگہ چپٹی۔ اگر قبر (شریف) کی شکل معلوم ہوتی تو لوگ اسی کو سنت قرار دے کر اسی شکل کی قبریں بناتے اور پھر قبروں کی وضع میں اختلاف نہ ہوتا۔"

جواب۔ حجرۂ مبارک جس میں آنحضرتؐ دفن ہیں۔ ابتدا میں وہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے مکان میں کھجوروں کی شاخوں سے بنا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے اسی حجرے میں وفات فرمائی۔ اور وہیں دفن کیے گئے اور حضرت عائشہؓ بھی بدستور اسی میں مقیم رہیں قبر شریف

اور ان کے گھر کے درمیان کوئی آڑ نہ تھی مسلمان زیارت قبر شریف کے لیے آیا کرتے تھے۔ بعد میں حضرت عائشہ رضؓ نے اپنے مکان اور قبر شریف کے بیچ میں ایک دیوار اٹھائی۔ اس کے بعد ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر رضؓ اسی میں دفن کیے گئے آنحضرتؐ کی قبر کے دیکھنے کا لوگوں کو اچھی طرح موقع ملا۔

حضرت عمر رضؓ نے اپنے عہد خلافت میں جب مسجد نبوی کی تعمیر کرائی تو ۱۷ھ میں حجرۂ شریف کو کچی اینٹوں سے بنوا دیا اور اس میں ایک دروازہ بھی رکھا جس میں داخل ہو کر لوگ زیارت کرتے تھے۔ دیوار میں ایک سوراخ بھی تھا اس میں سے ہاتھ ڈال کر لوگ قبر کا مقدس مٹی کی خاک بھی اٹھالیا کرتے تھے زیارت بھی کرسکتے تھے۔ بعد ازاں ۲۵ھ میں حضرت عمر رضؓ اسی حجرے میں دفن کیے گئے اب پھر تمام اہل مدینہ کو حجرۂ شریف میں داخل ہونے اور آنحضرتؐ کے مزار کے دیکھنے کا اچھی طرح موقع ملا۔ حضرت امام حسن علیہ السّلام نے بھی ۵۰ھ میں یہ وصیت فرمائی تھی کہ ان کو اسی حجرے میں یعنے ان کے نانا کے پہلو میں یا جنت البقیع میں دفن کریں۔ جناب امام حسن علیہ السّلام کی یہ وصیت خاندان رسالت کے ایک بڑے رکن ہونیکی وجہ سے اس امر کے ثبوت کے لیے کہ آنحضرتؐ اسی حجرے میں مدفون ہیں بہت اہم شہادت ہے۔

سید سمہودی[۱] بروایت معتبر نقل کرتے ہیں کہ جب قاسم بن محمد بن ابوبکر رضؓ نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہ رضؓ سے ان قبروں کی زیارت کے لیے عرض کیا تو انھوں نے حجرہ کھول دیا۔ قاسم نے تین قبریں دیکھیں جو نہ تو زیادہ بلند تھیں اور نہ زمین سے ملی ہوئی یعنی کسی قدر اٹھی ہوئی چپٹی قبریں تھیں اور ان پر موضع عرصہ کے سرخ رنگ کے سنگریزے بچھے ہوئے تھے قبروں کی ترتیب یہ تھی کہ اول آنحضرتؐ کی قبر ان کے دوش مبارک کے محاذی حضرت ابوبکر رضؓ کا سر حضرت ابوبکر رضؓ کے کندھے کے نزدیک حضرت عمر رضؓ کا سر (خلاصۃ الوفا باب ۴ فصل ۱۰ صفحہ ۱۴۱) علاوہ ازیں حدیث کی مشہور کتاب صحیح بخاری میں سفیان ثوری اور ابو داؤد کی دو روایتیں موجود ہیں جن سے آنحضرتؐ کی قبر کا سطح یعنے چپٹا ہونا ثابت ہے۔ (نزہۃ الناظرین مولفہ جعفر برزنجی

---

[۱] قاسم حضرت ابوبکر رضؓ کے پوتے اور جلیل القدر تابعی تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ان کے نواسے تھے۔ قاسم کی وفات ۱۰۷ھ میں ہوئی اور مدینۂ منورہ میں دفن ہوئے۔

مطبوعہ مطابع عالیہ مصر ص۶۵)

امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ کی قبر ایک بالشت اونچی چپٹی قبر تھی۔ ان امور کے متعلق وضع و ہیئت قبور کے زیر عنوان تفصیل سے اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔

حضرت عمرؓ کا بنوایا ہوا کچی اینٹوں کا حجرہ ولید بن عبد الملک کے زمانہ تک رہا۔ ۹۱ھ میں ولید[۱] بن عبد الملک کے حکم سے عمر بن عبد العزیز[۲] حاکم مدینہ نے وہ حجرہ منہدم کرا کے کچی اینٹوں سے حجرہ تعمیر کرایا اور اس کے باہر ایک اور مخمس سنگین حجرہ بنوایا اور دونوں حجروں میں کسی میں بھی دروازہ نہ رکھا اس وقت سے قبر شریف حضرت سرور کائناتؐ زائرین کی نگاہ سے پوشیدہ ہوگئی۔

بیانِ مذکورہ بالا سے واضح ہے کہ ۹۰ھ تک یعنی آنحضرتؐ کی وفات سے جو ۱۱ھ میں ہوئی اناسی برس تک حضرت عمرؓ کا بنوایا ہوا حجرہ قائم رہا۔ اس وقت تک آنحضرتؐ کا مرقد مبارک اور دونوں صحابہؓ کی قبریں بارگاہ خاص و عام ہیں اور حجرے کا دروازہ کھول کر اور اس کی دیوار کے سوراخ میں سے لوگ زیارت کرتے رہے اور آنحضرتؐ کی قبر شریف کی وضع و شکل کی زیارت سے مشرف ہوتے رہے اس پر برٹن صاحب کا یہ کہنا کہ

"ابتدائے اسلام سے آنحضرتؐ کی قبر کی وضع کسی کو معلوم نہیں"

سخت غلطی ہے۔

اب رہا یہ امر کہ آنحضرتؐ کی قبر کی وضع سنّت سمجھ کر تمام اسلامی ممالک میں اسی وضع کی

---

[۱]۔ ولید بن عبد الملک خاندان بنی امیہ کا چھٹا خلیفہ تھا ۸۶ھ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس کے زمانہ میں مسجد نبوی کی توسیع و حجرہ شریف کی تعمیر ہوئی۔ جس کی ابتداء ۸۸ھ ہجری میں اور اختتام ۹۰ھ ہجری یا ۹۱ھ ہجری میں ہوا۔ ولید کی وفات ۹۶ھ ہجری میں ہوئی۔

[۲]۔ عمر بن عبد العزیز خاندان بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے اور اس تمام خاندان میں نہایت نیک تھے ڈھائی سال خلیفہ رہے۔ ۱۰۱ھ ہجری میں وفات پائی۔

قبریں کیوں نہیں بنائی جاتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت اس کام کو کہتے ہیں جو آنحضرتؐ نے خود کیا یا جو کام آپ کے سامنے کیا گیا اور اس کو آپ نے منع نہ فرمایا۔ اس اصول سے آنحضرتؐ کی قبر جو بعد وفات بنائی گئی اس کی وضع سنت نہیں کہلا سکتی اور نہ اسکی اتباع واجب ہے۔ اس وجہ سے مختلف ممالک میں مختلف شکل کی قبریں بنائی جاتی ہیں۔ البتہ آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ وغیرہ کی قبریں جس وضع کی بنوائی تھیں وہ سنت کہلا سکتی ہے۔ مثلاً ہم مختصر طور پر دو ایک بزرگواروں کے حالات دفن لکھتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں سب سے پہلے حضرت عثمان بن مظعون صحابی مہاجر دفن ہوئے۔ جن کا سنہ وفات باختلاف روایات ۲ یا ۳ھ ہے۔ ان کی قبر کی نسبت آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ لحد بنائیں۔ دفن کر دینے کے بعد ایک پتھر بچ رہا تو آنحضرتؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر قبر کے سرھانے نصب کر دیا۔ جب سیدنا ابراہیم ابن رسول اللہؐ نے جمادی الثانی ۹ ہجری میں چھ مہینے کی عمر میں وفات پائی تو حسب الارشاد آنحضرتؐ اُن کو عثمان بن مظعون کے پہلو میں دفن کیا گیا اور آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے قبر ابراہیم پر مٹی ڈالی۔ پانی چھڑکا۔ اور سنگریزے بطور بندش کے جمائے مذکورہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ قبر کا لحد بنانا ہو سکے تو سرھانے کوئی پتھر نصب کرنا قبر پر مٹی ڈالنا۔ پانی چھڑکنا اور قبر کے حاشیہ پر بندش کے طور پر پتھر کے ٹکڑے جما دینا سنت ہے۔ قبر کی بیرونی ساخت کے متعلق مسطح کو زیادہ ترجیح ہے کیونکہ روایت ہے کہ آنحضرتؐ کی قبر اول مسطح تھی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کی تعمیر کے وقت جب دیوار کی مٹی قبر پر گری تو وہ کسی قدر اونچی ہو گئی۔ اسی سبب سے اسلامی ممالک میں مسطح اور ڈھلوان دونوں وضع کی قبریں بنائی جاتی ہیں اور دوسرے امور یعنی لحد بنانا۔ پانی چھڑکنا۔ وغیرہ بطور سنت انجام دیئے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام نے انسداد قبر پرستی کے خیال سے قبر کی شکل و وضع کو بہت ہی ناقابل التفات شئے قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر پختہ قبروں سے جو خلاف سنت ہوتی ہیں۔ کچی قبریں افضل سمجھی جاتی ہیں اور آنحضرتؐ کی اصل قبر شریف بھی کچی ہی قبر ہے۔ جس پر نہ کتبہ ہے نہ لوح نہ تعویذ۔ اور یہ ہے کہ جو چیز فنا ہونے والی اور مٹ جانے والی ہے اس کے قیام کی فکر کرنا اور اس کی ظاہری وضع قطع کو زیادہ اہمیت دینا ہی عبث ہے۔ حضرت دردؔ نے خوب

کہا ہے:-

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

اعتراض نمبر (۵)

برٹن صاحب کہتے ہیں کہ "علی العموم سب لوگوں کا خیال ہے کہ حجرہ (مبارک) میں تینوں قبریں اس طرح بنی ہوئی ہیں۔

قبر نبیؐ

قبر ابوبکرؓ

قبر عمرؓ

مگر مسلمان مورخ اس سیدھی سادھی بات پر بھی متفق نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ حجرہ شریف میں تینوں قبریں برابر برابر اس طرح بنی ہوئی ہیں:-

قبر نبیؐ

قبر ابوبکرؓ

قبر عمرؓ

کوئی کہتا ہے کہ آنحضرتؐ کی قبر آگے ہے اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبر اس کے پیچھے یعنی اس طرح

قبر نبیؐ

قبر ابوبکرؓ　　قبر عمرؓ

بعض مورخ یہ ترتیب بتاتے ہیں۔

قبر عمرؓ

قبر نبیؐ

قبر ابوبکرؓ
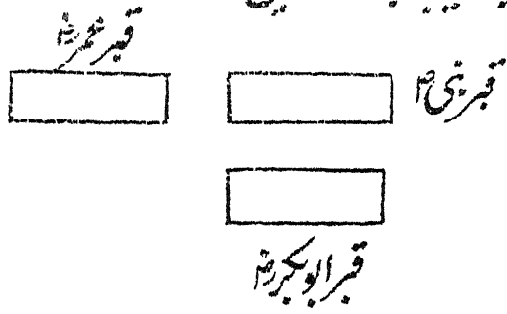
جواب۔ یہ بات مسلمان مورخوں کی انتہا درجے کی صاف بیانی و حق گوئی کی دلیل ہے کہ وہ کسی واقعہ کی نسبت صرف اُسی روایت پہ اکتفا نہیں کرتے جو تحقیق کے بعد ان کو صحیح معلوم ہو بلکہ اس واقعہ کی نسبت اُن کو جس قدر روایتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ بالا لحاظ قوی و ضعیف سب لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اکثر مورخین اصول درایت کے اعتبار سے روایت کے ضعف وصحت کی بھی صراحت کردیتے ہیں۔ چنانچہ ترتیب قبور حجرۂ شریف کے متعلق جو مختلف روایتیں آئی ہیں۔ ان سب میں بالاتفاق تمام مورخ شکل اول ہی کو صحیح سمجھتے ہیں جس کے راوی نہایت معتبر ہیں اور سلسلہ روایت حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ تک پہنچتا ہے جس کی صراحت جواب نمبر (۴) میں کی جاچکی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ان قبروں کی مختلف ترتیب لوگوں نے کیوں بیان کی اور سب نے ایک ہی ترتیب کے ساتھ ذکر کیوں نہ کیا۔ اس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ایک عرصہ کے بعد قلمبند کیا جاتا ہے اور روایت در روایت کا سلسلہ قایم ہوجاتا ہے تو اکثر ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ترتیب وغیرہ میں اختلاف ہوجایا کرتے ہیں۔ امتداد زمانہ کے باعث روایتوں میں اختلاف پیدا ہوجانا تو بالکل بدیہی و لازمی بات ہے۔ لیکن اگر کسی واقعہ کے پیش آتے ہی بلاتوقف و فی الفور دس آدمی چشم دید حالات بیان کریں تو دس آدمیوں کی دس باتیں ہوں گی۔ اور اس قسم کی سیدھی سادھی باتوں میں وہ بمشکل متفق ہوسکیں گے اگر ایک ہی گھر کے رہنے والوں سے ان کے مکان کے دروازوں، سیڑھیوں اور طاقوں کی ترتیب و تعداد کے بارے میں سوالات کیے جائیں تو ممکن نہیں کہ اُن کے بیان میں اختلاف نہ ہو۔ میرے خیال میں دنیا میں ایسے بہت کم لوگ نکلیں گے جن کو اپنے ہر واڑ کی تفصیل

اور اپنے باپ دادا کی قبروں کی ترتیب ٹھیک یاد ہو۔ پس حجرۂ شریف کی قبروں کی ترتیب کے بیان میں بھی اگر اختلاف ہوا تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ برٹن صاحب نے تو قبروں کی صرف چار ہی شکلیں دکھائی ہیں ہم مختلف آٹھ شکلیں اوپر تحریر کر چکے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ایک پہلی ہی شکل کے مختلف نقشے ہیں۔ جو ذرا ذرا سے سہو نظری کے باعث راویوں نے قایم کر دیے ہیں۔ یہ فخر بھی انھیں قبروں کو حاصل ہے کہ ان کی تفصیل و تشکیل کے ساتھ ان کی ترتیب کے متعلق بھی علماء نے تحقیق اور چھان بین کی ہے ورنہ دنیا کے بہت سے پیغمبروں پیشواؤں اور بانیانِ مذہب کی قبروں کو کوئی جانتا بھی نہیں کہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ مسلمان اس قسم کے متبرک مقامات میں پہنچکر کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت تصور اور مراقبہ اُن کو اینٹ پتھر کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کی اندرونی حالت مسلمانوں سے بہتر بعض عیسائیوں نے لکھ دی ہے۔ مسلمان وہاں ہیبت کے مارے ادھر اُدھر دیکھ نہ سکے۔ خدا کے خوف سے لرزتے۔ کانپتے۔ روتے۔ دھوتے رہے۔ اور عیسائیوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سب کچھ دیکھ لیا کہ دیوار پر غلاف کس کپڑے کا ہے۔ چھت میں کتنے شہتیر ہیں اور قندیلیں سونے کی ہیں یا چاندی کی۔

اعتراض نمبر (۶)

برٹن صاحب کہتے ہیں۔ اس بارے میں علماء کے اقوال بھی مختلف ہیں۔ سمہودی[1] جو سب سے زیادہ معتبر مورخ ہیں۔ اپنے قول کی خود تردید کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صندوق میں دفن ہیں اور بقول برکھارٹ[2] سمہودی کے یہ الفاظ ہیں :-

---

[1] سید سمہودی اور ان کی تالیفات کا ذکر اس کتاب کے شروع میں کیا جا چکا ہے۔

[2] برکھارٹ باشندہ سوئٹزرلینڈ نے ۱۸۱۴ء میں سفر حجاز کیا تھا۔ یہ عربی سیاحوں کا بادشاہ کہلاتا ہے اس کی تصانیف میں سفرنامۂ عرب۔ سفرنامہ شام۔ سفرنامہ نوبہ۔ اور بدویوں اور وہابیوں کے حالات بہت مشہور ہیں۔ اس کے سفرنامۂ عرب کا ترجمہ یہ درویش اردو میں مکمل کر چکا ہے۔ جس کی پہلی جلد حیدرآباد دکن کے مطبع تاج میں طبع ہو چکی ہے۔ برکھارٹ کا سفرنامۂ عرب اس کی وفات کے بعد (بقیہ مضمون بر صفحہ ۱۷۸)

"پردے سے ڈھکا ہوا سیاہ پتھر کا ایک مربع حجرہ ہے جس کے اندر
آنحضرت ؐ اور دو صحابہ کی قبریں ہیں جو بہت گہری ہیں اُس صندوق پر
جس میں آنحضرت ؐ دفن ہیں چاندی منڈھی ہوئی ہے اور اُس کے ڈھکنے پر
سنگِ مرمر کا کتبہ نصب ہے۔ جس پر بسم اللہ اور اَللّٰھُمَّ
صَلِّ عَلَیہ کندہ ہے۔"

دوسرے مقام پر سمہودی کہتے ہیں کہ:۔

"۸۹۲ھ میں جب قائد بے نے حجرۂ شریف کی مرمت کرائی تھی تو میں
حجرے میں داخل ہوا اور اُس کے اندر تین گہری قبریں دیکھیں جو
ملبے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ مزاروں کا وہاں کوئی نشان نہ تھا۔ جب
ملبہ ہٹایا گیا تو بڑی مشکل سے آنحضرت ؐ کی قبر معلوم ہوئی۔"

قلقشندی[۱] کہتے ہیں کہ:۔

"حجرۂ مبارک کے اندر آنحضرت ؐ اور خلیفہ اول و دوم کی قبریں ہیں
اور آنحضرت ؐ کے مرقد پر سنگِ مرمر کا ایک تختہ کا نصب ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷)

مرتب ہوا تھا۔ اس لیے غالباً حجرۂ شریف کے حالات میں مرتب کنندگان نے کچھ تحریف کردی ہے۔ ورنہ برکھارٹ جیسے محقق سے یہ امر بعید تھا کہ وہ سمہودی کا مطلب نہ سمجھتا یا غلط بیانی کرتا۔ برکھارٹ نے اپنے سفرنامے میں تاریخوں کے جو حوالے دیے ہیں اکثر وہ صحیح ہیں۔ اور واقعات مندرجہ سفرنامہ کی میں نے خود حجاز میں تطبیق کی اور ان کو اکثر صحیح پایا۔

[۱] قلقشندی کا پورا نام الشیخ ابی العباس احمد القلقشندی المصری ہے۔ ان کی کتاب "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشا" فن انشا میں بے مثل و بے نظیر کتاب ہے۔ جو چودہ جلدوں میں مصر میں چھپی ہے اس کا ایک فقرہ برٹن صاحب نے لے کر بعد تحریف پیش کردیا ہے۔ قلقشندی کی وفات ۸۲۱ھ میں ہوئی۔

ابن جبیر[1] جنھوں نے ۵۸۰ھ میں زیارت کی تھی تحریر کرتے ہیں کہ:-

"آنحضرت کا تابوت آبنوس کا ایک صندوق ہے جو صندل کی لکڑی سے ڈھکا ہوا ہے اور اُس پر چاندی کے پتّر جڑے ہیں وہ ایک پردے کے پیچھے رکھا ہوا ہے اور اُس کے چاروں طرف لوہے کی جالی بنی ہوئی ہے۔

(سفرنامہ برٹن جلد اول صفحہ ۳۲۳ و ۳۲۴)

جواب۔ اگرچہ برٹن صاحب نے سید سمہودی۔ قلقشندی اور ابن جبیر کے بیانات کا اقتباس و ترجمہ غلط لکھ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ علما کو قبر شریف کے متعلق اختلاف ہے۔ مگر پھر بھی ان کا مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ اور قبر شریف کا فرضی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ تینوں مورخین متذکرہ کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ اسی مقام پر دفن ہیں اور قبر مبارک اسی حجرے میں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آیا زمین میں دفن ہیں یا صندوق میں۔ یہ بھی ہم ابھی ثابت کر دیتے ہیں کہ اس امر میں بھی علمار کو اختلاف نہیں ہے صرف برٹن صاحب کی عدم قابلیت یا تعصب نے ان کو صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رکھا ہے۔ قبل اس کے کہ آنحضرتؐ کے صندوق میں دفن ہونے نہ ہونے کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حجرۂ شریف اور اُس صندوق کی مختصر کیفیت تحریر کر دیں تاکہ اس بات کے سمجھنے میں آسانی ہو کہ صندوق زیر بحث کیا چیز ہے وہ کہاں رکھا ہوا تھا اور کس لیے۔ اگرچہ ہم مختلف عنوانوں کے تحت میں حجرۂ شریف۔ غلاف۔ گیلری۔ جالی مبارک۔ مواجہہ شریفہ اور صندوق صندل کے حالات بالتفصیل پہلے تحریر کر چکے ہیں مگر محض اس خیال سے کہ بیان میں اُلجھن نہ ہو جائے یہاں بھی اس قدر اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حجرۂ شریف

---

[1] محمد ابن جبیر اندلسی قدیم سیاحوں میں بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ۵۴۰ھ ہجری میں بمقام بلنسیہ پیدا ہوئے تھے۔ ۵۸۰ھ ہجری میں حج و زیارت کی۔ اور ۶۱۴ھ ہجری میں بمقام اسکندریہ وفات پائی۔ ان کا سفرنامہ نہایت معتبر و مستند کتاب ہے۔ جو ۱۸۵۲ء ہجری میں بمقام لیڈن واقع جرمنی عربی میں طبع ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ مولوی احمد علی صاحب شوق رامپوری نے اردو میں بھی کر دیا ہے۔

جس میں آنحضرتؐ و حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبریں ہیں اور جس پر گنبد خضرا قائم ہے سب طرف سے بند ہے۔ اس کے گرد ایک مخمس شکل کا سنگین احاطہ ہے۔ اس میں بھی کوئی دروازہ نہیں ہے۔ اس کی دیواروں پر اوپر سے نیچے تک غلاف پڑا رہتا ہے۔ اس مخمس کے بعد کہیں دو ڈھائی گز اور کہیں تین چار گز جگہ بطور گردش یا گیلری کے چھوڑ کر چھ گز اونچی ڈھلی ہوئی سبز جالی نصب ہے۔ گیلری کی چھت میں قندیلیں اور فانوس لٹکے ہوئے ہیں اور گیلری کے فرش پر صندوق صندل، شمعدان۔ اور عود سوز وغیرہ رکھے ہوئے ہیں جالی میں چار دروازے ہیں مگر صرف ایک دروازے سے خدام گیلری کی صفائی و روشنی کے لئے اس جالی کے اندر داخل ہوتے ہیں اور صرف گیلری میں چل پھر سکتے ہیں۔ یا حجرے کی دیواروں کو باہر سے چھو سکتے ہیں حجرے کے اندر جانے کے لیے نہ کوئی دروازہ ہے نہ جھانکنے کے لیے کوئی کھڑکی نہ روشندان۔ عام زائرین کو اس جالی کے اندر جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ کبھی کبھی بعض مقدس و متمول اشخاص کو بطور خاص جالی کے اندر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ البتہ جالی کے بیچ میں ایک ایک بالشت گول کئی کھڑکیاں ہیں ان میں سے جھانک کر زائرین جالی کے اندر کی کیفیت اور اس گیلری کی حالت معلوم کر سکتے ہیں۔ صندوق زیر بحث اسی جالی کے اندر منجملہ اور تحائف کے رکھا ہوا تھا۔ جس سے غرض یہ تھی کہ صندل محفوظ رہے۔ حجرہ اس کی خوشبو سے معطر ہو۔ آنحضرتؐ کے سرہانے کی تمیز ہو سکے اور زائرین اس کے مقابل کھڑے ہو کر صلواۃ و سلام پڑھیں۔ اگلے زمانہ میں اس صندوق کو صندوق مواجہہ شریفہ یعنی آنحضرتؐ کے سرہانے کی سمت ظاہر کرنے والا صندوق کہتے تھے اور آج کل اس کو صندوق صندل کہتے ہیں۔ جعفر برزنجی مدنی مولف کتاب نزہتہ الناظرین اس کے ذکر میں سمہودی و ابن جبیر کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کچھ عجب نہیں کہ اس صندوق کی ابتدا حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی ہو اس کے بعد دوسرے سلاطین و خلفا نے بھی اس کی پیروی کی۔

(نزہتہ الناظرین۔ جعفر برزنجی صد ۷۲ و ۷۳)

زمانہ قدیم سے آج تک روضے کے اندر صندوق صندل رکھنے کا دستور چلا آرہا ہے

چنانچہ اس زمانے میں بھی جالی کے اندر ایک صندوق اسی غرض سے رکھا ہوا ہے۔ زمانہ حال کے سیاحوں نے اپنے سفرنامے میں اس صندوق کا ذکر کیا ہے اور صاحب کتاب "السکینۃ باخبار المدینۃ" نے حجرۂ شریف کے جو تین نقشے اپنی کتاب میں دیے ہیں اُن میں جالی کے اندر یہ صندوق رکھا ہوا دکھایا ہے۔ ۱۳۲۵ھ[1] میں خود میں نے بھی یہ صندوق دیکھا ہے جس کا ذکر مواجہہ شریف کے ضمن میں کیا ہے۔ اُس ستون کو جس کے نیچے یہ صندوق رکھا ہوا ہے "اسطوانۃ الصندوق" کہتے ہیں۔ سید سمہودی نے جس صندوق کا ذکر حجرۂ شریف کے بیان میں کیا ہے وہ یہی صندوق ہے۔ جس کو برٹن صاحب نے خوش فہمی سے تابوت سمجھ لیا۔ مزید توضیح کے لیے مورخ ممدوح کی تاریخ خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ کی ہم اصل عربی عبارت یہاں نقل کرتے ہیں۔

اما علامۃ جھۃ الراس الشریف فصندوق مصفح بالفضۃ باصل الاسطوانۃ الاّ صقۃ بحائز القبر الشریف عند نہایۃ الصفحۃ الغربیۃ منہ مما یلی القبلۃ فی صف اسطوانۃ السریر واسطوانۃ التوبۃ ولم اعلم ابتداء حدوثہ واقدم من ذکرہ ابن جبیر فی رحلۃ وکانت قبل الحریق الاوّل عام ثمانین وخمسمائۃ وقال انہ قبالۃ راس النبی صلی اللہ علیہ وسلم (قلت) وفیہ تجوز فقد ظہر لنا انہ فی محاذاۃ الجدار الداخل القبلی واللحد الشریف الی جدار المذکور کما سیاتی والاصل فی ذالک ما روی جعفر بن محمد بن علی بن الحسین عن ابیہ عن جدہ رضی اللہ عنہم انہ کان اذا جاء یسلم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقف عند الاسطوانۃ التی تلی الروضۃ ای وھی المتقدمۃ ثم یقول ھھنا راس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والمراد منہ ما قدمناہ وکان فوق ھذا الصندوق قائم من خشب یحیط بما ظہر من اسطوانۃ الی راس اعلی رخام الحجرۃ مختتم۔ مصفح

[1] اس کے مولف مولوی محمد صبغۃ اللہ صاحب مہاجر ساکن مدراس ہیں۔ جنھوں نے ۱۳۲۵ھ میں زیارت مدینہ منورہ کی تھی۔

بصفائح الفضة المموهة فلما احترق مع الصندوق فی الحریق الثانی اعید الصندوق وجعل موضع الفائم رخام کتب فیه البسملة و التسلیم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیر ذالك"

(خلاصة الوفا باخبار دار المصطفیٰ مولفہ سمھودی مطبوعہ مطبع میرمیة الکائنة مکہ باب چہارم فصل (۱۱) صفحہ ۱۴۳)

ترجمہ عبارت مذکورہ بالا کا یہ ہے۔

سر مبارک کی سمت کی علامت ایک صندوق تھا جس پر چاندی کے پتر جڑے ہوئے تھے اور وہ اس کھم کے نیچے رکھا ہوا تھا جو غربی دیوار کے سرے پر قبر شریف کے متصل ہے اور یہ مقام ستون سریر اور ستون توبہ کے سلسلے میں ہے مجھے معلوم نہیں کہ اس کی ابتدا کب ہوئی تھی سب سے پہلے ابن جبیر نے اس کا ذکر اپنے سفرنامے میں حریق اول سے قبل ۵۸۰ھ ہجری میں کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلعم کے سرہانے کی علامت ہے۔

میں کہتا ہوں اور ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (صندوق) دیوار داخل قبلہ رو اور لحد شریف کے محاذی تھا جو دیوار مذکور کی طرف ہے جیسا کہ اب ذکر آتا ہے اور اس کی اصلیت اس روایت سے ہے جو جعفر[1] ابن محمد[2] ابن علی[3] بن حسین رضی اللہ عنہم نے اپنے پدر بزرگوار و جد امجد سے روایت کی ہے

[1] جعفر صادق علیہ السلام سلسلۂ امامت اثنا عشری کے لحاظ سے چھٹے امام ہیں ۸۳ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں زہر سے شہید کیے گئے۔

[2] آپ پانچویں امام ہیں۔ آپ کے لقب باقر و ہادی وغیرہ ہیں ۵۷ھ میں آپ تولد ہوئے معرکہ کربلا میں آپ تین سال کے تھے ۱۱۷ھ میں زہر سے شہید کیے گئے۔

[3] آپ کا نام علی بن حسین اور لقب زین العابدین سجاد اور بیمار کربلا وغیرہ ہیں۔ آپ چوتھے امام ہیں ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۴ھ میں زہر سے شہید کیے گئے۔

وہ یہ کہ جب وہ آنحضرت صلعم پر سلام پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے تو اس کھمبے کے پاس ٹھہر جایا کرتے تھے جو روضہ کے قریب ذرا آگے کی طرف ہے اور فرمایا کرتے تھے کہ اسی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک ہے اور اس سے اُن کی مراد وہی مقام ہے۔ جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا اور اس صندوق کے اوپر لکڑی کی ایک تختی منقش آویزاں تھی اس پر چاندی کے چمکدار تیر جڑے تھے اور اس سے حجرے کے اندر والے سنگین ستون کا بالائی حصہ آڑ میں آگیا تھا۔ جب دوسری آتشزدگی میں یہ تختی مع صندوق کے جل گئی تو دوسرا صندوق رکھ دیا اور اس تختی کی جگہ سنگِ مرمر کا ایک چوکا لگا دیا۔ جس پر بسم اللہ وصلواۃ وسلام وغیرہ لکھدیا گیا تھا۔"

برٹن صاحب کی خوش فہمی پر ناظرین غور فرمائیں۔ سمہودی کے مذکورہ بالا بیان سے یہ مفہوم کہاں ہوتا ہے کہ آنحضرت صندوق میں دفن ہیں۔ ہم نے مانا کہ برٹن صاحب نے تاریخ سمہودی خود نہیں دیکھی تھی بلکہ برکھارٹ کے سفرنامے سے سمہودی کا حوالہ دیدیا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے سفرنامہ کی جلد اول صفحہ ۳۲۳ وصفحہ ۳۴۴ میں تحریر کیا ہے مگر یہ امر ایک محقق مورخ کی شان سے بہت گرا ہوا ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے کسی کتاب کا غلط حوالہ دیدے اور وہ بھی ایسے اہم امر کے متعلق۔ اس سے برٹن صاحب کی تحقیقات اور برکھارٹ کی عربی دانی آئینہ ہوگئی۔ چونکہ عیسائی عموماً صندوق میں دفن کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں قبر کے ذکر کے ساتھ صندوق کا لفظ بھی جو آگیا تو برٹن صاحب کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوگیا کہ آنحضرت صندوق میں دفن ہیں۔ اور ساتھ ہی تابوت کی مناسبت سے سنگِ مرمر کے چوکے کو کتبہ سمجھ لیا اور یہ تصور کرلیا کہ جس طرح عیسائیوں کے تابوت پر متوفی کا نام وسنہ ولادت ووفات وغیرہ عبارت لکھ دی جاتی ہے ایسے ہی آنحضرت کے تابوت پر بسم اللہ اور اللھم صل علی کندہ ہے۔

اسی صندوق کا ذکر ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے جس کا حوالہ سمہودی کے

بیان میں بھی موجود ہے۔ اور اس جگہ بھی برٹن صاحب نے تابوت سمجھا ہے۔ بخیال مسٹر برٹن سمہودی کی متضاد بیانی کی کامل صراحت کر چکنے کے بعد ہم ابن جبیر کی عربی عبارت پیش کر کے برٹن صاحب کی عربی دانی پر روشنی ڈالیں گے۔ سر دست ان کے اعتراض کے دوسرے جز کی توضیح کی جاتی ہے جس کو انھوں نے سمہودی کی اختلاف بیانی سے تعبیر کیا ہے۔

۸۸۱ھ میں سلطان قائد بے (قائتبائی) مصری کے زمانے میں حجرۂ شریف کی مرمت کے وقت سمہودی کو جو شرفِ باریابی حاصل ہوا تھا اس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب "خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفٰی" کے باب ۴ فصل ۱۲ میں کیا ہے جس کا ترجمہ واقتباس حسب ذیل ہے[۱]۔

"شعبان ۸۸۱ھ میں دوسری آتشزدگی سے قبل سلطان مصر قائد بے نے حجرۂ شریف کی دیواروں کی ترمیم کرنے اور بجائے چھت کے گنبد تعمیر کرانے کے لیے شمس ابن زمن کو مدینہ منورہ روانہ کیا اور بعد صلاح و مشورہ علمائے وقت حجرے کی دیواروں کو جو بعض جگہ سے شق ہو گئی تھیں منہدم کیا گیا اور دیواروں کا ملبہ جو قبور شریف پر گر گیا تھا جب صاف کر دیا گیا تو اللہ تعالےٰ سے توفیق حسن ادب و تعظیم کے لیے دعا کر کے حجرے کے پیچھے کی جانب سے میں اندر گیا اور بعد صلواۃ و سلام و تشفع و توسل میں نے حجرے پر نظر ڈالی اور اس خیال سے کہ اُن مشتاقوں کے لیے بھی جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں ایک تحفہ لے جانا چاہیے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو اس متبرک مقام سے متمتع کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس حجرے کی سطح ہموار زمین ہے اور قبور شریف کے اس میں کوئی آثار نہیں ہیں۔ حجرے کے بیچ میں ایک جگہ کسی قدر بلند تھی لوگوں نے خیال کیا کہ یہی مقام قبر شریف ہے اور بعض لوگوں نے تبرکاً اس جگہ کی خاک اٹھائی مگر ان کا یہ خیال غلط تھا کیونکہ آنحضرتؐ کی قبر مبارک بروایت معتبر حجرے کی دیوار کے قریب ہے

[۱] توضیحاً ملاحظہ ہو مضمون تحت عنوان "مزار اقدس کی مرمت سلطان قاید بے کے زمانے میں"۔

نہ کہ بیچ میں۔ اس کے بعد حجرے کی قبلہ رُخ دیوار کے نزدیک حسب روایات واقوال مشہورہ قبریں بنا دیں اور ایک حجرہ و گنبد تعمیر کر دیا۔ اس حجرے کی دیوار شامی کے وسط میں ایک چھوٹی سی کھڑکی رکھی گئی جس میں سے عود و عنبر وغیرہ حجرۂ شریف میں سلگاتے تھے جب بعض لوگ منتیں مرادیں ماننے کیلئے درخواستیں لکھ لکھ کر اس کھڑکی میں سے حجرے کے اندر ڈالنے لگے تو اس کھڑکی کو بھی بند کر دیا۔ اس عمارت کی تکمیل ۸۸۱ھ میں ۱۷ شوال کو پنجشنبہ کے دن دوسری آتشزدگی سے قبل ہوئی"۔

(تاریخ سمہودی مطبوعہ مطبع میریہ مکہ ص ۱۴۹ تا ۱۵۲)

سمہودی کے بیانِ مذکورۂ بالا میں اور اس بیان میں جو برٹن صاحب نے نقل کیا ہے اختلاف ہے۔ سمہودی کی اصل عبارت میں یہ فقرہ نہیں ہے کہ

"تین گہری قبریں دیکھیں"

برخلاف اس کے سمہودی فرماتے ہیں کہ

"حجرے کی سطح ہموار زمین ہے"۔

سنہ تعمیر بھی برٹن صاحب نے غلط تحریر کیا ہے۔ یہ واقعہ ۸۸۱ھ کا ہے نہ کہ ۸۹۲ھ کا برٹن صاحب نے اس تعمیر کو دوسری آتشزدگی کے بعد کی تعمیر ظاہر کیا ہے۔ وہ تعمیر ۸۸۱ھ میں ختم ہوئی تھی۔ اس آگ سے حجرۂ شریف بالکل صحیح و سالم رہا تھا اور اس وقت اس کے اندر کوئی داخل بھی نہیں ہوا تھا۔

آثار قبور کی عدم موجودگی کے متعلق سمہودی کا بیان بالکل صحیح و قرین قیاس واقعہ ہے۔ کچی قبریں جو بلند یا اُبھری ہوئی نہ ہوں اور جن پر مزار لوح و کتبہ وغیرہ کچھ نہ ہو اور جو سینکڑوں برس تک موسم و آب و ہوا کے مختلف تغیرات تری۔ نمی وغیرہ سے متاثر ہو چکی ہوں۔ جب اُن پر دیواروں کا ملبہ گرے اور اُس کو صاف کیا جائے تو بجز اس کے کہ وہاں مسطح زمین برآمد ہو اور کیا دکھائی دے سکتا ہے[۱]۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہاں قبریں

[۱] ۶۵۴ھ میں پہلی آتشزدگی کے وقت حجرے کی چھت گر گئی تھی اور حجرۂ شریف (بقیہ صفحہ ۱۸۶)

کبھی تھی ہی نہیں۔ اور آنحضرتؐ وہاں دفن ہی نہیں ہوئے۔ یہ ملحوظ رہے کہ حجاز کی مٹی میں اونچ بہت کم ہوتا ہے اور شوریت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ وہاں کے مکانات وغیرہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتے۔ یہاں تک کہ سو سوا سو برس کا کوئی خام مکان بھی شاذ و نادر ہی وہاں دکھائی دیتا ہے۔ ایسے مقام پر بسبب امتداد زمانہ اگر قبروں کا بالائی حصہ بالکل مٹ جائے تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ یہاں ہندوستان کے ہر قبرستان میں ہزاروں کچی قبریں بنتی رہتی ہیں اور باوجودیکہ وہ اونچی بھی ہوتی ہیں اور ان پر چبوترے بھی اکثر بنا دیتے ہیں مگر تھوڑے دنوں میں ان کا اوپری حصہ مٹ مٹا کر زمین کے برابر ہو جاتی ہیں۔ کیا اس قسم کی قبروں کو فرضی قبر کہا جا سکتا ہے۔

اب قلقشندی کے بیان کے متعلق ہم کو غور کرنا ہے کہ آیا در اصل قلقشندی کا ہی بیان ہے۔ یا کپتان برٹن صاحب نے اس میں بھی کچھ کتر بیونت کر دی ہے۔ قلقشندی کا نام الشیخ ابی العباس احمد القلقشندی ہے۔ ان کی تصانیف میں صرف دو کتابیں مشہور ہیں ایک "نہایت الادب فی معرفۃ القبائل العرب" جس میں عرب کے مختلف قبیلوں کا شجرہ نسب و سلسلہ خاندان درج ہے۔ دوسری تصنیف "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشا" ہے جو سنہ ۸۱۴ھ میں تالیف ہوئی۔ یہ فن انشاء پر ایک بے مثل تالیف ہے اور چودہ ضخیم جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ اس میں فن انشا کی ضرورت کے لحاظ سے تمام دنیا کی اسلامی سلطنتوں کی مختصر تاریخ و جغرافیہ بھی ہے۔ برٹن صاحب نے اسی کتاب سے استدلال کیا ہے اور قلقشندی نے مدینہ منورہ کے حالات میں بہ ضمن ذکر مسجد نبوی حجرۂ شریف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک فقرہ لے کر بعد تحریف پیش کر دیا ہے۔ برٹن صاحب کا تحریف کردہ بیان قلقشندی یہ ہے۔

"حجرے کے اندر آنحضرتؐ اور خلیفۂ اول و دومؓ کی قبریں ہیں اور آنحضرتؐ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵)

منہدم ہو گیا تھا اُس وقت کی حجرے کی اندرونی کیفیت کسی کتاب میں نظر نہ آئی کہ ملبہ صاف کرنے کے بعد قبریں کس حالت میں نظر آئیں مگر بہ قیاس غالب اس وقت بھی سطح زمین ہی برآمد ہوئی ہوگی۔

مرقد پر سنگ مرمر کا ایک چوکا نصب ہے۔"

اب قلقشندی کا اصل بیان ملاحظہ ہو۔

" وبه الحجرة الشريفة التی بها قبر رسول الله صلى الله عليه وسلم وابوبكر وعمر رضی الله عنهما الحجرة الشريفة دائر عليه مقصورة مرتفعة الى نحو السقف عليه ستر من حرير اسود وخارج المقصورة بين القبر والمنبر الروضة التی اخبر به صلى الله عليه وسلم انها روضة من رياض الجنة"۔

(صبح الاعشی مطبوعہ مطبع امیریہ قاہرہ جلد ۴ صفحہ ۲۸۸)

مطلب اس کا یہ ہے کہ:۔

"اور اس (مسجد) میں حجرۂ شریف ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قبر ہے۔ حجرے پر سیاہ حریر کا غلاف پڑا ہوا ہے اور ایک بلند جالی جو چھت تک پہنچی ہے حجرے کو گھیرے ہوئے ہے جالی سے باہر روضہ ہے جس کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "میری قبر و ممبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے"۔

عبارت مذکورۂ بالا میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ "آنحضرتؐ کے مرقد پر سنگ مرمر کا ایک چوکا نصب ہے"۔ چونکہ قلقشندی کا بیان خود برٹن صاحب نے اخذ کیا ہے اس لیے اس کے متعلق کوئی تاویل نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ یا تو برٹن صاحب نے قلقشندی کا بیان سمجھا نہیں یا سمجھ کر عمداً اس میں تحریف کر دی۔

اب ایک ابن جبیر باقی رہے۔ ان کا اصل بیان بھی ہم پیش کرتے ہیں جس سے ثابت ہے کہ برٹن صاحب نے ابن جبیر جیسے مشہور شخص کا غلط حوالہ دے کر اپنی عزت کو خاک میں ملا دیا۔

ابن جبیر نے یہ ہرگز نہیں لکھا کہ :-

"آنحضرت کا تابوت آبنوس کا ایک صندوق ہے"

چنانچہ سفرنامہ ابن جبیر کی اصل عربی عبارت جو انھوں نے حجرہ شریف کی دیواروں اور صندوق مواجہہ شریفہ کے متعلق لکھی ہے حسب ذیل ہے۔

سعة الصفحة القبلية منها اربعة وعشرون شبراً و سعة الصفحة الشرقية ثلاثون شبراً وما بين الركن الشرقي الى الركن الجوفي صفحة سعتها ستة وثلاثون شبرا ومن الركن العراقي الى القبلي اربعة وعشرون شبرا وفي هذه الصفحة صندوق آبنوس مختتم بالصندل مصفح بالفضة مكوكب بها هو قبالة راس النبي صلى الله عليه وسلم وطوله خمسة اشبار وعرضه ثلاثة اشبار وارتفاعه اربعة اشبار وفي صفحة التي بين الركن الجوفي والركن الغربي موضع عليه ستر مسبل يقال انه كان مهبط جبريل"۔

(سفرنامہ ابن جبیر طبع لیڈن واقع جرمنی مطبع بریل ۱۸۵۲ء صفحہ (۱۹۳) ذکر مسجد رسول صلعم)

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ :-

"حجرے کی قبلہ رو دیوار ۲۴ بالشت شرقی دیوار ۳۰ بالشت گوشہ شرقی وشمالی کے درمیان دیوار کی لمبائی ۳۶ بالشت اور گوشہ عراق سے قبلہ رو دیوار کے کونہ تک ۲۴ بالشت ہے اور اسی دیوار کے پاس آبنوس کا ایک

لہ - مولوی احمد علی صاحب شوق رامپوری جنھوں نے سفرنامہ ابن جبیر کا اردو میں ترجمہ کیا ہے - "مختتم بالصندل" کے معنے یہ لیتے ہیں کہ "اس پر صندل کی پچیکاری کی ہوئی تھی" لیکن یہ صندوق چونکہ صندل رکھنے کا تھا اس لیے واقعات وحقیقت کے اعتبار سے اس کے یہ معنی لینا کہ "اس میں صندل بھرا ہوا تھا" زیادہ موزوں ہے۔

صندوق رکھا ہوا ہے۔ جس میں صندل بھرا ہوا ہے اور اس پر چاندی کے
چمکدار پتھر جڑے ہیں۔ یہ آنحضرتؐ کے سر مبارک کے امتیاز کی علامت ہے
اس کا طول (۵) بالشت عرض (۳) بالشت اور بلندی (۴) بالشت ہے۔
اسی دیوار کے پاس رکن شمالی و رکن عراقی کے درمیان ایک مقام ہے جس پر
غلاف پڑا رہتا ہے اس کو مہبط جبریل کہتے ہیں۔

اب ہم برٹن صاحب کے محولہ علماء کے بیان کا مقابلہ کر چکے۔ تینوں مورخین متذکرہ کے بیان سے واضح ہے کہ نفس مضمون کے متعلق ان میں کچھ اختلاف نہیں اور یہ برٹن صاحب کی کوئی خاص مصلحت یا ان کا حسن فہم ہے جس کی وجہ سے مورخین کے اقوال پیش کرنے میں انھوں نے حسب ذیل غلطیاں کیں۔

(۱) سمہودی کے بیان میں صندوق مواجہ شریفہ کو تابوت سمجھ لیا۔
(۲) سمہودی کے بیان میں یہ فقرہ بڑھا دیا کہ تین گھری قبریں دیکھیں۔
(۳) سنہ ۸۸۱ھ کے واقعہ کو سنہ ۸۹۲ھ کا بیان کیا۔
(۴) دوسری آتشزدگی سے قبل کی تعمیر کو بعد کی تعمیر بیان کیا۔
(۵) قلقشندی کے بیان میں یہ فقرہ بڑھا دیا کہ "آنحضرتؐ کے مرقد پر سنگ مرمر کا چوکا نصب ہے۔
(۶) ابن جبیر کے بیان میں صندوق مواجہ شریفہ کو تابوت بنا دیا۔
(۷) اور اپنی طرف سے لوہے کی جالی لگا دی اُس وقت لکڑی کی جالیاں تھیں جن کا ذکر ابن جبیر نے آگے کیا ہے (توضیحاً ملاحظہ ہو مضمون کتاب ہذا تحت عنوان "جالی مبارک")

سمہودی کا بیان جو برٹن صاحب نے بحوالہ برکھارٹ تحریر کیا ہے اس کی نسبت یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ عذاب و ثواب برگردنِ برکھارٹ مگر قلقشندی و ابن جبیر کے بیانات جو کسی کی روایت نہیں ہیں بلکہ خود برٹن صاحب نے اِن کی کتابوں سے اخذ کیے ہیں اِن کی نسبت برٹن صاحب کے مفید مطلب کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ اس تحریف و غلط بیانی نے برٹن صاحب کی عربی دانی و تحقیق کی سب قلعی کھول دی۔ اگر ابن جبیر کا

مطلب اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا تو کاش وہ اس بات پر ہی غور کر لیتے کہ پانچ بالشت کے چھوٹے سے صندوق میں جس میں سات آٹھ برس کا بچہ بھی بمشکل سما سکتا ہے۔ ایک معمولی قد و قامت کا انسان کیونکر دفن کیا جا سکتا ہے اور زمانہ سرور کائنات میں یا اُس کے بعد مسلمانوں کو صندوق میں دفن کرنے کا کہیں دستور بھی رہا ہے یا نہیں۔ عجیب لطف ہے غیر مذہب والے اسلام کی روایات و عقائد پر حملہ کرتے ہیں۔ اور گرہ کی اپنی عزت بھی کھو دیتے ہیں۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ہر آں کو پف زند ریشش بسوزد

سچ ہے جس چراغ کو اللہ تعالیٰ روشن کرتا ہے اُس پر پھونک مارنے والے کی ڈاڑھی جل جاتی ہے۔

اعتراض نمبر (۷)

برٹن صاحب کہتے ہیں۔ "نو سو برس[1] کی مدتِ دراز میں ممکن ہے کہ آنحضرتؐ کا جسمِ فانی برخلاف عقیدۂ اہلِ اسلام خاک میں مل گیا ہوگا۔"

جواب۔ حیاتِ انبیا[2] کے مختلف فیہ مسئلہ پر اس جگہ ہم بحث کرنا فضول سمجھکر تھوڑی دیر کے لیے برٹن صاحب کے بیان کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا جسمِ مطہر نو سو برس کی بلکہ تیرہ سو برس کی طویل مدت میں بوسیدہ ہو کر خاک ہو گیا ہوگا لیکن اس سے بھی برٹن صاحب کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ کی قبر حضرت مسیح کی قبر کے مثل فرضی ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ کی قبر اول تو نعش سے ہی خالی ہو گئی تھی پھر سوا تین سو برس تک اس کا کہیں وجود ہی نہ تھا ایسی قبر کو جس میں مدفون کی نعش کیا اس کی مٹی بھی نہ رہی ہو گی قبر نہیں کہہ سکتے کچھ اور اس کا نام رکھا جا سکتا ہے یا خیر فرضی قبر ہی کہو مگر آنحضرتؐ کی قبر کی یہ حالت نہیں ہے اس کے متعلق جواب اعتراض نمبر (۱) میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔

---

[1] ۔ سید سمہودی کی وفات سنہ ۹۱۱ھ میں ہوئی ہے۔ اس لیے برٹن صاحب نے نو سو برس کی مدت کا تعین کیا۔

[2] ۔ حیات انبیا و شہدا کے متعلق تاریخ سمہودی و جذب القلوب وغیرہ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

اس جگہ ہم صرف اس قدر اضافہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ وجود قبر کے لیے یہ لازم نہیں ہے
کہ اُس کے اندر مدفون کی لاش بغیر ٹھیس لگے ہوئے جوں کی توں موجود ہو۔ جس جگہ کوئی
دفن کیا گیا ہو اور وہاں سے لاش زمین یا آسمان پر کہیں منتقل نہیں ہوئی ہو۔ اس جگہ
کسی قسم کی بیرونی علامت قبہ۔ گنبد۔ چبوترہ۔ چھتری۔ یا مٹی کے ڈھیر کا موجود ہونا ثبوت قبر
کے لیے کافی ہے۔ چاہے دفن شدہ کی لاش قبر میں محفوظ ہو یا خاک ہو کر خاک میں ملگئی
ہو۔ پس اس لحاظ سے اس قبر کو جس میں آنحضرتؐ دفن کیے گئے فرضی نہیں کہا جاسکتا
خواہ جسم مطہر بالکل محفوظ و مصئون ہو یا کسی اور حالت میں ہو۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ برٹن صاحب
کا یہ خیال کہ آنحضرتؐ کا جسم فانی خاک ہو گیا ہو گا محض قیاس ہے جب تک کسی مدفون
کی قبر کی مٹی وغیرہ ہٹا کر اور تہہ تک پہنچ کر دیکھ نہ لیا جائے مدفون کے جسم کے عدم موجودگی
کی نسبت قطعی طور پر کوئی رائے قایم نہیں کی جاسکتی علاوہ ازیں جبکہ اس زمانہ میں ہزاروں برس
کی لاشیں عجائب خانوں میں محفوظ و موجود[۱] ہیں۔ اور سینکڑوں برس کی پرانی قبروں میں
سے بعض لاشیں اچھی حالت میں آئے دن برآمد ہوتی رہتی ہیں تو پھر آنحضرتؐ کے
جسم مطہر کے بالکل محفوظ سمجھنے میں تامل کی کوئی وجہ نہیں۔

اعتراض نمبر (۸)

برٹن صاحب کہتے ہیں کہ اس سے بھی بڑھ کر قرین قیاس یہ ہے کہ متعصب شیعوں نے
جو کئی سو برس تک اس روضے کے متولی و محافظ رہ چکے ہیں اُن کو کسی اور جگہ منتقل
کر دیا[۲] ہو گا۔

---

[۱]۔ اہل یورپ نے حنوط لگی ہوئی پرانی لاشیں جابجا سے فراہم کر کے عجائب خانوں میں رکھی ہیں
چنانچہ فراعنہ مصر کی لاشیں بھی اہرام مصری سے نکال کر قاہرہ۔ لندن۔ و قسطنطنیہ کے عجائب خانوں
میں رکھی گئی ہیں۔

[۲]۔ ۲۹۷ھ میں مصر کی سلطنت عبیداللہ مہدی کے قبضے میں آئی اور ۵۶۷ھ تک گیارہ سلاطین
ان کی اولاد میں ہوئے یہ لوگ خلفائے بنی فاطمہ یا عبیدیہ کہلاتے ہیں ان کا طریق شیعہ اسماعیلیہ تھا
حرمین شریفین پر بھی ان کی حکومت تھی ۳۴۲ھ میں خلیفہ المعزلدین اللہ فاطمی نے (بقیہ مضمون برصفحہ ۱۹۲)

جواب۔ بالفرض شیعوں کو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ سے محبت نہ بھی مگر آنحضرتؐ کی جناب میں شیعہ ادنیٰ ترین بے ادبی بھی کفر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر برٹن صاحب صرف یہ کہہ دیتے کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی لاشیں شیعوں نے کہیں منتقل کردی ہونگی تو ایک گونہ قابل توجہ بات ہوتی۔ لیکن آنحضرتؐ کے جسد مبارک کے منتقل کرنے کا اتہام شیعوں کے سر تھوپنا بہت ہی بے تکی بات ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ مان لیا جائے کہ شیعوں یا نصرانیوں یا ملحدوں نے آنحضرتؐ کا جسد اطہر اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے اجسام روضہ منورہ سے کسی اور جگہ منتقل کردیے اور اب وہ روضہ ایک خالی گنبد رہ گیا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس امر عظیم کی جرأت کی اور ایسی خوفناک مہم انجام دی اُنھوں نے منتقلی اجسام کا ذکر کیوں نہ کیا تاکہ ان کا اصلی مقصد پورا ہوجاتا۔ ان کے اہلِ قوم ان کی اس ہمت کی داد دیتے اور مسلمان یا تو اُس مقام کی زیارت کے لیے جانے لگتے جہاں وہ اجسام منتقل کیے گئے تھے یا لاپتہ ہونے کی صورت میں زیارت سے ہی دست بردار ہوجاتے مگر کسی موافق و مخالف مورخ کی تحریر سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حجرۂ شریف سے جسموں کی منتقلی عمل میں آئی۔ تحریر سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو قصے کہانی کے طور پر یا مقامی روایات کے طریقے سے بھی یہ بات کبھی سُننے میں نہیں آئی۔ نہ کبھی مصر۔ عرب۔ ایران۔ شام و عجم کے کسی عیسائی۔ یہودی۔ بُت پرست۔ ملحد۔ وہابی یا شیعہ نے

بقیہ حاشیہ صـ۱۹۱) حجاز پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس زمانے میں روضہ رسول اللہؐ کے متولی و مجاور اور مسجدِ نبوی کے خطیب اکثر شیعہ تھے۔ اس کے بعد بھی والیان مدینہ اکثر شیعہ رہے ہیں۔ چنانچہ قلقشندی کی جلد ۴ صفحہ ۲۹۹ سے ظاہر ہے کہ ۸۱۴ھ میں بھی امرا و اشراف مدینہ بنی حسین یعنی حسینی شیعہ سادات تھے اور مجموعی طور پر کم و بیش پانسو برس شیعوں کا دور دورہ مدینہ میں رہا ہے۔ آجکل بھی کوئی سات ہزار شیعہ مدینہ و حوالی مدینہ میں آباد ہیں۔ سلطان ابن سعود نے مدینہ کا نائب ناظم ایک شیعہ کو مقرر کیا ہے۔

سلہ۔ اگرچہ وہابی انسداد قبرپرستی کے لحاظ سے گنبد اور اونچی قبریں منہدم کردیتے ہیں مگر مدفون کی لاش کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

اپنے ہم مذہب وہم مشرب لوگوں سے اس کا ذکر کیا۔ نہ کسی مقام پر کوئی مقبرہ ان بزرگوں کے نام سے منسوب و موسوم موجود ہے۔

اگر فی الحقیقت قبیلہ بنو حسین کے شیعوں نے جو صدیوں تک مدینہ منورہ کے متولی و محافظ رہ چکے تھے۔ یہ دلیرانہ و شجاعانہ کام کیا ہوتا تو بڑی خوشی کے ساتھ اُن کو تمام اطراف و اکناف عالم کے شیعوں کو یہ خوش خبری سنادینی چاہیئے تھی تاکہ آنحضرت ص کے پہلوئے مبارک میں حضرت ابوبکر رض و حضرت عمر رض کے دفن ہونے کی وجہ سے بالفرض کوئی خلش اُن کے دلوں میں ہوتی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رفع ہو جاتی اور آنے والی نسلیں ایسی بہادری کے کام کرنے والوں کو دعائے خیر سے یاد کرتیں۔ برخلاف اس کے تمام شیعہ مورخ اس پر متفق ہیں اور تمام دنیا کے شیعوں کا آج کی تاریخ تک یہی خیال راسخ ہے کہ اسی حجرہ شریف میں علاوہ آنحضرت ص کے حضرت ابوبکر رض و حضرت عمر رض بھی دفن ہیں۔ زمانہ قدیم سے آج تک عموماً ایرانی شیعہ مدینہ منورہ جاکر قبیلہ بنو حسین کے اشخاص کے ہاں قیام کرتے ہیں اور ان کو اپنا مزور[۲] مقرر کرتے ہیں۔ مگر قبیلہ مذکور کے کسی شخص نے ان صحابہ کے اجسام کی منتقلی کا ذکر کبھی کسی شیعہ سے نہیں کیا۔ اگر سینہ بہ سینہ کوئی روایت ان لوگوں میں اس قسم کی چلی آئی ہوتی تو اپنے ہم مشرب لوگوں سے بیان کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ اور پھر کھلتے کھلتے سب کو معلوم ہو ہی جاتا اور روضہ منورہ[۱]

---

[۱]۔ جب کبھی جسم کی منتقلی کسی مقام پر عمل میں آتی ہے یا اس قسم کے وجوہ شبہ پائے جاتے ہیں تو وہاں مزار کی علامت بنادی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام کے سر مبارک کی جائے دفن کے متعلق مختلف روایتیں ہیں اور قاہرہ کی مسجد جامع حسین اور دمشق کی مسجد راس سیدنا حسین پر مزار بنے ہوئے ہیں۔ حضرت زینب صلواۃ اللہ علیہا کا مزار بھی قاہرہ و دمشق میں دونوں جگہ بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت علی ع کا روضہ علاوہ نجف کے بخارا میں بھی روضہ سخی جان کے نام سے مشہور ہے۔ اور ان کا مدفن تو کوئی گیارہ بارہ جگہ بیان کیا جاتا ہے۔ توضیحاً جنت البقیع کے حالات میں مقبرہ اہل بیت کے مدفونین کا ذکر ملاحظہ ہو جس میں حضرت علی ع کے مقامات دفن کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

[۲]۔ زیارت کرانے والا۔

خالی عمارت رہ گئی ہے۔ مگر اب تک شیعہ ہزاروں صعوبتیں برداشت کر کے سال کے سال زیارت کے لیے مدینہ طیبہ برابر جاتے ہیں اور آنحضرت ؐ کے مزار مبارک پر ان کی حاضری وجود قبر مبارک کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

برٹن صاحب نے خود اپنے سفرنامے میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبور پر ایرانیوں کے سلام پڑھنے کی کیفیت بالتفصیل لکھی ہے جس سے ثابت ہے کہ ایرانی اس روضے میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبروں کا وجود یقینی سمجھتے ہیں۔

۱۳۴۵ھ میں خود میں نے بھی مدینہ منورہ میں تحقیقات کی۔ وہاں سنی مذہبی رہنماؤں کے علاوہ دو شیعہ مزدور بھی میں نے مقرر کیے تھے اور ان [illegible] کو میں نے بہت ٹٹولا اور دریافت کیا کہ اس واقعہ کی بھی کچھ اصلیت ہے کہ خلیفہ اول و دوم کے اجسام یہاں سے منتقل کر دیے گئے۔ انھوں نے میرے اس سوال پر قہقہہ لگایا۔

واقعات متذکرہ صدر اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ آنحضرت ؐ کا جسد اطہر یا حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے اجسام کی منتقلی ہرگز عمل میں نہیں آئی۔ لیکن بعض تاریخوں میں اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ چار مرتبہ منتقلی اجسام کی کوشش کی گئی تھی جو کارگر نہ ہوئی۔ ان کوششوں کی تفصیل مزار اقدس کے حالات میں تحت عنوان "منتقلی اجسام کی کوشش" کی جا چکی ہے ضرورت کے لحاظ سے یہاں ان کی نسبت اشارہ کر دینا کافی ہے۔ توضیحاً عنوان مذکور ملاحظہ ہو۔

(۱) پہلی کوشش شیعان حلب کی تھی جو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے اجسام منتقل کرنے کے لیے کی گئی تھی اور یہ لوگ ناکام زمین میں سما گئے۔ یہ روایت محض کہانی ہے۔

(۲) دوسری کوشش حاکم بامر اللہ مصر کے دیوانہ بادشاہ کی تھی جو اس نے آنحضرت ؐ اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے اجسام مصر میں منتقل کرنے کے بارے میں کی تھی اور اسکے گورنر مدینہ ابوالفتوح نے اس سے انکار کر دیا تھا۔

(۳) تیسری کوشش اسپین کے عیسائیوں کی تھی جو ۵۵۷ھ میں حجرہ شریف میں نقب

لگا رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے سلطان نورالدین کو خواب میں آگاہ فرمایا۔ سلطان نے مدینہ پہنچکر ان کو قتل کرایا اور حجرۂ شریف کے گرد خندق کھدوا کر اس میں پگھلا ہوا سیسہ بھروا دیا۔

(۴) چوتھی کوشش شام کے رومی بحری قزاق عیسائیوں کی تھی جو ۵۷۸ھ میں اسی ارادے سے مدینے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کو مغربی مسلمانوں نے گرفتار کر کے ان کے سرغنوں کو مکہ معظمہ و مدینہ منورہ میں قتل کے لیے بھیجا اور کچھ لوگ اسکندریہ میں قتل کیے گئے۔

برٹن صاحب نے اپنے سفرنامے میں حاکم بامراللہ اور شیعوں کی کوشش کا تو ذکر کیا ہے مگر باوجود سفرنامہ ابن جبیر دیکھنے کے اپنی برادری والے رومی عیسائیوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ شاید اس میں مصلحت یہ ہو کہ آئندہ اس قسم کی کوشش کرنے والے کسی من چلے عیسائی کی ہمت اس قصے کو سنکر پست نہ پڑ جائے۔

اعتراض نمبر (۹)

برٹن صاحب کہتے ہیں مجھ کو اس قصے کا بھی یقین نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کی قبر کو چکا چوند کرنے والا ایک نور گھیرے ہوئے ہے۔ یہ روایت زمانہ دراز سے مشہور چلی آ رہی ہے۔ اور آج تک بھی حرم نبویؐ کے خادم اور خوجوں کے بیان پر اس کو صحیح مانا جا رہا ہے۔ یہ لوگ یقیناً اس کے بے اصل ہونے سے واقف ہیں مگر پادریوں کی طرح قبر کی عدم موجود کے نقص کو چھپانے کے لیے وہ بھی اس کہانی کو دہراتے چلے جا رہے ہیں۔

جواب۔ جو لوگ پابند مذہب ہیں وہ عموماً اور اہل کتاب خصوصاً اس نور کے ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔ انجیل شریف میں وارد ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے مرقد پر سوم کے روز مریم مگدلینی اور دوسری مریم کو برقی روشنی یعنی وہ فرشتہ نور نظر آیا تھا جس کا چہرہ بجلی کا سا تھا[۱] اور جس نے اطلاع دی تھی کہ حضرت مسیح آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ پس آنحضرتؐ کی زیارت سے مشرف ہونے والوں کو بھی اگر قبر شریف کے گرد کوئی زبردست نور دکھائی دیتا ہو تو کون سی حیرت کی بات ہے۔ لیکن حجرۂ شریف جس میں آنحضرتؐ کی قبر مبارک ہے سنہ ۹۰ھ سے چاروں طرف سے بند ہے اور بجز چار مرتبہ کے جبکہ تعمیر و ترمیم و صفائی

[۱] انجیل متی باب ۲۸۔

وغیرہ کے لیے کچھ لوگ داخل ہوئے تھے[1]۔ جب سے اب تک اُسمیں کوئی داخل ہی نہ ہوا۔ خدام وغیرہ بھی صرف اُس بیرونی جالی کے اندر داخل ہوسکتے ہیں۔ جو حجرۂ شریف کے گرد بنی ہوئی ہے غرضکہ قبرِ شریف ایک ایسی قبر ہے جو ہمیشہ کے لیے ہر شخص کی نظر سے پنہاں ہے۔ اور سیکڑوں برس سے اس وقت تک وہاں کسی کا گزر نہیں ہوا ہے اور آج بھی وہاں کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے پس جو چیز کہ نظر نہ آئے اس کی روشنی و نور کے بارے میں شبہ کرنا اور اس شبہ کو قبر کی عدم موجودگی کی دلیل ٹھہرانا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر حجرۂ شریف میں کوئی دروازہ ہوتا اور خادموں کے سوا حجرے میں کوئی دوسرا داخل نہ ہونے پاتا تو البتہ یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ ان کو سب معلوم ہے کہ قبر کا وہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ مگر پادریوں کی طرح اس نقص کو چھپانے کے لیے مشہور کر رکھا ہے کہ "قبر شریف کے گرد ایسا زبردست نور ہے کہ اگر کوئی دیکھ لے تو اس کی بصارت جاتی رہے" تاکہ لوگ ڈر کر اندر جانے کا خیال بھی نہ کریں مگر حجرۂ شریف میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ اور خادم و متولی بھی روشنی و صفائی کیلیے صرف بیرونی جالی کے اندر جاسکتے ہیں۔ اصل حجرہ جس میں قبر ہے ان کے لیے بھی قطعاً بند ہے اور اسی وجہ سے یہاں کے خادموں کو کسی عیب کے چھپانے کے لیے شعبدہ بازی کے وہ موقعے حاصل نہیں ہیں۔ جو بیت المقدس اور بعض دوسرے گرجوں کے پادریوں کو حاصل ہیں۔

پادریوں کے فریب کی مثال میں ہم اس جگہ صرف اُس شعبدے کی کیفیت جو وہ

---

[1] ایک مرتبہ ۵۴۸ھ میں حجرۂ شریف کے اندر کوئی آواز چھت سے مٹی کے گرنے کی سنائی دی تھی۔ اُس کی صفائی کے لیے ایک صالح و متقی بزرگ کو دیوار میں روزن کر کے حجرۂ شریف کے اندر اُتارا تھا اور اسی سال ایک دفعہ اور اس قسم کی ضرورت سے ایک خادم اور ایک متولی کو حجرے میں داخل ہونے کی عزت حاصل ہوئی تھی سنہ ۶۵۴ھ میں جبکہ آگ کی وجہ سے حجرۂ شریف کی چھت جاکر گر گئی تھی۔ اُس وقت تعمیر کے لیے معمار و مزدور وغیرہ داخل ہوئے۔ اس کے بعد سنہ ۸۸۱ھ میں سلطان مصر قایتبائی نے جو مسجد نبوی کی مرمت کرائی تو اس وقت معدودے چند بزرگوں کو یہ شرف حاصل ہوا تھا منجملہ ان کے سید سمہودی مورخ مدینہ بھی تھے۔

حضرت عیسیٰ کے آسمان پر چلے جانے کی تقریب میں کلیسائے بیت المقدس میں دکھاتے ہیں ایک انگریزی کتاب سے ترجمہ کرکے ذیل میں لکھتے ہیں :-

"ان تمام بدمعاشیوں اور فریبوں کے علاوہ جو بیت المقدس کے راہب و پادری ہر سال دکھاتے ہیں ایک وہ شعبدہ ہے جو مزار شریف (قبر مسیح) کے کلیسا میں ایسٹر عید (یوم صعود مسیح) کی شام کو کیا جاتا ہے۔ یہ دھوکہ دوسری تمام بیہودگیوں سے سبقت لے گیا ہے۔ سالہائے دراز سے آج تک خدا کا گھر اس کا فرانہ فریب سے ناپاک کیا جاتا ہے اور اس کا نام "مقدس آگ کا معجزہ" رکھا گیا ہے۔ اس روز صبح ہی سے کلیسا میں عیسائیوں کے جم غفیر اکھٹے ہو جاتے ہیں۔ صرف تھوڑی جگہ ترکی سپاہیوں کی دو قطاروں کیلیے چھوڑ دی جاتی ہے۔ دوپہر تک زائرین کا مجمع بڑھتا جاتا ہے اور غول کے غول اس جمگھٹ میں شریک ہو کر دیوانہ دار قبر کے گرد ناچتے تالیاں بجاتے اُچھلتے کودتے وحشیانہ آوازیں نکالتے چیخیں مارتے ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ ٹیک ٹیک کے اُچکتے ہوئے چکر لگاتے ہیں۔ اس کے بعد دفعتًہ راستہ صاف ہو جاتا ہے اور ایک زرق برق جلوس ہاتھوں میں زردوزی کی جھنڈیاں لیے ہوئے ادھر سے اُدھر تین مرتبہ گزرتا ہے اور ان کے ساتھ پادریوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اپنے حلقے میں "آگ والے" بڑے پادری کو لیے ہوئے لوگوں کو چیرتا پھاڑتا کلیسا کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ دروازے میں اس پادری کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو جاتا ہے کلیسا کی بیرونی دیوار میں ایک سوراخ ہے یہاں ایک پادری کھڑا رہتا ہے اور اس جگہ سے لے کر گرجے کی دیوار تک اس مجمع کے بیچ میں آدمیوں کو ہٹا ہٹا کر ایک پتلی گلی سی بنا لیتے ہیں۔ یہ وقت بڑے ناز کا ہوتا ہے اور ہر زائر کا جوش و جذبہ انتہائی درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ یکایک ایک چمکدار شعلہ سوراخ میں سے نظر آتا ہے پادری اپنی مشعل اس سے روشن کرتا ہے اور پھر اس آگ تک پہنچنے کیلیے

چاروں طرف ہی پلہ ہوتا ہے۔ آدمی پر آدمی ٹوٹتا ہے اور زائر پر زائر گرتا ہے
ہر شخص اس مشعل سے اپنی مشعل روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر چراغ
سے چراغ روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں ہزارہا
موم بتیاں اور مشعلیں روشن ہو جاتی ہیں اس کے بعد دھوئیں اور گرمی سے
بچنے کے لیے ہر شخص باؤلوں کی طرح دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پھر
دیوانوں کا یہ مجمع اپنے اپنے گھروں کو لوٹتا ہے اور سارے شہر میں یہ تبرک
آگ لیے پھرتا ہے۔ پیشتر عیسائیوں کے تمام فرقے اس رسم میں شریک
ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب رومی عیسائیوں نے یونانیوں کو اس گرجے سے
خارج کر دیا۔ اور اس فریب سے فائدہ اٹھانے کا ان کو موقع نہ رہا تو وہ اس کو
دھوکے اور مکاری سے تعبیر کرنے لگے اور اب صرف یہاں کے پادری اور
ضعیف الاعتقاد زائر یہ خیال کرتے ہیں کہ روح القدس آگ کی شکل میں
اس قبر مبارک پر نازل ہوتی ہے جب مشعل روشن کر کے باہر پہنچا دیجاتی ہے
تو آگ والا پادری جو فی الحقیقت اندر سے روشن کر دیتا ہے لوگوں کے
کندھوں پر سوار ہو کر ایک مصنوعی وجد و بے ہوشی کی حالت میں باہر نکلتا
ہے تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت نے جس کی بارگاہ سے
وہ ابھی ابھی چلا آ رہا ہے اس پر ایک خاص کیفیت طاری کر دی ہے۔
یونانی عیسائیوں کو اس فریب سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ تمام دنیا کے
عیسائی اس معجزے سے مشرف ہونے کے لیے دور دراز ملکوں سے
بیت المقدس کھچے چلے آتے ہیں۔

(سنیز ان پیلسٹائن (مناظر فلسطین) مرتبہ ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی لندن
مطبوعہ ۱۸۶۷ء صفحہ ۱۱۲)

اب ایک اور پہلو سے بھی ہم اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مشاہدۂ نور کا تعلق
عقاید و تصورات سے ہے۔ قبر شریف و مرقد منیف تو بہت بڑی چیز ہے شیفتگانِ جمالِ محمدیؐ

وابستگانِ انوارِ احمدی، مدینہ منورہ کے در و دیوار و شجر و حجر میں وہ وہ انوار و تجلیات مشاہدہ کرتے ہیں کہ اغیار ان کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بہ خدا تا نہ چشی

اگر کسی مسجد یا معبد میں کوئی شخص خدا کے جلال و جبروت کا تصور کر کے کانپنے اور تھرانے لگے تو کیا اس کی دہشت و ہیبت کو فرضی ڈھکوسلا کہینگے۔ بادہ کشانِ ساغرِ محبت پر جو حالت و کیفیت آستانۂ مبارک کی حاضری میں پیدا ہوتی ہے اور عاشقانِ رسول اللہ پر جو عالمِ وجد حضوریِ دربارِ پُر انوار کے وقت طاری ہوتا ہے۔ اس سے ایک نور تو کیا عرش سے فرش تک سب بقعۂ نور ہی نظر آتا ہے۔ اہلِ دل ان فریفتگانِ دیدار کی دلی کیفیت کا اندازہ کر کے اس نور یا روشنی کو ہرگز بے اصل نہیں کہہ سکتے البتہ بدطینت و کور باطن اشخاص نور کے معنی بھی نہیں سمجھتے وہ کیا جانیں کہ مرقدِ انور روضۂ پُر نور اور مدینہ منورہ کسے کہتے ہیں یقین نہ آئے تو کسی اُردو جاننے والے عیسائی سے اس درویش کی نظم "مدینے کی چاندنی" کے اس بند کا مطلب دریافت فرما لیجیے۔ امتحان ہو جائیگا۔

ندی چڑھاؤ پر ہے شرابِ طہور کی — مے نوش لا رہے ہیں خبر دورِ دور کی
کیا دیکھیے کوئی روشنی اب شمعِ طور کی — جھڑیاں لگی ہوئی ہیں مدینے میں نور کی
چھٹکی ہلال گنبدِ خضرا کی چاندنی
پھیکی پڑے نہ کیوں یدِ بیضا کی چاندنی

سلہ۔ یہاں برٹن صاحب کی بدنیتی کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی صراحت انھوں نے اپنے سفرنامہ میں جبلِ عرفات کے ذکر میں کی ہے اور جبکہ عین خطبہ کے وقت ان کے چاروں طرف ہزاروں حاجی اپنے گناہوں پر پشیمان ہو کر زار زار رو رہے تھے وہ ایک عورت کو چھیڑنے میں مصروف تھے۔ کاش انھوں نے انجیل شریف کی یہ آیت غور سے پڑھی ہوتی۔ "اگر تیری آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نکال ڈال اور پھینک دے خدا کی بادشاہت میں کانا داخل ہونا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ دو آنکھیں رکھتے ہوئے جہنم کی آگ میں ڈالا جائے۔

(انجیل مرقس باب (۹) آیت (۴۶))

غیروں کو کیا معلوم کہ شبیر اس وقت عالم خیال میں مدینہ منورہ پہنچ گیا ہے اور چاندنی رات میں روضۂ رسول اللہ صلعم کا سنہری ہلال دیکھ کر دریائے نور میں شناوری کر رہا ہے۔

جل جلالہٗ

(۴)

(د) پادری زویمر صاحب کے شبہات اور انکے جواب

اعتراض نمبر (۱)

آنحضرت صلعم کی وفات کی خبر سنکر مدینے میں ایک ہل چل مچ گئی اور حضرت عمرؓ نے دھمکی دی کہ جو اس کا یقین کریگا قتل کیا جائیگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تجہیز و تکفین خاموشی سے عمل میں آئی ہو۔

جواب۔

تجہیز و تکفین خاموشی کے ساتھ ہو ہی گئی۔ کون سا کشت و خون ہوا۔ کتنے آدمی مارے گئے۔ پادری صاحب ہی ظاہر فرما دیتے۔ توضیحاً برٹن صاحب کے اعتراض نمبر ۲ کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۲)

وفات کے بعد ہی خلافت کے متعلق بہت جھگڑا ہوا اور بقول شیعوں کے حضرت علیؑ و فاطمہؑ کا سکان جو موجودہ قبر (شریف) کے متصل تھا اس کو آگ لگا دینے کی دھمکی دی گئی۔

جواب

برٹن صاحب کے اعتراض نمبر (۲) کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۳)

متقدمین قبر (شریف) کی اس قدر تعظیم نہیں کرتے تھے جیسے کہ متاخرین

جبکہ روایتوں نے آنحضرتؐ کو عام انسانی درجے سے بہت بالاتر پہنچا دیا ہے۔ اگلے مسلمان قبر (شریف) کی ٹھیک ٹھیک جگہ سے بھی ناواقف تھے۔

جواب۔

اس کا تفصیلی جواب برٹن صاحب کے اعتراض نمبر ۴ کے جواب میں ملاحظہ ہو۔ جس سے ثابت ہے کہ اگلے مسلمان بھی قبر شریف کی ٹھیک ٹھیک جگہ سے اچھی طرح واقف تھے اُس کی شرعی تعظیم کیا کرتے تھے اور صلواۃ و سلام کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے سنتِ الٰہی ہمیشہ سے اسی پر جاری ہے کہ ہر پیغمبر کی وفات کے بعد اس کی تعظیم زیادہ ہونے لگتی ہے چنانچہ مسیح علیہ السلام کی زندگی میں تو اُن کے سب حواری اُن کو سپاہیوں کے ہاتھ میں گرفتار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور یہودا اسقریوطی حواری نے تیس روپے میں پکڑوا کر صلیب پر بھی چڑھوا دیا۔ اگلے عیسائیوں نے جناب مسیح کی یہ تعظیم کی پچھلے عیسائی صلیب کی لکڑی کے لیے لاکھوں کٹ مرے۔

اعتراض نمبر (۴)

اوائل زمانے میں آنحضرتؐ کی قبر کی شکل معلوم نہ تھی اور نہ وہ احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ہم بعض ملکوں میں ڈھلوان قبریں دیکھتے ہیں۔ اور بعض جگہ مسطح۔

جواب۔

برٹن صاحب کے اعتراض نمبر (۴) کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۵)

آنحضرتؐ کے دفن کے متعلق مسلمان علما کے اقوال مختلف ہیں۔

جواب۔

برٹن صاحب کے اعتراض نمبر ۶ کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۶)

روضہ کئی صدیوں تک شیعوں کی زیر نگرانی رہا ہے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی

دشمنی کی وجہ سے یہ بات اُن کی دلچسپی کی تھی کہ انھوں نے جسم کو کہیں منتقل کر دیا ہو۔

جواب۔

برٹن صاحب کے اعتراض نمبر (۸) کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۷)

قبر شریف کی موجودہ حالت شبہ انگیز ہے۔ حجرے کی نگرانی خدام بہت سختی سے کرتے ہیں اور اس کے اندر کسی کو داخل ہونے نہیں دیتے۔

جواب۔

برٹن صاحب کے اعتراض نمبر (۶) کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۸)

اندھا کر دینے والی روشنی جو قبر کو گھیرے ہوئے ہے اس کا قصد عیب کے چھپانے کے لیے ایک گھڑی ہوئی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

جواب۔

برٹن صاحب کے اعتراض نمبر (۹) کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۹)

محمد الحلبی شیخ العلمائے دمشق نے برٹن صاحب کو یقین دلایا تھا کہ اس دروازے میں سے جس میں ہو کر حجرے کے اندر پہنچتے ہیں۔ خدام نے ان کو اندر جانے کی اجازت دیدی تھی مگر انھوں نے وہاں قبر کا کوئی نشان نہیں دیکھا۔

جواب۔

حجرۂ شریف کے اندر داخل ہونے کے لیے تو کوئی دروازہ نہیں ہے۔ ہاں بیرونی جالی کے اندر داخل ہونے کے چار دروازے ہیں اور خدام بعض مقدس و متمول اشخاص کو بھی جالی کے اندر جانے کی اجازت دیدیتے ہیں مگر وہاں حجرہ کہاں سے نظر آسکتی ہے۔

اعتراض نمبر (۱۰)

مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ ۴۱۲ھ میں آنحضرت اور ان کے دونوں صحابہ کے

اجسام منتقل کر دینے کی کوشش مصر کے فاطمی خلیفہ نے کی تھی۔ اس کوشش کی ناکامی کے متعلق وہ معجزات نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قبور کے گرد ایک خندق کھدا کر اس میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا گیا ہے تاکہ آیندہ ان اجسام کو کوئی چرا نہ سکے۔

جواب۔

مصر کے فاطمی خلیفہ کی کوشش کے بعد خندق میں سیسہ نہیں بھروایا گیا بلکہ پادری صاحب کے دو عیسائی بھائیوں کی ناکامی کے بعد اس قسم کی حرکتوں کا سدّ باب کیا گیا ہے توضیحاً برٹن صاحب کے نمبر (۸) کا جواب دیکھا جائے۔

اعتراض نمبر (۱۱)

بقول سلمان مورخوں کے سنہ ۶۵۴ھ میں کوہ آتش فشاں کے تصادم سے مسجد نبوی ص برباد ہوگئی تھی مگر قبر کا حجرہ تمام نقصانات سے محفوظ رہا تھا۔ پھر سنہ ۸۸۶ھ میں اس پر بجلی گری اس موقع پہ بقول برکھارٹ سمہودی کا بیان ہے کہ حجرے کا اندرونی حصہ جب صاف کیا گیا تو ملبے سے بھری ہوئی تین گہری قبریں پائی گئیں لیکن مورخ مذکور جب خود حجرے کے اندر داخل ہوا تھا تو اُس نے قبروں کا کوئی نشان نہیں دیکھا یہی مصنف کہتا ہے کہ جس تابوت میں آنحضرت ص دفن ہیں اس پہ چاندی منڈھی ہوئی ہے۔

جواب۔

پادری صاحب کی تاریخ دانی قابل داد ہے۔ سنہ ۶۵۴ھ میں کوہ آتش فشاں کا تصادم نہیں ہوا تھا بلکہ قندیلیں روشن کرتے وقت ہاتھ سے بتی چھوٹ کر کمل وغیرہ پہ گر کر آگ لگ گئی تھی۔ اُس سے مسجد نبوی میں آتشزدگی واقع ہوئی تھی۔ دوسری آتشزدگی سنہ ۸۸۶ھ میں نہیں ہوئی بلکہ سنہ ۸۸۶ھ میں ہوئی تھی اور اس وقت سید سمہودی مورخ مدینہ حجرۂ شریف کے اندر داخل نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ سنہ ۸۸۱ھ میں جبکہ سلطان قایدبے مصری نے حجرۂ شریف کی ترمیم کرائی تھی وہ باریاب ہوئے تھے۔ تفصیلی جواب کے لیے برٹن صاحب کے اعتراض نمبر (۶) کا جواب ملاحظہ ہو۔

اعتراض نمبر (۱۲) آنحضرت ص کی وفات اور دفن کی ٹھیک جگہ کے متعلق سُنی

شیعوں کے اقوال مختلف ہیں۔

جواب۔

واقعات وفات ومقام دفن کے متعلق سنی شیعوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آنحضرت ص کی وفات مشہور روایت کی بناء پر دوشنبہ کے دن ۱۲/ ربیع الاول ۱۱ھ کو ہوئی۔ مگر اس کے علاوہ ۲/ ۸/ ۱۰/ اور ۱۸/ ربیع الاول بھی تاریخ وفات بعض روایتوں میں آئی ہے۔ شیعوں کے نزدیک ۲۸/ صفر ۱۱ھ مشہور تاریخ وفات ہے۔ لیکن کسی کی تاریخ وفات میں اختلاف ہونے سے یہ ضرور نہیں ہے کہ اس کی قبر کو بھی فرضی سمجھ لیں انجیل میں حضرت عیسیٰ ع کے واقعات صلیب کے متعلق حواریوں کے اقوال میں بیسیوں اختلاف ہیں۔ کیا ان کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صلیب کا واقعہ ہی فرضی ہے۔

فصل دوم

جنت البقیع

(یعنی)

مدینۂ منوّرہ کا مشہور قبرستان

(ﷺ)

(۱) بقیع کے مجمل حالات

بقیع کے معنی مقام یا جگہ کے ہیں۔ اسی سے لفظ بقعہ مشتق ہے اور ایک اضافی ترکیب کے ساتھ "بقعۂ نور" اُردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابتداءً اس زمین پر جہاں قبرستان بقیع واقع ہے ایک قسم کے درختوں کا جنکو غرقد کہتے ہیں ایک بن تھا۔ جسکی وجہ سے اسکو بقیع الغرقد یعنی غرقد کی جگہ یا غرقد کا جنگل کہا کرتے تھے۔ جب آنحضرت صلعم کے صحابہ وغیرہ یہاں دفن ہونے لگے تو غرقد کے درخت کاٹ ڈالے گئے اور تقریباً ۲ سنہ ہجری سے یہ مسلمانوں کا عام قبرستان بن گیا۔ اسکے بعد ہر قبیلے نے اس زمین کے قطعات اپنے اپنے خاندان کی ہڑواڑ کیلئے مقرر کر لیے۔ بعضوں نے مکان وغیرہ بھی یہاں بنائے جنکی وجہ سے یہاں کے مختلف حصوں کے مختلف نام رکھے گئے

حمام ابی قطیفہ - دار عقیل - بیت الحزن - مسجد فاطمہ - مسجد ابی بن کعب - حش کوکب وغیرہ مشہور ہوگئے
زمانۂ قدیم میں اس قبرستان کا نام جنت البقیع نہیں قرار پایا تھا بلکہ اسکو بقیع الغرقد یا صرف بقیع
کہا کرتے تھے - تمام قدیم مؤرخ و سیاح اسکا نام صرف بقیع لکھتے ہیں - سنہ ۱۲۸۷ھ میں جعفر برزنجی نے
اسکے نام کے ساتھ لفظ شریف کا اضافہ کر کے "بقیع شریف" لکھا ہے - جنت البقیع نام زمانۂ حال کی
ایجاد معلوم ہوتا ہے - اس قبرستان کے فضائل و مراتب کے اعتبار سے غالباً مدینۂ منورہ کے
مزوّر یعنی زیارت کرانیوالے اسے جنت البقیع کہنے لگے اور انکی تقلید میں حجاج و زائرین بھی اسی
نام سے اسکا ذکر کرنے لگے اور رفتہ رفتہ اس کا نام جنت البقیع ہو گیا -

مسلمانوں کا یہ مقدس ترین قبرستان مدینہ سے باہر جنوبی و مغربی گوشے میں روضۂ سرورِ کائنات
کے جانب مشرق کوئی چار سو قدم کے فاصلہ پر واقع ہے - روضۂ مطہرہ سے چلکر مختلف گلیوں میں ہوتے
ہوئے فصیل کے ایک دروازے سے جسے باب البقیع کہتے ہیں انھیں داخل ہوتے ہیں - زائر کے
سامنے جانب مشرق اور داہنی طرف جنوب میں کھجور وغیرہ کے درخت نظر آتے ہیں - بیچ میں یہ سنسان
گورستان ہے - اسکی لمبائی تخمیناً دو سو گز اور چوڑائی کوئی ڈیڑھ سو گز ہوگی - اسکے گرد معمولی پختہ
چار دیواری کھچی ہوئی ہے اور داخلہ کیلیئے بغیر کواڑوں کا ایک دروازہ ہے - اس شہر خموشاں کی بنیاد
اب سے کوئی ساڑھے تیرہ سو برس قبل آنحضرت نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی اور جب سے
ابتک اسکی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا آرہا ہے - فرزند رسول - بنات رسول - ذریات رسول -
ازواج رسول - بیشمار صحابہ و تابعین و صلحا و شہدا و زائرین اس خوابگاہ میں آرام کر رہے ہیں -
جنت البقیع کے فضائل میں بہت سی روایات و احادیث وارد ہیں - یہاں دفن ہونیوالے کیلیے
بشارت نجات ہے - قیامت کے دن ستر ہزار مُردے یہاں سے ایسے اٹھینگے جن کے چہرے
چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہونگے - چونکہ اسلام کے ابتدائی دور میں قبریں پختہ نہیں بنائی
جاتی تھیں اس وجہ سے چند روز میں وہ مٹ مٹا کر زمین کے برابر ہو جاتی تھیں - یہی سبب تھا کہ
یہاں کے ہزارہا مدفونین میں سے مشہور ترین بزرگوں کی قبروں کا پتہ بھی کوئی تین سو برس تک تھا
اور پانسو برس تک قبرستان بقیع میں کوئی گنبد نظر نہیں آتا تھا - سنہ ۵۱۹ھ میں بعض مشہور بزرگوں کی
قبروں پر قبے بنائے گئے جو تعداد میں صرف بارہ تیرہ تھے اور انمیں تیس پینتیس قبروں کی نشاندہی کیجاتی تھی

وہ اسطرح کہ بعض قبے میں قبر ایک ہی تھی مگر وہاں فاتحہ دو تین شخصوں پر پڑھتے تھے کسی قبے میں قبریں تین چار تھیں مگر زیارت چھ سات کی پڑھی جاتی تھی۔

تیرھویں صدی کے آغاز یعنی تخمیناً سنہ ۱۲۱۹ھ میں جب اہل نجد کا پہلی مرتبہ مدینۂ منورہ پر قبضہ ہوا تو وہ قبے منہدم کر دیئے گئے اور یہ قبرستان پھر اپنی قدیم شکل پر آ گیا۔ اسوقت کی جنت البقیع کی حالت مشہور و معروف فرنگی سیاح برکھارٹ کے سفرنامے سے لکھی جاتی ہے جو ابراہیم ابن عبداللہ نام رکھکر سنہ ۱۸۱۴ع ۱۲۳۲ھ میں مدینۂ منورہ گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک حجاز اہل نجد کے قبضہ سے نکلکر دوبارہ ترکوں کے ہاتھ میں آچکا تھا وہ لکھتا ہے۔

"ان لوگوں کی عظمت کے اعتبار سے جو یہاں دفن ہیں یہ جگہ بہت ہی گھٹی ہوئی ہے اور غالباً مشرق کے ان تمام شہروں کے قبرستانوں سے جو مدینہ کے برابر ہوں یہ قبرستان سب سے زیادہ کثیف اور بُری حالت میں ہے۔ اس میں ایک بھی اچھی قبر نہیں ہے۔ اور نہ کوئی بڑا پتھر کتبہ کندہ کیا ہوا کسی قبر پر نصب ہے بلکہ بجائے اسکے محض مٹی کے ڈھیر ہیں جنکے گرد ڈھیلے ڈھیلے پتھروں کا نیچا سا حاشیہ بنا دیا ہے۔ قبروں کے بدنما کرنے کا الزام وہابیوں پر لگایا جاتا ہے اور اسکے ثبوت میں چند چھوٹے چھوٹے گنبدوں اور عمارتوں کے کھنڈر دکھائے جاتے ہیں جو پیشتر حضرت عثمان، حضرت عباس، سیدہ فاطمہ زہراؑ وغیرہ کی قبروں پر بنے ہوئے تھے جنکو وہابیوں نے توڑ ڈالا لیکن انھوں نے کبھی کسی سادہ قبر کو نیست و نابود نہیں کیا۔ مکہ میں بھی انھوں نے ان قبروں کو نہیں چھیڑا تھا جو معمولی پتھر کی تھیں۔ اس قبرستان کی یہ پست حالت وہابیوں سے قبل کی ہے اور اسکا الزام مدینہ کے باشندوں پر لگایا جاسکتا ہے جنکی بخیل طبیعتیں اپنے شہر کے مشاہیر کی قبروں کی عزت کرنے میں کوئی خرچ گوارا نہیں کرتیں"

(سفرنامہ برکھارٹ انگریزی جلد دوم)

وہابیوں کے دہ سالہ قبضہ کے بعد جب ترکوں کا تسلط حجاز پر ہو گیا تو تخمیناً سنہ ۱۲۳۲ھ میں محمد علی پاشا والی مصر نے منہدم شدہ قبوں کو جیسا کہ پہلے بنے ہوئے تھے پھر تیار کرا دیا جو سنہ ۱۳۴۱ھ تک قائم رہے

یہاں تک کہ اہلِ نجد نے بسر کردگی جلالتہ الملک عبدالعزیز ثانی ابن عبدالرحمٰن آل سعود شریف مکہ سے حجاز فتح کیا تو یہ قبے مسمار کر دیے گئے ۱۳۴۴ھ میں جو زائر مدینہ منورہ گئے تھے اُنکے بیانات یہاں کے قبور کے بارہ میں مختلف تھے بعض نے کہا ہمنے قبروں کو زمین سے ہموار پایا۔ بعض نے کہا قبریں سطح تھیں۔ اور علامت قبر کے طور پر دو دو تختے ہر مشہور بزرگ کے مدفن پر رکھدیے تھے۔ ذیحجہ ۱۳۴۵ھ میں حج کے بعد جب یہ گنہگار مدینہ منورہ گیا تو اُسوقت جنت البقیع کی یہ حالت دیکھی کہ قبے منہدم ہیں۔ اُنکے ملبے کے ڈھیر دو طرف پشتہ کے طور پر لگا دیے گئے ہیں جنکے بیچ میں سے بقیع کی اندر آمدرفت ہوتی ہے۔ عام قبروں کے علاوہ جو محض مٹی کے ڈھیر ہیں خاص خاص قبریں یعنی اہلبیت کے مزارات۔ ازواج رسول اللہ۔ بنات رسول اللہ و فرزند رسول اللہ اور بعض صحابہ وغیرہ کی قبریں جو بقیع کی خاص زیارتگاہیں ہیں زمین سے بالشت سوا بالشت اونچے خام چبوتروں کی شکل میں ہیں۔ انکی گرد بندش کے طور پر ان گرڑھے پتھر جما دیے ہیں اور ہر قبر کی علامت کیلئے ایک ایک ناتراشیدہ پتھر سرہانے نصب کر دیا گیا ہے۔ جو چبوترے ایک قبر کے ہیں وہ کوئی دو گز لمبے سوا گز چوڑے ہیں اور جو کئی قبروں کے مشترک چبوترے ہیں وہ زیادہ بڑے ہیں۔ اور جیساکہ قبروں کی موجودگی میں تھا اب بھی بعض جگہ ایک ایک قبر پر کئی کئی بزرگوں کی فاتحہ پڑھ دیتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ کسی ایک جگہ کے متعلق جتنے بزرگوں کے دفن کی روایت آئی ہے اُن سب کو وہاں دعائے خیر سے یاد کرلیا جاتا ہے۔

(۲) موقف النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جنت البقیع کے دروازے سے جانب مشرق کوئی پچیس گز کے فاصلہ پر جہاں اب مقبرۂ حضرت عقیل ابن ابیطالب ہے حضرت عقیل کا مکان تھا حضور سرور عالم جب بقیع میں تشریف لیجاتے تو دارِ عقیل میں کھڑے ہو کر اہل بقیع کیلئے دعائے مغفرت فرمایا کرتے تھے۔ یہ جگہ موقف النبی یعنی قیامگاہ رسول اللہ ہے۔ زمانۂ دراز سے حضرت عقیل کے مکان کا کوئی اثر آثار یہاں نہیں ہے۔ دسویں گیارہویں صدی ہجری میں اس جگہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جسکا ذکر سید سمہودی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے

کیا ہے۔ اُس زمانہ میں وہ مسجد ہی موقف النبی کہلاتی تھی۔ مدت ہوئی کہ اُس مسجد کا بھی کوئی پتہ نہیں رہا۔ اور صرف مقبرۂ عقیلؓ ہی موقف النبی کی علامت ہے۔ علماء کی رائے ہے کہ زائر جب البقیع کی زیارت کا قصد کرے تو سب سے پہلے اسی جگہ آئے اور باتباع حضور سرورکائنات یہاں کھڑا ہو کر اہل بقیع کیلئے دعائے مغفرت کرے۔

(۳) مقبرۂ اہلبیت

ایک زمانہ وہ تھا کہ اہلبیت طاہرین یعنی جنابہ سیّدہ فاطمہ زہراؑ و امام حسنؑ و امام زین العابدینؑ امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادق علیہم السلام کے مزارات کے متعلق عام لوگوں کو اتنا بھی علم نہ تھا کہ جنت البقیع میں کس جگہ ہیں۔ اور تقریباً تین سو برس تک یہ بزرگوار عوام کے علم و اطلاع بغیر خوابگاہ بقیع میں آرام فرماتے رہے۔ ۳۳۲ھ میں اس جگہ جہاں اب مقبرۂ اہلبیت واقع ہے ایک پتھر نکلا تھا جس پر یہ کندہ تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ مبید الامم ومحی الرمم[۱]۔ ہذا قبر فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدۃ النساء العالمین وقبر حسن بن علی وعلی بن الحسین بن علی و قبر محمد بن علی وجعفر بن محمد علیہم السلام"

اُس وقت معلوم ہوا کہ اس بزرگ مقبرے میں جناب سیّدہ اور چار امام استراحت فرما رہے ہیں۔

(جذب القلوب مولفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی تالیف ۱۰۰۱ھ باب ۱۲ ذکر بقیع)

حکیم ناصر خسرو نے ۴۴۲ھ میں مدینہ کا سفر کیا تھا مگر بعض وجوہ سے وہ جنت البقیع کی زیارت سے محروم رہا اس وجہ سے اُس کا سفرنامہ مقبرۂ اہلبیت کے ذکر سے ساکت ہے۔ امام محمد غزالی جنھوں نے ۴۸۷ھ میں مدینہ منورہ کی زیارت کی تھی وہ اپنی کتاب احیاء العلوم میں اس مقبرے کے مدفونین میں صرف امام حسن و امام زین العابدین و امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہم السلام کو شمار کرتے ہیں۔

[۱] اس فقرے کے معنی ہیں کہ حمد و ثنا اُس خدا کیلئے زیبا ہے جو قوموں کو پیدا کرنے والا اور ہڈیوں میں جان ڈالنے والا ہے۔

جنابہ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔ (احیاء العلوم جلد دوم صفحہ ۲۴۸)

ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں زیارت کی تھی اور ابن بطوطہ نے ۷۲۶ھ میں مگر یہ دونوں اس مقبرے میں بجز امام حسنؑ اور حضرت عباسؓ عم رسول کے اور کسی کا نام نہیں لیتے۔ معلومات کی یہ ابتدا تھی۔ رفتہ رفتہ بعض روایتوں کی بنا پر یہ پتہ لگا کہ جسدِ مبارک امیر المومنین علی ابن ابیطالب اور سر مبارک امام حسین علیہ السلام بھی یہیں دفن ہے۔ چونکہ واقعات کو سیکڑوں برس گذر گئے اسلیئے ٹھیک طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مقبرۂ اہلبیت کب تک بغیر قبّے کے رہا اور کب تک یہ قبریں مٹی کے ڈھیر یا چبوترے کی شکل میں رہیں اسلام کی سادہ تعلیم۔ عربوں کی بے تکلف معاشرت اور آغاز اسلام کی خانہ جنگیوں کے لحاظ سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ اختتام خلافت بنی اُمیہ یعنی ۱۳۲ھ تک مسلمانوں میں قبروں کے پختہ بنانیکی رسم جاری ہوئی ہو۔ اُسوقت کی مصلحتیں بھی اجازت نہیں دیتی تھیں کہ ایسے مشاہیر کی قبروں کو جن کے مختلف دشمن ہوں انگشت نما بنایا جائے۔ خلافت عباسیہ کا ابتدائی زمانہ بھی ایسا ہی نظر آتا ہے جبکہ قبروں کیطرف توجہ کم تھی۔ اگرچہ کسی قبر یا مدفن کا چند سال تک بھی خام حالت میں رہنا اُسکو معدوم یا موہوم کر دینے کیلیے کافی ہے مگر اس مقبرے کے مدفونین ایسے نہ تھے جنکو زمانہ بھول جاتا اور یہ گمنام قبروں میں ہمیشہ دفن رہتے۔ آخر المسترشد باللہ عباسی خلیفہ بغداد نے جس کا زمانہ سلطنت سنہ ۵۰۳ھ سے ۵۲۹ھ تک ہے سنہ ۵۱۹ھ میں اس مقبرے پر یا اپنے مورث اعلیٰ حضرت عباسؓ کی قبر پر توجہ کی اور امام حسن علیہ السلام وحضرت عباسؓ کی قبروں کو پختہ بنوایا اور انپر ایک بڑا قبّہ تعمیر کیا اور قبر عباسؓ کے سامنے اُس قبّے میں ایک جگہ حسب ذیل کتبہ تحریر کیا۔

"المسترشد باللہ نے ۵۱۹ھ میں تعمیر کا حکم دیا۔ قبّے کی عمارت تیار کیگئی۔ قبر عباسؓ و حسنؑ کو زمین سے اونچا کیا گیا۔ انپر غلاف ڈالے اور پیتل کی چادروں کی پھول بیل کٹی ہوئی جالیاں انپر جڑکر خوشنما کیا گیا"

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ عربی جلد دوم صفحہ ۱۰۱)

اسکے بعد المنصور مستنصر باللہ نے (جسکا عہد حکومت ۶۲۳ھ سے ۶۴۰ھ تک ہے) اس مقبرے میں کچھ ترمیم و تعمیر کی اور غالباً بڑی محراب تیار کرا کے اسپر یہ کندہ کرایا۔

"اسکی تعمیر کا حکم المنصور مستنصر باللہ نے دیا" (وفاء الوفا عربی مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۱۰۱)

سنہ ۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے زیارت کی تھی اور اس سے قبے اور حضرت امام حسن و حضرت عباس کی قبور کو ویسا ہی پایا تھا جیسا کہ کتبہ میں تحریر ہے۔ ابن نجار مولف تاریخ بغداد جنکی وفات سنہ ۶۴۳ھ میں ہوئی انھوں نے بھی اس قبے اور قبور کو دیکھا تھا وہ قبے کے دو دروازے بیان کرتے ہیں۔ سنہ ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ کے وقت بھی یہ قبہ اور دونوں قبریں اسی حالت میں موجود تھیں ۸۸۶ھ میں سید نور الدین علی سمہودی مدنی نے اس قبے کو بچشم خود دیکھکر اس کا کتبہ اپنی کتاب وفاء الوفا میں درج کیا جسکا ترجمہ اوپر تحریر کیا گیا۔ چونکہ المنصور مستنصر باللہ کی تعمیر کا سنہ کتبہ میں درج نہ تھا اسلیے سید سمہودی کو اس بادشاہ کا نام سمجھنے میں سہو ہوا وہ فرماتے ہیں۔

"منصور خاندان عباسیہ کا پہلا بادشاہ تھا مگر اس کا لقب مستنصر نہ تھا"

یہ ہیچمداں عرض کرتا ہے کہ یہ عباسی خلیفہ بغداد تھا جس نے سنہ ۶۲۳ھ سے سنہ ۶۴۰ھ تک سلطنت کی اس کا نام منصور لقب مستنصر باللہ اور کنیت ابو جعفر تھی۔ (ملاحظہ ہو تاریخ الخلفا مولفہ جلال الدین سیوطی)

قطب الدین مکی نے بھی بصراحت اسکا نام منصور اور لقب المستنصر باللہ تحریر کیا ہے۔ اُسکو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس کا بنایا ہوا مدرسۂ مستنصریہ واقع بغداد اُسوقت ممالک اسلامیہ میں اپنے دار الاقامہ وغیرہ کی وجہ سے بےمثل سمجھا جاتا تھا۔ سنہ ۶۳۱ھ میں اس خلیفہ نے سطاف کعبہ میں مقام جبریل کے پاس نیلے پتھروں کا فرش بھی کرایا تھا۔ (الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۸)

حیرت یہ ہے کہ سید سمہودی نے بھی جو کسی چیز کے چھوڑنے والے نہیں ہیں اس قبے میں جنابہ سیدہؑ امام زین العابدین و امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہم السلام کی قبروں کی کوئی صراحت نہیں کی۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اپنی کتاب جذب القلوب تالیف سنہ ۱۰۰۱ھ میں ائمہ اطہار کی قبروں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ائمہ ہدیٰ ایک ہی قبر میں مدفون ہیں بڑے قبے کے اندر جسے قبۂ عباس کہتے ہیں"

(مرغوب ترجمۂ جذب القلوب صفحہ ۱۷۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت مقبرۂ اہلبیت میں صرف دو ہی قبروں کی علامت تھی۔ ایک حضرت عباسؓ کی اور دوسری امام حسنؑ کی۔ مستنصر باللہ کا بنایا ہوا قبہ کوئی سات سو برس تک قائم رہا۔ تقریباً سنہ ۱۲۱۹ھ میں جب سعود ابن عبد العزیز امیر نجد کا تسلط مدینہ پر ہوا تو بقیع کے دوسرے

قبوں کیساتھ یہ قبۂ بھی منہدم کر دیا گیا۔ ۱۳۳۲ھ میں جب حجاز پر ترکوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو محمد علی پاشا والئ مصر نے اس قبّے کو مثل سابق از سر نو تعمیر کرادیا۔ جعفر برزنجی نزہتہ الناظرین تالیف ۱۲۸۷ھ میں لکھتے ہیں کہ یہ حسب سابق تعمیر ہوا ہے اور اب بھی اس قبّے کے دو دروازے ہیں مگر قبروں کی کیفیت انھوں نے بھی کچھ نہیں لکھی۔ چودھویں صدی ہجری کے ہندوستانی سیاحان حجاز کے سفرناموں اور جنت البقیع کی عکسی تصویروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان بقیع میں داخل ہوتے ہی زائر کے داہنی جانب قبۂ اہلبیت واقع تھا۔ یہ تمام قبّوں سے زیادہ بڑا اور بلند تھا اس میں پانچ مردانی قبریں اور ایک قبر جنابہ فاطمہؑ کی تھی جو قبلہ کی جانب دیوار کے ایک گز اونچے چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ اس قبّے کے دو دروازے تھے ایک ہمیشہ بند رہتا تھا۔ مزارات پر چوبی ضریح کٹہرے کے مثل حلقہ کیے ہوئے تھی اور قبروں پر سبز غلاف پڑے تھے جنپر زردوزی حرفوں میں اُن کے اسمائے مبارک کڑھے تھے۔ جنابہ سیّدہ کے غلاف پر زیادہ کام کیا ہوا تھا۔ (سفر حرمین ورفیق الحاج وغیرہ)

آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو امامیہ طریق رکھتے تھے ۱۳۲۹ھ میں زیارت کو گئے تھے۔ انھوں نے بمقابلۂ دوسرے سیاحوں کے قبۂ اہلبیت کا ذکر زیادہ صراحت سے کیا ہے وہ فرماتے ہیں:-

"اس مقبرے کی عمارت ایک مضبوط پتھر کا گنبد ہے جس کے دروازے پر لکھا ہے:-

لی خمسۃ اطفی بھا حر الوبآ الحاطمہ

المصطفیٰ والمرتضیٰ وابناھما والفاطمہؑ[1]

اندر ضریح مبارک کی وسعت دس گز لمبی پانچ گز چوڑی ہوگی۔ ایک چوبی ضریح اندر دتی ہے جس کے اندر قبور مطہرہ پر قیمتی غلاف پڑے ہوئے ہیں۔ باہر لوہے کی ضریح ہے جس کے اوپر کے حصہ پر قیمتی کام ہے۔ اس قبر میں ایک جگہ برابر حضرت امام حسن۔ حضرت امام زین العابدین۔ حضرت امام محمد باقر حضرت جعفر صادق علیہم السّلام مدفون ہیں۔ کٹہرے میں چاروں طرف تنگ راستہ ہے۔ یعنی شمالاً جنوباً ایک ایک گز اور غرباً شرقاً چار چار گز ہر امام کی قبر کے مقابل جداگانہ زیارت مکتوب ہے۔ (روزنامچہ سیاحت ص ۲۸۳)

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ پنجتن پاک یعنی مصطفیٰ و مرتضےٰ و فاطمہ اور اُن کے صاحبزادوں کا واسطہ جلانے والی وبا کی حرارت کو بجھا دے۔

"اوّل یہ عمارت بغیر گنبد او رچھت اور ضریح کے تھی۔ اسکے اندر چوبی ضریح سلطان سلیم نے بنوائی مابعد قیمتی آہنی ضریح ایرانیوں نے بنوائی۔"

(روزنامچہ صفحہ ۳۹۴)

"یہ روضہ ایک سادہ گنبد ہے جسپر سب ائمہ اور حضرت سیّدہ کی زیارتیں جدا جدا لکھی ہیں عمارت زیادہ عالیشان نہیں ہے اور یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ اہل عرب وحجاز نے قدر ائمہ اثنا عشر اور حضرت سیّدہ کی نہیں کی اور انکی قبریں اُن کی شان کے موافق عمارت نہیں رکھتیں۔ اگرچہ میری رائے میں شان مقبرے سے کوئی اعزاز عباد اللہ نہیں بڑھتا مگر جہلا کیلئے یہ بات ضروری ہے اور اظہار عقیدت کیلئے۔ تاہم گنبد بیس پچیس ہزار کی لاگت سے کم کا نہیں ہے اور اندر کام بھی نقاشی کا ہے۔ ضریح کی چھت پر زربفت کا کپڑا ہے۔"

(روزنامچہ صفحہ ۳۹۱)

"گنبد سیّدہ وائمہ کے گرد بہت سے اشعار مناجات ومنقبت میں تحریر ہیں۔"

(روزنامچہ صفحہ ۴۱۳)

خواجہ صاحب مرحوم نے اس بات پر افسوس کیا ہے کہ اہل عرب وحجاز نے قدر ائمہ اثنا عشر وحضرت سیدہ کی نہیں کی اور انکی قبریں ان کی شان کے موافق نہیں بنوائیں۔ یہ گنہگار عرض کرتا ہے کہ ائمہ وسیدہ کی قدر صرف اہل حجاز واہل عرب پر ہی واجب نہ تھی۔ اہل ہند نے کون سی قدر کی۔ یہی ان بزرگواروں کے مقبرے اُنکی شان کے موافق بنوا دیتے۔ مگر افسوس اہل ہند کی دریا دلی کی یہ حالت ہے کہ جن عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہونیکے لیئے ہزاروں کوس کا سفر طے کر کے اور ہزاروں مصیبتیں جھیلکر پہنچتے ہیں وہاں کے جاروب کشوں کو دو چار آنے دینا ناگوار گزرتا ہے۔ حالانکہ جس شرف کی تمنا میں ہم گھر سے نکلتے ہیں وہ شرف اُن کو ہر وقت حاصل ہے اور وہ اُن آستانوں سے دن رات کسب سعادت کرتے رہتے ہیں۔ ہم ان مزاروں کے خس وخاشاک کو تو تبرک سمجھتے ہیں مگر ان کے خدمتگزاروں کو ڈاکو اور استحصال بالجبر کرنیوالا جانتے ہیں۔ ایک شیعہ صاحب نے جنابہ سیدۂ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کے بیت الحزن کے خادم کو کچھ پیسے دیکر

اُسکی نسبت اپنے سفرنامہ میں یہ تحریر فرمایا ہے۔

"اس میں داخلہ کیلئے جبراً ٹیکس لینے والا ایک عرب بیٹھا ہے۔ میں نے بھی کچھ دیا کہتا ہے کہاں سے کھاؤں"

مدینہ منورہ کے حمام والے کی نسبت ایک مالدار زائر کا یہ فقرہ قابل غور ہے۔

"یہ مالک حمام چور ڈاکو تھے۔ اول کچھ طے نہ کیا کہا کہ آپ کا گھر ہے۔ غسل کے بعد نصف مجیدی تقریباً (دس آنے) لیے۔

ناظرین غور کریں کہ مدینہ منورہ جیسے متبرک شہر کے باشندے اگر ہماری خدمت کریں اور مروت کے مارے اجرت پہلے نہ ٹھہرا کر اخلاقاً کہیں کہ آپ کا گھر ہے۔ اس کا جواب ہماری طرف سے کیا ہونا چاہیئے۔ یہ ملحوظ رہے کہ مدینے میں پانی اور ہیزم سوختنی دونوں گراں ہیں۔ اسکے ساتھ مکان حمام کا کرایہ اور نہلانے والوں کی اجرت کا بھی شمار کیا جائے تو دس آنے کیا بہت ہوئے۔ ہندوستان کے شہروں میں بعض اوقات اس سے زائد ہم خرچ کر دیتے ہیں۔ ان صاحب سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ان جیسا متمول زائر اگر پانچ روپیہ بھی حمام والے کی نذر کر دیتا تو بھی کم تھی۔ برخلاف اسکے چور اور ڈاکو کا خطاب ہمیشہ کیلئے اُسکو دیدیا۔ جب تک ان کا مطبوعہ سفرنامہ دنیا میں رہیگا اسکے پڑھنے والے اہل مدینہ سے چونکتے رہینگے۔ یا اللہ ہماری خطاؤں سے درگذر ہماری لغزشوں کو معاف فرما اور ہمکو امتحان میں مت ڈال! اب میں پھر اپنے مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ محمد علی پاشا کا تھوایا ہوا قبہ جس کے حالات اوپر درج کیے گئے تقریباً سو برس تک قائم رہا۔ سنہ ۱۳۳۴ھ میں سلطنت حجاز ترکوں کے ہاتھ سے نکلکر حسین پاشا شریف مکہ کے قبضے میں گئی۔ پھر سنہ ۱۳۴۳ھ میں اہل نجد نے زیر سرکردگی جلالتہ الملک سلطان عبدالعزیز ثانی ابن عبدالرحمٰن آل سعود حجاز سے شریف کو نکال کر حرمین پر دوبارہ قبضہ حاصل کرلیا اور اسکے بعد بقیع کے دوسرے قبوں کیساتھ اس قبے کو بھی منہدم کر کے اونچی اونچی قبروں کے بجائے نیچے نیچے چبوتروں کی قبریں بنا دیں۔ سنہ ۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار زیارت کیلئے گیا ہے تو اس نے نیچے چبوتروں کی شکل کی قبریں دیکھیں جن کے گرد حاشیہ یا بندش کے طور پر پتھر چُن دیے گئے تھے ایک ایک پتھر علامت قبر کا سرہانے نصب تھا۔ قبروں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

الف - قبر جنابہ فاطمۂ زہرا بنت رسول اللہ

آنحضرت کی وفات کا صدمہ جنابہ سیدہ کیلیے ایسا جاں گسل و روح فرسا تھا کہ وہ پچھتر دن یا چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں۔ اور ۲۰ جمادی الثانی سنہ ۱۱ھ کو یا دوشنبہ کے دن تیسری رمضان سنہ ۱۱ھ کو وقت مغرب رحلت فرمائی۔ اُس وقت مدینے میں عورتوں کے جنازے بھی مردانہ جنازوں کیطرح تختوں اور پلنگوں پر لیجاتے تھے مگر جنابہ سیدہ کو انکی حسب وصیت بخیال پردہ و حجاب تابوت میں لیگئے۔ رات ہی کو جنازہ اُٹھادیا گیا اور اُنکے انتقال کی اطلاع بجز اہل خاندان کے عام طور پر کسی کو نہیں کیگئی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکے مزار کے متعلق یقین کیساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس مقام پر ہے۔ مختلف روایتوں کی بنا پر مدینۂ منورہ میں اُن کا مدفن حسب ذیل گیارہ جگہ بیان کیا جاتا ہی

اوّل - بعض قدیم مورخ اسیر متفق ہیں کہ جنابۂ سیدہ غالباً مقبرۂ اہلبیت واقع بقیع میں دفن ہیں مگر اُن میں سے یہ کوئی نہیں کہتا کہ اُن کی قبر کی علامت بھی وہاں موجود ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ امام محمد غزالی[٥٢] نے جو سنہ ۴۸۰ھ میں مدینہ منورہ گئے تھے اپنی کتاب احیاء العلوم میں سیدہ کی قبر کا کچھ ذکر ہی نہیں کیا کہ مدینے میں ہے بھی یا نہیں حالانکہ انھوں نے مدینۂ منورہ کی

---

٥١ - جنابہ سیدہ سفر آخرت کیلیۓ پہلے سے بالکل تیار تھیں چنانچہ وفات سے قبل انھوں نے بڑی احتیاط کیساتھ غسل کیا۔ رخسارہ مبارک کے نیچے ہاتھ رکھکر قبلہ رو لیٹ گئیں اور اسما بنت عمیس سے جو اُسوقت حضرت ابوبکر کے نکاح میں تھیں، اور جنابہ سیدہ کی خدمت میں حاضر تھیں فرمایا کہ اب میرا وقت آخر آپہنچا مگر عورتوں کے جنازے جسطرح یہاں اُٹھاتے ہیں اُس سے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔ حضرت اسما نے عرض کیا میں نے حبش میں ایک قسم کے تابوت دیکھے ہیں جن میں عورتوں کے جنازے اُٹھاتے ہیں اور ایک نمونہ بنا کر جنابۂ سیدہ کو دکھایا۔ سیدہ نے اُسے دیکھکر پسند کیا اور تبسم فرمایا۔ یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو آنحضرت کی وفات کے بعد آپ سے ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد اُن کا طائر روح پرواز کر گیا۔ اور تابوت میں اُٹھائی گئیں۔ مشہور روایت یہی ہے مگر ایک روایت یہہ بھی ہے کہ وہ اپنے مکان ہی میں دفن ہوئیں اور اس صورت میں تابوت کی ضرورت نہ ہوئی ہوگی۔

٥٢ - ان کا لقب حجۃ الاسلام ہے۔ طوس کے رہنے والے تھے سنہ ۴۵۰ھ میں ولادت اور سنہ ۵۰۵ھ میں وفات ہوئی کیمیائے سعادت اور احیاء العلوم انکی مشہور تصانیف ہیں۔

تمام مشہور قبروں کا ذکر کیا ہے اور اہل بقیع کی زیارت کیلئے حسب ذیل ہدایت کی ہے۔

"آنحضرت صلعم پر سلام پڑھنے کے بعد نماز ہر روز بقیع میں جائے اور قبر عثمان بن عفان و قبر حسن بن علی و قبر علی بن حسین و محمد بن علی و جعفر بن محمد رضی اللہ عنہم اور قبر ابراہیم ابن رسول اللہ اور قبر صفیہ عمہ رسول ؐ کی زیارت کرے۔"

(احیاء العلوم عربی مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۲۴۸)

ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں اور ابن بطوطہ نے ۷۲۶ھ میں مقبرۂ اہلبیت کا ذکر کیا ہے مگر یہاں بجز امام حسن علیہ السلام و حضرت عباس عم رسول اللہ کی قبروں کے کسی اور کی قبر نہیں بتاتے۔ ان سیاحوں نے جنابہ سیدہ کی قبر کی نشاندہی مزار حضور سرور کائنات کے متصل کی ہے جسکا ذکر آگے آئیگا۔ سمہودی نے بھی ۸۸۶ھ میں اس مقبرے میں بجز متذکرہ بالا دو قبروں کے کسی تیسری قبر کی علامت کا ذکر نہیں کیا۔ ۱۰۱۱ھ میں عبدالحق محدث دہلوی بھی ساکت ہیں۔ یہاں تک کہ تیرھویں صدی کا مورخ جعفر برزنجی بھی نزہتہ الناظرین تالیف ۱۲۸۷ھ میں اس مقبرے یا قبے میں جنابہ فاطمہ زہرا کی علامت قبر کی موجودگی ظاہر نہیں کرتا۔ البتہ چودہویں صدی کے ہندوستانی سیاح اس مقبرے میں جنابہ سیدہ کی علامت کا وجود ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً حاجی ڈاکٹر نور حسین صاحب صابر اپنے سفرنامہ تالیف ۱۳۱۹ھ میں لکھتے ہیں۔

"اس قبے میں قبلہ کی جانب دیوار کے ایک گز اونچے چبوترے پر جنابہ فاطمہ زہرا کا مزار بڑی شان و شوکت و آرائش سے بنا ہے۔"

(رفیق الحجاج)

۱۳۲۹ھ میں حاجی عبدالرحیم صاحب بنگلوری سفر حرمین میں لکھتے ہیں:۔

"اس قبے کے ایک گوشہ میں ذرا بلندی پر مزار اقدس خاتون جنت ہے۔ مزار پاک بالکل غلاف میں پوشیدہ ہے۔ انکے غلاف پر زیادہ کام کیا ہوا ہے۔"

(سفر حرمین صفحہ ۸۵)

آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جنھوں نے ۱۳۲۹ھ میں زیارت کی تھی اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں۔

"اس قبے میں جانب مغرب حضرت فاطمہ کا مزار مبارک ہے۔ قبر فاطمۂ زہرا پر قیمتی کپڑے پڑے ہیں۔ حضرت فاطمہ کی قبر کے برابر دیوار پر نہایت قیمتی چادر جو ہزار ہا روپیے میں تیار ہوئی ہوگی آویزاں ہے" روزنامچہ ص ۳۹۱

اس گنہگار نے ۱۳۴۵ھ میں مقبرۂ اہلبیت یعنی امام حسن و امام زین العابدین و امام محمد باقر و امام جعفر صادق علیہم السلام کی قبور کے مشترکہ چبوترے سے جانب جنوب تین چار گز کی فاصلہ پر ایک کچا چبوترہ زمین سے بالشت بھر اونچا دیکھا تھا۔ جس کے اطراف معمولی پتھر بطور بندش کے چن دیئے گئے تھے۔ ایک ناتراشیدہ پتھر سرہانے نصب تھا۔ فاتحہ اسلام و زیارت زیادہ تر یہیں پڑھی جاتی ہے اور عموماً اسکو صحیح قبر سمجھا جاتا ہے۔

دوم۔ دوسرا مقام دفن جنابہ سیدہ بیت الحزن واقع بقیع تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں کبھی علامت قبر بنائی گئی اور کبھی نہیں بنائی گئی۔ اگلے زمانہ میں اسکو مسجد فاطمہ بھی کہتے تھے۔ امام غزالی نے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی ہے مگر اس جگہ جنابۂ سیدہ کی قبر کا انھوں نے کچھ ذکر نہیں کیا۔ (احیاء العلوم عربی مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۲۴۴)

مقبرۂ اہلبیت کا ذکر ختم کر دینے کے بعد بیت الحزن کی مزید صراحت کیجائیگی۔

سوم۔ بقیع میں دار عقیل سے (۲۳) یا (۳۷) گز شرعی کے فاصلہ پر جنابہ سیدہ کا مدفن بیان کیا گیا ہے۔

چہارم۔ چوتھا مقام دفن فاطمہ دار عقیل کے گوشۂ یمانیہ میں جدہر سے بقیع کے اندر کی سڑک کسی زمانہ میں گذرتی تھی تصور کیا گیا ہے۔

پنجم۔ دار عقیل و دار نبیہ کے درمیان گلی کے سرے پر بھی مدفن فاطمۂ زہرا کی روایت ہے۔

ششم۔ زقاق[1] نبیہ سے پندرہ ہاتھ کے فاصلہ پر بھی مدفن سیدہ خیال کیا گیا ہے۔

ہفتم۔ ایک روایت ہے کہ زقاق نبیہ سے باہر مدفن شریف ہے۔

ہشتم۔ ایک روایت یہ ہے کہ بقیع کی مشرقی جانب ایک مسجد تھی جہاں بچوں کی نماز جنازہ پڑھی جاتی تھی اسکے قریب جنابۂ سیدہ دفن کی گئیں۔ یہاں رقیہ نامی کوئی عورت

---

[1] زقاق کے معنی کوچے کے ہیں۔

ایک سیاہ ڈیرے میں رہا کرتی تھی وہ اس قبر سے واقف تھی اس کے سوا دوسرا کوئی شخص اس قبر کی جائے وقوع سے آگاہ نہ تھا۔ البتہ اہلبیتؑ کو اس کا علم تھا۔

نہم۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت کے بموجب قبر جنابہ سیّدہ آپکے مکان میں ہے جو عمر بن عبدالعزیز نے سنہ ۹۱ھ میں تعمیر مسجد نبوی کے وقت داخل مسجد کر لیا۔ یہ بیت الشرف جنابہ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کا سکونتی مکان تھا۔ اب یہ مقام آنحضرت کے مزار اقدس کی جالی کے باہر جانب شمال ہے۔ اسکے گرد بھی سبز رنگ کی ڈھلی ہوئی جالی ہے اور بظاہر مزار حضور سرور کائنات کی جالی کا ایک حصّہ ہے۔ ابن جبیر کے زمانہ میں (سنہ ۵۸۰ھ) یہاں قبر کی علامت نہ تھی صرف پتھر کا ایک چھوٹا سا حوض تھا جسے اُسوقت بعض لوگ جنابہ سیّدہ کا مکان اور بعض انکی قبر بیان کرتے تھے۔ (ترجمہ سفر نامہ ابن جبیر مطبوعہ رامپور صفحہ ۱۶۷)

سمہودی کے زمانہ سنہ ۸۸۶ھ میں بھی اس جگہ قبر کی کوئی علامت نہ تھی مگر لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں مدفن سیدہ ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"حجرۂ شریف کے پیچھے جالی کے اندر لکڑی کی محراب کے قریب مثلث نما ایک جگہ ہے ہم نے دیکھا کہ خدام وہاں پاؤں رکھنے سے پرہیز کرتے ہیں اُن کا زعم ہے کہ یہاں حضرت فاطمہؑ کی قبر ہے"

(وفاء الوفاء عربی جلد دوم مطبوعہ مصر صفحہ ۹۴)

سید سمہودی اس مقام کی نسبت یہ بھی فرماتے ہیں کہ مزار اقدس سرور کائنات پر جب بڑا قبّہ تعمیر[۱] ہو رہا تھا تو بنیاد کھودتے وقت حجرۂ شریف کے پیچھے جو مثلث کی شکل کی جگہ ہے اُس کی حد کے آخر میں اینٹوں سے بنی ہوئی ایک قبر پائی گئی اور اس میں سے کچھ ہڈیاں نکلیں لوگوں میں بڑی پریشانی ہوئی آخر بنیاد کو وہاں سے کسیقدر ہٹا دیا۔ (وفاء الوفاء عربی مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۹۵و۹۴)

تیرھویں صدی ہجری سے اس مقام پر جنابہ سیدہ کی قبر کی علامت و قبہ کا وجود معلوم ہوتا ہے۔ یہ پتہ نہیں لگتا کہ یہ قبر و قبہ کس نے تعمیر کرایا۔ مولوی قاضی محمد سلیمان صاحب اپنی سفرنامہ

---

[۱]۔ مزار اقدس پر پہلی مرتبہ سنہ ۶۷۸ھ میں ملک المنصور قلاؤن صالحی نے قبہ تعمیر کرایا تھا۔ توضیحاً سقف حجرۂ شریف و گنبد خضرا کے حالات باب دوم کی فصل اول میں ملاحظہ ہوں۔

الہادی میں تحریر فرماتے ہیں کہ غالباً یہ قبر و قبہ سلطان عبد المجید خاں ثانی کا تیار کرایا ہوا ہے جسکے عہد میں موجودہ عمارت مسجد نبوی پندرہ سال کی مدت میں تکمیل کو پہنچی۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے اس سلطان کا عہد حکومت ۱۲۵۵ھ سے ۱۲۷۷ھ تک ہے۔ اور یہ قبر و قبہ ۱۲۳۲ھ میں بھی موجود تھے جسکا ذکر فرنگی سیاح برکھارٹ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ اسکے بعد سیاح حجاز برٹن نے بھی جو ۱۲۶۹ھ میں مدینہ گیا تھا اس کا ذکر کیا ہے اہل نجد نے اپنی سابقہ فتوحات کے وقت اس قبر و قبہ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب بھی یہ بعینہٖ موجود ہے قبہ مخروطی شکل کا چھوٹا سا ہے۔ اسپر سبز اطلس کا غلاف ایک قنات کیطرح گرداگرد پڑا رہتا ہے جس سے قبر شریف و قبہ کی ہیئت کچھ نظر نہیں آتی غلاف پر جنابۂ سیدہ کا نام اور درود سفید حرفوں میں بنا ہوا ہے بعض لوگ اس قبر کو غیر صحیح سمجھکر یہاں زیارت نہیں پڑھتے۔

دہم۔ جنابۂ سیدہ کی قبر مسجد نبوی میں باب النساء کے متصل بھی بیان کیجاتی ہے۔ یہ جگہ جنابۂ سیدہ کا مکان تصور کیگئی ہے جو مسجد میں داخل ہوگیا ہے اور اب اس مقام کا تعین صحن مسجد میں باب النسا کے سامنے بستانِ[1] فاطمہ پر ہوتا ہے۔ اسطرف کے مکانات ۹۱ھ میں عمر بن عبد العزیز والیٔ مدینہ نے ولید بن عبد الملک کے حکم سے داخل مسجد کیے تھے بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ یہاں جنابۂ سیدہ فاطمہ زہرا کا مکان تھا۔ چنانچہ قاضی محمد سلیمان صاحب اپنی کتاب الہادی الی سبیل الرشاد میں بہ حوالۂ

---

[1] اس باغ یا کیاری کو حضرت فاطمہ کا باغ کہتے ہیں۔ تاریخوں سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ جنابہ سیّدہ کا باغ تھا اور اس کے درخت اُس معصومہ کے بوئے ہوئے تھے۔ البتہ ۸۴۳ھ میں یہاں کھجور کے چند درختوں کا پتہ لگتا ہے۔ مگر ۸۸۶ھ کی آتش زدگی بھی ایسی قیامت کی تھی کہ اُس سے امید نہیں کہ یہ درخت بچے ہوں۔ بہرحال زمانۂ دراز سے یہ درخت اور کچھ درخت چلے آرہے تھے۔ لوگ انکی پتیاں اور پھل تبرک سمجھتے تھے ان کے متصل ہی ایک کنواں ہے جسے بعض لوگ اسکو کوثر اور بعض زمزم کہتے ہیں اور اسکا سوتا مکۂ معظمہ کے زمزم سے بتاتے ہیں اسکے پانی سے ان درختوں کو سینچا جاتا تھا ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے اسکی زیارت کی تھی مسجد کے جانب شمال لکڑی کے ایک مربع کٹہرے کے اندر آٹھ کھجور کے درخت۔ ایک املی کا۔ ایک بیری کا ایک روئی کا کچھ مہندی کے اور کچھ کروٹن موجود تھے۔ ہریالی سبزی اور بھی تھی۔ شعبان ۱۳۴۶ھ میں حکومت نجد نے اس کے تمام درخت کٹوادیے اور کنوئیں پر تختے جڑ کر مقفل کردیا۔

اصول الکافی مولفہ شیخ یعقوب کلینی لکھتے ہیں:۔

"سیدہ کی قبر اُن کے گھر میں تھی۔ جب بنو اُمیہ نے مسجد میں اضافہ کیا تو سیدہ کا
گھر شامل مسجد ہوگیا۔ اس بیان سے لازم آتا ہے کہ سیدہ کی قبر مسجد نبوی کے
صحن میں ہو یعنی بُستان فاطمہ کے اندر"

(الہاد صفحہ ۲۲۱ و ۲۲۸)

اگرچہ یہ مقام جنابۂ سیدہ کے مکان و باغ سے منسوب ہے مگر اس فقیر کی رائے میں یہ مکان جنابۂ فاطمہ صغریٰ بنت امام حسین علیہ السلام کا ہوگا جن کے شوہر حضرت حسن مثنیٰ ابن امام حسن علیہ السلام تھے اور یہ دونوں بزرگوار وقت توسیع مسجد بجبر و اکراہ اپنے مکان سے باہر کیے گئے تھے جسکی توضیح مزار سرور کائنات کے ضمن میں کیجاچکی ہے۔ معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کا بیت الشرف حضور سرور کائنات کے اُس حجرہ [illegible] سے جس میں اب مزار اقدس ہے بالکل ملا ہوا تھا جہاں اب علامت قبر سیدہ موجود ہے جسکا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔

یازدہم۔ مسجد نبوی کے اندرونی دالان کے اس مقدس حصے میں بھی جسے روضہ[1] کہتے ہیں جنابہ سیدہ کا مدفن تصور کیا جاتا ہے۔ سید سمہودی اس روایت کو بالکل ضعیف قرار دیتے ہیں اور اگرچہ یہاں علامت قبر بھی نہیں ہے مگر قدیم سے بعض محتاط زائر یہاں سلام و زیارت پڑھتے رہے ہیں خصوصاً شیعہ۔ چنانچہ ناصر خسرو نے ۴۳۹ھ میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے ۱۳۲۶ھ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ میں نے بھی بعض حاجیوں کو یہاں زیارت پڑھتے دیکھا تھا۔ مذکورۂ بالا گیارہ مقامات میں سے آٹھ جنت البقیع میں ہیں۔ مگر سوائے مقبرۂ ائمہ و بیت الحزن کے اس زمانہ میں کسی اور جگہ کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے مدینہ منورہ میں پانچ رہنماؤں (مزدوروں) سے کام لیا تھا۔ جب ان سے اور نیز بعض دوسرے اہل مدینہ سے ان کے مقامات نمبر ۳ تا نمبر ۸ کا

---

[1] ۔ اس جگہ کی نسبت حدیث میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ "میرے منبر و مکان کے درمیان بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے"۔ یہ جگہ کوئی دس بارہ گز لمبی اور چار پانچ گز چوڑی ہے۔ یہاں جابجا دیواروں میں سنگ مرمر و سنگ عقیق کے چوکے پر رنگ برنگ کے کتبے نصب ہیں اور طلائی نقش و نگار نے اس حصہ کو مرصع کردیا ہے۔ یہاں صبح سے شام تک زائرین نماز و صلواۃ و سلام و قرآن پڑھا کرتے ہیں۔ بلحاظ کثرت ثواب اس مقام کو مجازاً بہشت کہا گیا ہے۔

ذکر کیا تو اول اُن کو میرے اس سوال پر حیرت سی ہوگئی کہ جنابِ سیدہؑ کا مدفن مدینے بھر میں صرف چار جگہ تصور کیا جاتا تھا یہ نئے سات مقامات اور کہاں سے پیدا ہو گئے۔ بالآخر جب میں نے تاریخ کا حوالہ دیکر اُن سے پوچھا تو میرے سمجھا دینے کیلیے ان مقامات کی نشاندہی دارِ عقیل کے آس پاس اور کچھ اِدھر اُدھر کی جگہ دکھاکر کر دی۔ کسی تاریخ سے مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مقامات نمبر ۳ تا نمبر ۸ پر کبھی علامتِ قبر بنائی گئی یا نہیں اور کسی زمانہ میں عام طور سے زیارت پڑھی گئی یا نہیں۔

جنابہ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا پر سلام و زیارت پڑھتے وقت ہر شخص اپنے عقیدے۔ محبت۔ خلوص و جوش کا اظہار کرتا ہے لیکن عام طور پر جو سلام و زیارت پڑھی جاتی ہے وہ درج ذیل ہے۔ بعض لوگ اس میں کمی بیشی بھی کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ دردناک الفاظ میں اس معصومہ کی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہیں مگر مدینے کے مزور عموماً یہی سلام پڑھاتے ہیں۔

السلام علیک یا سیدتنا فاطمۃ الزہرا یا بنت رسول اللہ! السلام علیک یا بنت حبیب اللہ! السلام علیک یا خامس اہل کساءؑ۔ السلام علیک یا زوجۃ الامیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فی الجنۃ۔ السلام علیک یا ام الحسن والحسین السیدین الشہیدین الکوکبین القمرین النیرین سیدا شباب اہل الجنۃ ابی محمد الحسن و ابی عبداللہ الحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما وعنک وارضاک احسن الرضا وجعل الجنۃ منزلک ومسکنک وماولک۔ السلام علیک وعلی ابیک المصطفیٰ وبعلک علی المرتضیٰ وبنیک الحسنین ورحمۃ اللہ برکاتہ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔

اے رسول اللہ کی صاحبزادی ہماری سردار فاطمہ زہرا آپ پر سلام۔ اے محمد مصطفیٰ کی صاحبزادی آپ پر سلام۔ اے حبیب خدا کی صاحبزادی آپ پر سلام۔ اے ہمارے آقا امیر المومنین علی مرتضیٰ کی زوجۂ محترمہ آپ پر سلام۔ اے حسنؑ و حسینؑ کی والدہ ماجدہ آپ پر سلام آپ کے یہ دونوں صاحبزادے یعنی ابی محمد الحسن اور ابی عبداللہ الحسین دو سردار ہیں۔ دو شہید ہیں

ؑ کسا کے معنی چادر کے ہیں۔ جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو آنحضرت نے علی و فاطمہ و حسن و حسین کو اپنی چادر عبا میں لیکر دعا کی کہ یہ میرے [illegible]

دو ستارے ہیں۔ دو چاند ہیں۔ جو انان بہشت کے سرتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے اور آپ سے خوش ہو۔ اور آپ کو بہترین طور پر خوشنود کرے اور آپ کا مکان آپ کی منزل اور آپ کا مسکن جنت قرار دے۔ آپ پر۔ آپ کے پدر بزرگوار پر۔ آپ کے شوہر پر اور آپ کے فرزندوں پر سلام اور خدا کی رحمت و برکت۔

(ب) قبر حضرت عباس عم رسولؐ

حضرت عباس ابن عبد المطلب آنحضرت کے چچا تھے۔ جنگ بدر میں یعنی سنہ ۲ھ میں ایمان لائے۔ اٹھاسی برس کی عمر میں ۱۲ رجب سنہ ۳۲ھ میں وفات پائی اور البقیع میں دفن ہوئے عام طور پر ان کی قبر مقبرۂ اہلبیت ہی میں بیان کیجاتی ہے یہاں تک کہ اس مقبرے کا دوسرا نام بھی مقبرۂ عباس مشہور ہے مگر ایک روایت یہ بھی ہے کہ اُن کو حضرت فاطمہ بنت اسد کی قبر کے نزدیک جو گوشۂ دار عقیل میں بھی جاتی ہے دفن کیا گیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ عباس البقیع کے بیچوں بیچ میں دفن کیے گئے۔

مسعودی نے مروج الذہب تالیف سنہ ۳۳۶ھ میں مقبرۂ اہلبیتؑ کے ضمن میں حضرت عباس کی قبر کا ذکر نہیں کیا۔ امام محمد غزالی نے سنہ ۴۸۷ھ میں مدینۂ منورہ کی زیارت کی تھی مگر وہ بھی احیاء العلوم میں مدفونین البقیع کے ضمن میں حضرت عباس کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔ البتہ سنہ ۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے ان کی قبر کی نسبت یہ لکھا ہے:-

> یہ قبر عریض و بلند ہے۔ قبر پر نہایت خوشنما تختے لگے ہیں اور تختوں پر چمکدار پیتل کی چادر کی کٹی ہوئی بیلیں جڑی ہیں۔ اس آرائش سے منظر نہایت دلفریب ہو گیا ہے۔

سنہ ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ نے بھی اس قبر کی یہی کیفیت تحریر کی ہے۔ اس کے بعد سنہ ۸۸۶ھ میں سید سمہودی نے قبر کی یہی وضع و قطع بیان کی ہے۔ چودھویں صدی ہجری کے سیاحوں نے قبر کی کوئی شکل نہیں بیان کی مگر یہ لکھا ہے کہ اس پر غلاف پڑا ہے۔ سنہ ۱۳۲۵ھ میں اس فقیر نے مقبرہ اہلبیتؑ کو پانچ قبروں کا ایک مشترک چبوترہ پایا جس پر علامت قبور کیلئے سرہانے ایک ایک پتھر نصب تھا۔ اگر زائر مشرق کی جانب منھ کرکے کھڑا ہو تو اس کے داہنی جانب

پہلی قبر حضرت عباس کی ہوگی۔

ج) قبر امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب

رمضان سنہ ۴۰ھ میں امیر المومنین کی شہادت کوفہ میں واقع ہوئی۔ مشہور روایت ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے اونٹ پر جنازہ لیجا کر بطور خاص دفن کا انتظام فرمایا اور بعض مصلحتوں کے خیال سے اسکی اطلاع عام لوگوں کو نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنینؑ کے مدفن کے متعلق مختلف روائتیں ہیں اور کم سے کم بارہ مقام پر قبر شریف بیان کیگئی ہے۔ منجملہ اُن کے ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے جسد مبارک کوفے سے مدینے لاکر بقیع کی مقبرۂ اہلبیت میں دفن کیا۔ سید سمہودی اپنے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ سنہ ۸۶۷ھ میں مقبرۂ اہلبیتؑ میں مشہد حسنؑ و عباسؓ کے جانب قبلہ ایک قبر کھود رہے تھے کہ زمین سے لکڑی کا ایک تابوت نکلا جس پر سرخ غلاف پڑا ہوا تھا اور کیلیں جڑی ہوئی تھیں اور نہ وہ غلاف بگڑا تھا اور نہ کیلوں کی چمک میں فرق آیا تھا۔ سید موصوف کا خیال ہے کہ شاید یہ تابوت حضرت علیؑ کا ہو۔

ایک روایت جس کا تعلق اہل کشف سے ہے یہ ہے کہ امیر المومنینؑ اپنی والدۂ ماجدہ کے مقبرۂ بقیع میں دفن ہیں مگر ان دونوں مقامات پر علامت قبر شریف کبھی نہیں بنائی گئی۔ ایک روایت یہ ہے کہ کوفہ کے میدان میں آپ دفن کیے گئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ کوفہ کے دار الامارۃ میں دفن ہوئے اور اس جگہ کو لوگوں نے چھپا دیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ جس اونٹ پر جنازہ شریف تھا وہ گم ہوکر قبیلۂ بنی طے کے علاقہ میں پہنچ گیا اور انھوں نے دفن کر دیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ بیت اللہ میں مدفن ہے۔ اصلی مزار شریف نجف اشرف واقع عراق میں خیال کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ بلخ میں بھی ان کا مزار روضۂ سخی جان کے نام سے مشہور ہے۔ حاجی علی قاری ملازم شوستری کمپنی جہاز بمبئی جو ترکستان کے رہنے والے ہیں اور کابل میں بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا میرا ساتھ حج کو جاتے وقت جہاز میں ہوا تھا۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ترکستان میں مختلف پانچ مقامات پر حضرت علیؑ کے مزار ہیں۔ سب سے بڑی درگاہ بلخ میں ہے۔ موسم بہار میں وہاں عرس ہوتا ہے اور چالیس دن تک رہتا ہے چھبیس درس تک سے زائر وہاں منتیں مرادیں ماننے کیلیے آتے ہیں اور اونٹ۔ گائے۔ بیل۔ بھیڑ بکری

ذبح کرتے ہیں۔ دوسرا بڑا مزار مقام مرغ نان میں ہے۔ اسکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب حضرت علی اسطرف جہاد کرتے ہوئے تشریف لائے تو ایک بڑھیا نے روٹی اور مرغ کا سالن آپکے سامنے پیش کیا۔ آپ نے اس جگہ کا نام مرغ نان رکھا۔ مرغ نان میں تین مہینے تک عرس ہوتا رہتا ہے بہت سے معذور بیمار اور اپاہج دور دور سے وہاں آتے ہیں اور چالیس دن تک رہتے ہیں۔ اس کے بعد مزار مبارک سے تین دستک کی آواز سنائی دیتی ہے اور بیمار اچھا ہو جاتا ہے۔ مرغ نان میں دو پہاڑوں اور دریاؤں کے بیچ میں ایک بلند پہاڑی ہے جسپر (۱۸۰۰) سیڑھیاں چڑھکر پہونچتے ہیں اسپر گنبد بنا ہوا ہے۔ باقی تین مقام جہاں حضرت علی کا مزار ہے جہار جو، کوپا اور کابل ہیں۔ حضرت علی کے ایک فرزند محمد ابن حنفیہ[1] تھے ان کا مدفن بقول مورخ ابن خلکان جنت البقیع میں ہے مگر قاری صاحب موصوف نے مجھ سے کہا کہ ترکستان میں ضلع فرغانہ سے چند میل کے فاصلہ پر کہ ریل کا آٹھ آنے کرایہ دیا جاتا ہے ایک مقام خوآسے وہاں محمد حنفیہ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ مخلوق منت و حاجت لیکر وہاں پہنچتی ہے۔

(۵) قبر امام حسن علیہ السلام

اگرچہ امام حسن علیہ السلام کا مدفن عام طور پر مقبرۂ اہلبیت میں تسلیم کیا جاتا ہے مگر علامہ سمہودی نے ایک روایت یہ بھی لکھی ہے کہ وہ اپنی دادی حضرت فاطمہ بنت اسد کے مقبرے میں دفن کیے گئے۔ (خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ مطبوعہ مطبع میریہ مکہ معظمہ صفحہ ۲۰۲)

امام حسن علیہ السلام ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں زہر سے شہید ہوئے۔ عام روایتوں سے یہ واضح ہے کہ جب وہ آنحضرت کے روضۂ شریفہ میں دفن نہ ہو سکے تو ان کی حسب وصیت جنابہ سیدہ کے قریب جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ انکی قبر کا ذکر مورخین و سیاحان قدیم نے کیا ہے جو اسی وضع کی تھی جیسی کہ حضرت عباس کی قبر۔ اور اسپر بھی پیتل کی جالیاں جڑی ہوئی تھیں حضرت عباسؓ کی پائینتی ان کا سر رہا بیان کیا جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے سیاح لکھتے ہیں کہ ان کے مزار پر سبز غلاف پڑا تھا جسپر زردوزی کا کام تھا۔ میں نے ۱۳۲۵ھ میں پانچ قبروں کا مشترک چبوترہ جو دیکھا تھا اُس میں دوسری قبر انکی بیان کیگئی۔

(۶) مدفن سرِ مبارک امام حسین علیہ السلام

[1] حضرت علی کے کئی صاحبزادوں کا نام محمد تھا اس وجہ سے بغرض امتیاز انکی والدہ کے نام کی مناسبت سے انکو محمد بن حنفیہ کہتے ہیں۔

سنہ ۶۱ ہجری میں بعد واقعہ کربلا امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک یزید کے پاس دمشق بھیجدیا گیا تھا۔ جس کے مدفن کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، منجملہ اُن کے ایک روایت یہ بھی ہے کہ یزید نے سر مبارک اپنے عامل کے پاس مدینے بھیجدیا تھا اُس نے کفن میں لپیٹ کر سیدہ خاتون جنت کی قبر کے نزدیک مقبرۂ اہلبیت واقع بقیع میں دفن کردیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ کربلا میں جسد اطہر کے ساتھ دفن کیا گیا۔

دمشق میں ایک بہت بڑی مسجد ہے اسمیں بھی سر مبارک کا دفن ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ اس مسجد کا نام ہی مسجد راس سیدنا الحسین ہے۔

نیز قاہرہ میں ایک بڑا عالیشان مقبرہ مسجد حسین کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ فاطمی خلیفہ مصر المعز لدین اللہ نے سنہ ۳۶۲ ہجری میں سر مبارک دمشق سے لیجا کر وہاں دفن کیا اور اسپر ایک عالیشان عمارت تعمیر کرائی۔

(۹) قبر امام زین العابدین علیہ السلام

سنہ ۹۴ یا سنہ ۹۵ ہجری میں امام زین العابدین علی بن حسین علیہم السلام نے بروایات مشہورہ مدینۂ منورہ میں زہر سے وفات پائی تھی۔ یہ بھی مقبرۂ اہلبیتؑ میں مدفون تصور کیے جاتے ہیں۔ امام غزالی نے سنہ ۴۸۹ ہجری میں بقیع میں انکا مدفن بیان کیا ہی مگر ابن جبیر نے سنہ ۵۸۰ ہجری میں اور ابن بطوطہ نے سنہ ۷۲۶ ہجری میں مدفونین بقیع کے ضمن میں انکا ذکر نہیں کیا زمانۂ حال کے سیاح اہلبیتؑ کی قبروں کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ انکی قبر امام حسین علیہ السلام کی قبر کے برابر ہی جسپر سبز کارچوبی غلاف پڑا ہوا ہے۔ لوح و کتبہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ میں نے سنہ ۱۳۴۵ ہجری میں پانچ قبروں کے جس مشترک چبوترے پر زیارت پڑھی تھی اُس میں تیسری قبر بہار کربلا کی بتائی گئی تھی۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ شوستر واقع ایران میں بھی امام زین العابدین علیہ السلام کے نام سے ایک بڑی درگاہ بنی ہوئی ہے اور وہاں والے اُسی کو اصلی قبر خیال کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول حالات ایران)

(۱۰) قبر امام محمد باقر علیہ السلام

باختلاف روایات سنہ ۱۱۷ ہجری میں امام محمد باقر علیہ السلام نے بمقام حمیمہ وفات پائی اور نعش مبارک مدینے میں لاکر بقیع میں دفن کیگئی۔ (تاریخ ابن خلکان)

ابوالحسن علی بن حسین مسعودی مولف مروج الذہب نے ۳۳۲ھ میں اور امام غزالی نے احیاء العلوم میں ۵۰۳ھ میں ان کا مدفن بقیع لکھا ہے مگر ۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے اور ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ نے مقبرۂ اہلبیت میں یا بقیع میں کسی اور جگہ ان کے دفن ہونیکے متعلق کچھ نہیں لکھا اور نہ انپر فاتحہ پڑھنے کا کچھ ذکر کیا۔ وہ مقبرۂ اہلبیتؑ میں صرف امام حسن علیہ السلام و حضرت عباسؓ کی قبر کا ذکر کرتے ہیں اور بس۔ سید سمہودی نے ۸۹۳ھ میں اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ۱۰۰۱ھ میں مقبرۂ اہلبیت میں ان کے مدفن کا ذکر کیا ہے مگر علامت قبر کے وجود کی نسبت کچھ نہیں کہتے۔ ۱۸۵۳ء میں انگلستان کے مشہور سیاح کپتان برٹن نے حکیم عبداللہ خاں کے نام سے مسلمانوں کے بھیس میں سفر حجاز کیا تھا اس کے مزور نے اس خیال سے کہ مقبرۂ اہلبیت میں امام محمد باقر علیہ السلام کے دفن کی روایت صحیح نہیں ہے اس کو ان کی زیارت نہیں پڑھائی تھی۔ حالیہ فتوحات اہل نجد سے قبل چودھویں صدی کے ہندوستانی سیاح وجود قبر و علامت قبر کا ذکر کرتے ہیں جسپر مثل دوسرے قبور اہلبیت کے سبز کار چوبی غلاف پڑا تھا۔ لوح و کتبہ کچھ نہ تھا۔ قبر کے سرہانے اُن کی زیارت لکھی ہوئی آویزاں تھی۔ میں نے ۱۳۴۵ھ میں اہلبیت کے مشترکہ چبوترے پر زیارت پڑھی تھی۔ زائر اگر جانب مشرق منھ کر کے کھڑا ہو تو اس مبارک مقبرے کا چوتھا پتھر امام محمد باقر علیہ السلام کے سرہانے کا پتھر ہوتا ہے۔ میرے متعدد مزورین میں سے دو ایک نے ان کے یہاں دفن ہونیکے بارے میں شبہ کیا تھا۔

(ج) قبر امام جعفر صادق علیہ السلام

۱۴۸ھ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی زہر سے وفات ہوئی اور بقول صاحب مروج الذہب و حسب بیان احیاء العلوم غزالی جناب صادق آل محمدؐ کا مدفن مقبرۂ اہلبیت واقع بقیع میں ہے۔ مگر ابن جبیر و ابن بطوطہ نے ان کی قبر یا ان کی زیارت کا کچھ ذکر نہیں کیا سمہودی و شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کا مدفن یہاں بتاتے ہیں مگر علامت قبر کا ذکر نہیں کرتے۔ کپتان برٹن کے مزور نے بھی یہاں اُسکو زیارت امام جعفر صادق علیہ السلام نہیں پڑھائی تھی۔

(سفرنامۂ برٹن انگریزی جلد اول)

اہل نجد کی حالیہ فتوحات سے قبل ہندوستانی مسلمان سیاح جو حجاز گئے انھوں نے اہلبیت کی

دوسری قبور کے ساتھ ان کی قبر کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسوقت ان کی قبر پر بھی کارچوبی سبز غلاف پڑا رہتا تھا اور دوسرے ائمہ کی زیارت کی طرح ان کے سرہانے بھی ایک کاغذ پر زیارت آویزاں تھی سنہ ۱۳۴۵ھ میں اہلبیت کی مشترکہ قبور کا پانچواں پتھر ان کے مزار مبارک کی علامت ہے۔ بعض اہل مدینہ کو ان کا مدفن یہاں ہونے میں اب بھی شبہ ہے۔

مشرقی ترکستان کے ضلع ختن میں دریائے نیا کے کنارے جہاں اس دریا کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے ایک آباد قریہ ہے اس میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کا مزار ہے اور اس وجہ سے اس گاؤں کا نام ہی "مزار امام جعفر صادق" مشہور ہے

(سر آوریل آسٹن صاحب کا سفر مشرقی ترکستان ترجمہ سید محمود اعظم فہمی ترمذی مطبوعہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ صفحہ ۲۸)

(۵) مقبرۂ اہلبیت کی زیارت کا طریقہ

(پ)

قبرستان جنت البقیع میں چونکہ اہل بیت نبوت و رسالت کی مقدس ہستیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں اس لیے اُن کی زیارت کا طریقہ اور عام طور پر اُن کی زیارت کے وقت جو سلام پڑھا جاتا ہے وہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی حنفی کی کتاب "جذب القلوب الی دیار المحبوب" سے تحریر کیا جاتا ہے۔ مولوی صبغتہ اللہ صاحب ساکن مدراس شافعی مذہب نے بھی اپنی کتاب "السکینہ باخبار مدینہ" میں اسے نقل کیا ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اماموں میں سے کسی ایک کی بھی زیارت کرے تو گویا اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی۔

کسی نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ مجھے ایک قول بلیغ تعلیم کیجئے تاکہ میں اہلبیت کی زیارت کے وقت اُسے پڑھا کروں۔ آپ نے فرمایا جب تم اہلبیت کی زیارت کا ارادہ کرو تو پہلے غسل کرو اس کے بعد اولاً دروازے پر کھڑے ہو کر کلمہ شہادتین ادا کرو پھر جب تم اندر داخل ہو اور تمہاری نظر قبر پر پڑے تو تیس مرتبہ اللہ اکبر کہو۔ پھر ادب و تعظیم کے ساتھ

پاس پاس قدم رکھتے ہوئے تھوڑا آگے بڑھو۔ پھر کھڑے ہو کر تیس مرتبہ اللہ اکبر کہو۔ پھر قبر کے قریب ہو جاؤ اور چالیس مرتبہ اللہ اکبر کہو۔ اس کے بعد اسطرح سلام عرض کرو:۔

السلام علیک یا اهل البیت رسالة ومختلف الملائکة ومهبط الوحی وخزان العلم ومنتهی الحلم ومعدن الرحمة واصول الکرم وقادة الامم وعناصر الابرار ودعائم الاخیار۔ وابواب الایمان وامناء الرحمٰن وسلالة خاتم النبیین وعترة صفوة المرسلین ورحمة الله وبرکاته۔ السلام علی ائمة الهدیٰ۔ ومصابیح الدجیٰ۔ واعلام التقیٰ ورحمة الله برکاته۔ السلام علی محال رحمة الله ومساکن برکة الله ومعادن حکمة الله وحفظة سر الله وحملة کتاب الله وورثة رسول الله ورحمة الله برکاته۔ السلام علی دعاة الی حکم الله۔ والادلاء علی مرضاة الله والمظهرین لامر الله ونهیه والمخلصین فی توحید الله ورحمة الله وبرکاته۔ انّنی مستشفع بکم ومقدمکم طلبی وارادتی ومسئلتی وحاجتی اشهد الله انّی مومن بسرکم وعلانیتکم وانی ابریٔ الی الله تعالیٰ من عدو محمد وآل محمد من الجن والانس صلی الله علی محمد وآله الطیبین الطاهرین وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً

(جذب القلوب۔ باب ۲ حالات زیارت بقیع السکینہ باخبار مدینہ آداب زیارت بقیع ص ۲۰)

اسکا مطلب خیز ترجمہ یہ ہے:۔

اے اہلبیتِ رسالت۔ اے فرشتوں کے نازل ہونے اور جبریل کے آتر نیکی جگہ آپ پر سلام۔ آپ خزانۂ علم کے محافظ۔ حکمت کے مرکز۔ رحمت کے معدن۔ جود و کرم کے اُصول۔ امتوں کے سردار۔ پرھیزگاروں کے رکن۔ نیکوں کے ستون۔ ایمان کے دروازے۔ اللہ کے امانت دار۔ خاتم النبیین کے فرزند اور حضرت سید المرسلین کی اولاد ہیں۔ آپ پر خدا کی رحمت و برکت۔ آپ ہدایت کرنے والے امام ہیں۔ اندھیرے کے چراغ ہیں۔

زہد و تقویٰ کے نمونہ ہیں۔ آپ پر سلام اور آپ پر خدا کی رحمت و برکت۔ سلام ہو آپ پر۔ آپ منزل رحمت۔ مسکن برکت و منبع حکمت ہیں۔ آپ اسرار الٰہی کے نگہبان۔ کتاب الٰہی کی حامل اور رسول اللہ کے وارث ہیں۔ آپ پر خدا کی رحمت۔ آپ پر خدا کی برکت۔ آپ راضی برضا رہنے والے۔ خدا کے حکموں کی اشاعت کرنیوالے اور خدا کی توحید کو خالص کرنیوالے ہیں۔ آپ پر سلام۔ آپ پر خدا کی رحمت و برکت۔ میں آپ سے شفاعت کی امید رکھتا ہوں اور اپنی طلب و ارادہ و سوال و حاجت میں آپ کو اپنا پیشوا سمجھتا ہوں۔ میں خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ میں آپ کے ظاہری و باطنی احکام پر اعتقاد رکھتا ہوں اور میں محمدؐ و آل محمدؐ کے دشمنوں سے خدا کے سامنے بیزاری ظاہر کرتا ہوں خواہ وہ جنات سے ہوں یا بنی آدم سے۔ اللہ کی رحمت محمدؐ اور انکی طیب و طاہر اولاد پر اور بہت بہت سلام۔

(۶) مقبرۂ اہلبیتؑ پر اس گنہگار کی حاضری

۸ ذی حجہ ۱۳۵۴ھ کو شنبہ کے دن صبح کے دس بجے جب میں پہلی مرتبہ جنت البقیع میں حاضر ہوا تو اُس وقت گوناگوں تخیلات کا ایک دریا میرے دل میں موجیں مار رہا تھا۔ اور میرے دماغ میں تصورات کا عجیب و غریب مرقع کھچا ہوا تھا۔ اس خیال نے کہ میں کون ہوں اور کہاں آگیا ہوں مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ عالم بیخودی میں جب میرے رہنما نے مجھے مقبرۂ اہلبیتؑ پر لیجا کر کھڑا کر دیا اور صلواۃ و سلام پڑھنے کیلئے کہا تو میری زبان سے زیادہ میری آنکھوں نے یہ خدمت انجام دی۔ تخیل و تصور و استغراق و انہماک نے یہاں میرے لیے بہت سے سامان پیدا کر دیے تھے۔ میرا دماغ مختل چکر میں تھا اور میرا قلب مضطر تاریخ اسلام کی ورق گردانی نہایت سُرعت کیساتھ کر رہا تھا۔ انواع و اقسام کے واقعات متحرک تصویروں کیطرح جلد جلد میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ بظاہر یہاں عالیشان گنبد۔ خوشنما ضریح۔ خوبصورت مزار اور زرق برق غلاف نظر نہیں آرہے تھے مگر یہ فرزندان حضرت مزمل۔ یہ آل عبا اس سے مستغنی ہیں

کہ ان کی مقدس ضریحوں پر زرتار غلاف ڈالے جائیں اور ان کے عیرفانی مزاروں پر قبے بنائے جائیں۔ جن مقدس ہستیوں کی خدمت میں سلام عرض کرنے کیلئے میں حاضر ہوا تھا انکی شان بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے کبھی اُن کے موتیوں کے محل اور زبرجد کے ایوان آرہے تھے اور کبھی اُن کے مختصر بیت الشرف دکھائی دیتے تھے کبھی اُن کے نورانی پیکر جیسے حلہ ہائے بہشت سے ملبوس نظر آتے تھے اور کبھی چادر تطہیر سے مستور۔

(۷) بیت الحزن

حضرت علیؑ کا یہ مکان جنت البقیع میں مقبرۂ اہلبیتؑ کے دائیں جانب کوئی بیس قدم کے فاصلہ پر واقع تھا اور جنابہ سیدہ آنحضرت کی وفات کے بعد یہاں گریہ وزاری وعبادت الٰہی میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ ایک روایت کے بموجب انکی قبر یہاں بھی بیان کیجاتی ہے امام محمد غزالی نے ۵۰۵ھ میں احیاء العلوم میں اسکو مسجد فاطمہ سے تعبیر کیا ہے اور اس میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی ہے۔ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں بیت الحزن کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ اُسوقت یہ کس شکل کا تھا اُسپر کوئی قبہ تھا یا نہ تھا۔ ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ نے صرف اس کے نام پر اکتفا کیا ہے۔ ۸۸۶ھ میں سمہودی بھی اس کا دوسرا نام مسجد فاطمہ لکھتے ہیں۔ اُسوقت یہاں قبہ موجود تھا اور قبے کے اندر حضرت فاطمہؑ کی قبر بھی بنی ہوئی تھی۔ جذب القلوب میں ۱۰۰۱ھ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے قبر کا ذکر نہیں کیا۔ ۱۲۱۹ھ میں جب سعود اول امیر نجد کا مدینۂ منورہ پر قبضہ ہوگیا تو اُسوقت بقیع کے دوسرے قبوں کیساتھ قبۂ بیت الحزن بھی منہدم کردیا گیا۔ اسکے دس گیارہ برس بعد تخمیناً ۱۲۳۲ھ میں محمد علی پاشا والی مصر نے نجدیوں کا قبضہ حجاز سے اٹھا دینے کے بعد دوسرے قبوں کیساتھ اسے بھی تعمیر کرادیا مگر غالباً قبر کی علامت اس میں نہیں بنوائی کیونکہ ۱۲۸۵ھ میں جعفر برزنجی اپنی کتاب نزہتہ الناظرین میں بیت الحزن کے اندر علامت قبر کی عدم موجودگی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر ۱۳۱۹ھ میں ڈاکٹر نورحسین صاحب صابر اس میں مزار جنابہ فاطمہ کا وجود لکھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

مدینہ: بیت الحزن میں سیڑھیوں سے اُتر کر داخل ہوتے ہیں۔ قبلہ کیطرف مزار پُر انوار خاتون قیامت ہے۔"

اس کے چھ برس بعد مولوی صبغۃ اللہ صاحب ساکن مدراس اپنی کتاب السکینہ باخبار مدینہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"بیت الحزن میں قبر کا نشان نہیں ہے۔"

اس کے چار برس بعد قبر کا وجود پھر پایا جاتا ہے چنانچہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم اپنے روزنامچہ میں بیت الحزن کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

"اس مقام پر ایک مختصر سنگین مسجد ہے جس کے در پر ترکی کتبہ ہے۔ اندر ہشت پہل محل کے ایک مقام دو گز لمبا۔ ایک گز چوڑا اور سوا گز بلند بنا ہوا ہے جس کا آہنی دروازہ ہے اور اوپر سبز مخمل کا غلاف پڑا ہوا ہے۔ یہاں بھی دو رکعت نماز پڑھی۔ مسجد کے در پر کتبہ سلطان عبد الحمید خاں کے زمانہ کا ہے۔"

عبد الحمید خاں ثانی کا عہد ۱۲۵۵ھ سے ۱۲۷۷ھ تک ہے۔

تقریباً ۱۳۴۲ھ میں اہل نجد کا قبضہ حجاز پر دوبارہ ہو گیا اور قبہ بیت الحزن بھی دوسرے قبوں کیساتھ پھر منہدم کر دیا گیا۔ اس گنہگار نے ۱۳۴۵ھ میں اس مقام پر جہاں یہ مکان واقع تھا کوئی علامت کسی قسم کی نہ پائی سطح زمین تھی۔

(۸) مقبرۂ بنات النبیؐ

(۵)

مقبرۂ اہلبیتؑ کے شرقی و شمالی جانب آنحضرت کی صاحبزادیوں کے مدفن کے نام سے یہ مقبرہ مشہور ہے۔ اہلسنت والجماعت یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت خدیجہؑ کے بطن سے آنحضرت کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ حضرت رقیہ۔ حضرت زینب۔ حضرت ام کلثوم اور جنابِ سیدہ فاطمہ زہرا۔ چونکہ جنابِ سیدہ سے آنحضرت کو ایک خاص محبت تھی اور انپر بیحد شفقت فرماتے تھے اسوجہ سے

صرف یہی ایک دختر رسول اللہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہی زیادہ مشہور ہیں۔ انھیں کا نام خطبہ وغیرہ میں پڑھا جاتا ہے۔ شیعوں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ حضرت رقیہ و اُم کلثوم و زینب جنابہ فاطمہ زہرا کی حقیقی بہنیں نہ تھیں۔ لیکن ملا باقر مجلسی مرحوم مشہور شیعہ مورخ نے حیات القلوب میں ان کو آنحضرتؐ کی حقیقی صاحبزادیاں اور جنابہ سیدہ کی حقیقی بہنیں لکھا ہے۔ (حیات القلوب جلد دوم ذکر اولاد رسول اللہؐ) میں اس خوفناک گتھی کو سلجھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ قصہ مختصر یہ مقبرہ بجز جنابہ سیدہ کے باقی تینوں صاحبزادیوں کا مدفن خیال کیا جاتا ہے مگر سید سمہودی مدینے کے مستند مورخ اس مقبرے کو فرضی تصور کر کے ان صاحبزادیوں کی قبریں حضرت ابراہیم ابن رسول اللہؐ کے مقبرے میں خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "آئندہ میرے اہل بیت سے جو مریگا اُسکو عثمان بن مظعون کے قریب دفن کرونگا" اور چونکہ ان صاحبزادیوں کی وفات آنحضرت کے سامنے ہوئی تھی اسلیے یہ خیال نہیں ہوتا کہ ان کو حضور سرور کائنات نے عثمان بن مظعون کی قبر سے دور دفن کیا ہو۔ نیز حضرت رقیہ کے انتقال کے وقت آنحضرتؐ نے یہی فرمایا تھا کہ "تو بھی عثمان بن مظعون کیساتھ شریک ہوگئی" اس سے بھی ثابت ہے کہ حضرت رقیہ کی قبر عثمان بن مظعون کی قبر کے متصل مقبرۂ ابراہیم ابن رسول اللہ میں ہوگی۔ سمہودی یہ بھی کہتے ہیں کہ متقدمین نے اس قبے کا ذکر نہیں کیا۔ علامۂ موصوف کہتے ہیں کہ بعضوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ان صاحبزادیوں کی قبریں حضرت فاطمہ کے مزار کے قریب ہیں۔ امام محمد غزالی جنھوں نے ۴۸۰ھ میں زیارت مدینہ کی تھی اپنی کتاب احیاء العلوم میں اس مقبرے کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔ البتہ ابن جبیر کے زمانہ ۵۸۰ھ میں بقیع میں ایک چھوٹا سا گنبد قبۂ اولاد النبی کے نام سے مشہور تھا جسکا ذکر بعد میں ابن بطوطہ نے بھی کیا ہے۔ قیاس ہوتا ہے کہ خلیفہ مسترشد باللہ نے ۵۱۹ھ میں جب قبۂ اہلبیتؑ بنوایا تھا اُسی وقت یہ قبہ بھی تعمیر کرایا ہوگا۔ چودھویں صدی کے ہندوستانی سیاح سب اس قبے کا ذکر کرتے ہیں مگر قبے کے اندر کے حالات کوئی بیان نہیں کرتا۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب مولف السکینہ باخبار مدینہ کا خیال ہے کہ:-

"اس مقبرے میں دو صاحبزادیاں دفن ہیں اور حضرت رقیہ کی قبر غالباً مقبرۂ ابراہیم میں عثمان بن مظعون کی قبر کے نزدیک ہے۔"

سنہ ۱۲۱۹ھ میں جب اہل نجد نے اس مقبرہ کا قبہ منہدم کر دیا تو گیارہ برس بعد محمد علی پاشا والی مصر نے سلطان محمود خاں کے حکم سے اس پر از سر نو قبہ تعمیر کرا دیا۔ جسے سنہ ۱۳۴۲ھ میں اہل نجد نے حجاز پر دوبارہ قبضہ کر کے منہدم کر دیا۔ ذی حجہ سنہ ۱۳۴۵ھ میں اس مقبرے میں ایک مشترک چبوترہ میں نے دیکھا تھا جو زمین سے بالشت بھر اونچا تھا اور اس پر تین قبروں کی علامت کے طور پر تین پتھر سرہانے نصب تھے۔ جن صاحبزادیوں کے نام سے یہ مقبرہ موسوم ہے ان کے حالات دفن وغیرہ اس جگہ لکھنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ یہ حالات میں نے عام تاریخوں سے اخذ کیے ہیں جن سے اُن کا آنحضرت صلعم کی حقیقی صاحبزادیاں ہونا ظاہر ہے۔

(الف) حضرت رُقیہؓ رضی اللہ عنہا

ان کی ولادت بعثت سے تیرہ سال قبل ہوئی تھی۔ ان کا پہلا نکاح عتبہ بن ابی لہب سے ہوا تھا جب اُس نے دشمنی میں آ کر ان کو چھوڑ دیا تو نکاح ثانی حضرت عثمان خلیفۂ چہارم سے ہوا۔ ان کی وفات سنہ ۲ھ میں اُس روز ہوئی جبکہ جنگ بدر کی فتح کی خبر مدینے میں پہونچی تھی اس وجہ سے یقیناً آنحضرت ان کے دفن میں شریک نہ تھے تاہم آنحضرت کے اُس وقت تشریف فرما ہونے کے متعلق بھی ایک روایت ہے وہ یہ کہ ان کے دفن کے وقت آنحضرت نے یہ فرمایا تھا کہ "اے رقیہ تو بھی ہمارے سلف عثمان بن مظعون کے ساتھ شریک ہوگئی" اُسوقت حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی قبر کے پاس کھڑی رو رہی تھیں اور آنحضرت اپنے دامن سے اُن کے آنسو پونچھتے تھے۔

(ب) حضرت زینب بنت رسول اللہ

جب آنحضرت کی عمر تیس سال کی تھی اُس وقت حضرت زینب پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا عقد ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص ابن ربیع سے ہوا تھا۔ جنابہ زینب مسلمان ہوگئی تھیں مگر انکے شوہر ایمان نہیں لائے تھے بلکہ جنگ بدر میں وہ کفار کے ساتھ تھے اور گرفتار کر کے آنحضرت کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ حضرت زینب نے ان کی رہائی کیلیے اپنا ایک ہار جو حضرت خدیجہؓ نے ان کو جہیز میں دیا تھا بھجوا دیا تھا۔ آنحضرتؐ نے اسے پہچان کر واپس کر دیا اور ابو العاص کو اس شرط کے ساتھ رہا کر دیا کہ وہ زینب کو مدینے روانہ کر دیں۔ چنانچہ زینب ہجرت کر کے

مدینے آگئیں۔ سنہ ٦ھ میں ان کے شوہر بھی مسلمان ہوگئے اور مدینے میں آرہے۔ سنہ ٨ھ میں حضرت زینب نے وفات پائی۔ آنحضرت نے اپنی چادر ان کے کفن کیلیے دی اور خود قبر میں اُتر کر دفن کیا۔ ان کا مدفن بھی غالباً مقبرۂ ابراہیم ہی میں ہے۔

(ج) حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا

حضرت ام کلثوم کی ولادت چھ سات برس قبل بعثت ہوئی تھی۔ ان کا پہلا عقد ابولہب کے بیٹے عتیبہ سے ہوا تھا۔ جب اس نے بھی اپنے بھائی کی طرح ان کو طلاق دیدیا تو سنہ ٣ھ میں انکا نکاح ثانی حضرت عثمانؓ خلیفۂ سوم سے ہوا۔ شعبان سنہ ٩ھ میں ان کی وفات ہوئی اور مقبرۂ بنات الرسول میں یا بہ قیاس غالب مقبرۂ ابراہیم ابن رسول اللہ میں دفن ہوئیں۔

---

(٩) مقبرۂ ازواج النبی

مقبرۂ بنات النبی کے محاذی جانب شمال مقبرۂ عقیل کے متصل یہ مقبرہ ہے اور عام طور پر یہ مشہور ہے کہ بجز حضرت خدیجہ و حضرت میمونہ[1] کے جن کے مزارات مکۂ معظمہ میں ہیں باقی تمام امہات المومنین کی وفات مدینے میں ہوئی اور ان کا مدفن یہی مقبرہ ہے۔ مگر بعض روایتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ازواج رسول اللہ کی قبریں مقبرۂ اہلبیت کے نزدیک ہیں۔ ایک روایت ہے کہ حضرت عقیل اپنے مکان واقع بقیع میں کنواں کھدوا رہے تھے وہاں ایک پتھر نکلا جس پر لکھا تھا "قبر ام حبیبہ بنت صخر بن حرب"

ایک روایت ہے کہ یہ پتھر امام زین العابدین کے مکان میں نکلا تھا۔ اسی طرح حضرت ام سلمہ کی قبر جنابِ سیدہ فاطمہ زہراؑ کی قبر کے متصل بھی بقیع میں بیان کیجاتی ہے۔ امام محمد غزالی جنھوں نے سنہ ٤٨٨ھ میں زیارت مدینہ کی تھی اپنی کتاب احیاء العلوم میں بقیع کے مدفونین کے ضمن میں امہات المومنین کی زیارت کا ذکر کچھ نہیں کرتے واللہ عالم اس زمانہ میں یہ مقبرہ تھا یا نہ تھا اس کے سو برس بعد ابن جبیر نے سنہ ٥٨٠ھ میں یہ لکھا کہ ایک روضہ میں ازواج النبی کی قبریں ہیں

[1] بعض لوگ حضرت میمونہ کا مزار دمشق میں بیان کرتے ہیں۔

سمہودی کہتے ہیں کہ ابن نجار (مولف تاریخ بغداد) کے زمانہ میں (جس کی وفات سنہ ۶۴۳ھ میں ہوئی) اس مقبرہ میں چار قبریں تھیں مگر یہ صحت نہ تھی کہ کن کن بیبیوں کی قبریں ہیں۔ سنہ ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ نے قبروں کی تعداد نہ لکھکر صرف اس پر اکتفا کیا ہے کہ "ایک روضہ میں امہات المومنین کی قبریں ہیں"
سید نور الدین علی سمہودی نے وفاء الوفا تالیف سنہ ۸۹۳ھ میں اس مقبرے کی اپنے زمانہ کی چشم دید حالت یہ تحریر کی ہے۔

"اس مشہد کے اندر زمین بالکل سطح ہے۔ قبروں کی علامت نہیں ہے۔ البتہ ایک بلند سنگین احاطہ بنا ہوا ہے جس پر سنہ ۸۵۳ھ میں امیر بردبک المعمار نے قبہ تعمیر کرایا ہے۔"

تیرہویں صدی کے فرنگی سیاح حجاز برکھارٹ اور برٹن بھی جنھوں نے علی الترتیب سنہ ۱۲۳۲ھ اور سنہ ۱۲۶۹ھ میں مسلمانوں کا بھیس بناکر سفر حجاز کیا تھا صرف اسقدر لکھکر خاموش ہوگئے ہیں کہ اس مقبرے میں ازواج رسول اللہ مدفون ہیں۔ مولوی سید انور علی کلید باب الحج تالیف سنہ ۱۲۸۱ھ میں لکھتے ہیں کہ اس میں حضرت کی گیارہ بیبیاں دفن ہیں۔ سنہ ۱۲۸۷ھ میں اس مقبرے کا ذکر سید جعفر برزنجی نے نزھۃ الناظرین میں کیا ہے مگر نہ تو قبروں کی تعداد لکھی اور نہ یہ تعین کیا کہ کن کن کی قبریں ہیں۔ چودھویں صدی ہجری کے ہندوستانی مسلمان سیاحوں میں سے بعض نے اپنے سفرناموں میں قبۂ ازواج النبی اور اس کی قبروں کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ مثلاً خان بہادر سید وزیر حسن سب جج نے اپنے سفرنامے دلیل الغربا میں جنت البقیع کا نام تک نہیں لیا۔ اسیطرح آنریبل خواجہ غلام الثقلین جو سنہ ۱۳۲۹ھ میں مدینے گئے تھے اور سید محمد قاسم صاحب مولف رہنمائے حرمین جو سنہ ۱۳۲۸ھ میں زیارت سے مشرف ہوئے اور مولوی خواجہ حسن نظامی صاحب جنھوں نے سنہ ۱۳۳۰ھ م سنہ ۱۹۱۱ء میں زیارت کی تھی ان کے سفرنامے بھی اس قبے اور قبروں کی صراحت سے ساکت ہیں۔ ڈاکٹر نور حسین صاحب صابر نے رفیق الحجاج تالیف سنہ ۱۳۲۲ھ میں اور مولوی محی الدین حسین صاحب نے سفرنامہ حرمین تالیف سنہ ۱۳۲۳ھ میں یہ لکھا ہے کہ اس قبے میں سوائے میمونہ و خدیجہ کے باقی سب امہات دفن ہیں۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب مولف السکینہ باخبار مدینہ تالیف سنہ ۱۳۲۵ھ میں اور جنرل ابراہیم رفعت پاشا نے

مراۃ الحرمین عزی تالیف ۱۳۴۴ھ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ البتہ نادر علی صاحب وکیل میرٹھ نے مراۃ العرب میں جو ۱۳۲۱ھ کی تالیف ہے اور عبدالرحیم صاحب بنگلوری نے سفر حرمین تالیف ۱۳۳۰ھ میں یہ صراحت کی ہے کہ اس قبے میں (۱) حضرت عائشہ (۲) حضرت صفیہ (۳) حضرت سودہ (۴) حضرت ام حبیبہ (۵) حضرت حفصہ اور (۶) حضرت اُم سلمہ دفن ہیں۔ عبدالرحیم صاحب نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ امہات المومنین کے نام قبّے کے باہر ایک تختی پر لکھی ہیں قبّے کے اندر جانے کی ادباً اجازت نہیں ہے۔

مسئلہ حجاز یعنی رپورٹ خلافت کمیٹی ۱۹۲۶ء میں جس کے مرتب کرنے والے کئی مسٹر اور کئی مولانا ہیں انہدام قبور کے ذکر میں یہ تحریر ہے کہ:-

"مزار ازواج مطہرات۔ یہ تعداد میں نو تھے"

(مسئلہ خلافت مطبوعہ بمبئی صفحہ ۸۹)

اس تعداد کی مطابقت نہ تو کسی سفرنامے سے ہوتی ہے اور نہ کسی تاریخ سے۔ مدینے والوں سے بھی جب میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقبرہ مدفن تو نو۹ سے زیادہ بھی بیبیوں کا تصور کیا جا سکتا ہے مگر قبے کے انہدام سے قبل اس میں صرف چھ مزاروں کی علامت تھی۔

مذکورۂ بالا بیان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) اس مقبرے یا قبے میں کبھی چار قبروں کی علامت بنائی گئی کبھی چھ کی۔ کبھی علامتِ قبر مطلق نہ بنائی گئی۔

(۲) اس مقبرے پر غالباً نویں صدی ہجری میں پہلی مرتبہ قبہ تعمیر کیا گیا۔ امیر بردباک کا تعمیر کیا ہوا قبہ اہل نجد نے حجاز پر قبضہ کرنے کے بعد ۱۲۱۹ھ میں منہدم کر دیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۴ھ میں جب ترکوں کا تسلط حجاز پر دوبارہ ہو گیا تو سلطان محمود خاں کے حکم سے محمد علی پاشا والیٔ مصر نے از سرِ نو اس قبے کو بھی تعمیر کرا دیا۔ اس کے بعد ۱۳۴۴ھ میں اہل نجد نے مدینہ فتح کر کے اسے پھر منہدم کر دیا۔ ۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار بقیع کی زیارت سے مشرف ہوا تو اُس وقت بالشت بھر اونچا چھ قبروں کا ایک مشترک خام چبوترہ دیکھا جو مقبرۂ ازواج النبی کے نام سے موسوم ہے اسپر عموماً بلا صراحت نام "السلام علیک یا ازواج رسول اللہ" کہکر سلام

شروع کرتے ہیں۔ بعض زائر حضرت عائشہ وغیرہ چھ بیبیوں کا نام بھی لیتے ہیں اور بعض تمام ازواج رسول پر نام بنام یہاں سلام پڑھتے ہیں۔ بعض زائر بقیع میں جنابہ سیّدہ فاطمہ زہراؑ کی قبر کے پاس ام المومنین حضرت ام سلمہؓ پر بھی سلام پڑھتے ہیں

(۱۰) مقبرۂ عقیل ابن ابیطالب

مقبرۂ ازواج النبی کے قریب مقبرۂ عقیل ہے۔ اس میں تین قبریں بیان کیجاتی ہیں ایک تو عقیل ابن ابیطالب کی۔ دوسری عبداللہ بن جعفر طیار کی جو جنابہ سیّدہ زینب بنت امیر المومنین علی ابن ابیطالب کے شوہر تھے اور بروایت مشہورہ ان کے دو فرزند عون و محمد معرکۂ کربلا میں کام آرہے تھے۔ تیسری قبر آنحضرت صلعم کے چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کی ہے علامہ سمہودی کہتے ہیں کہ

(الف) ابن شیبہ و ابن زبالہ وغیرہ متقدمین نے حضرت عقیل کی قبر بقیع میں ہونا بیان نہیں کیا۔ امام محمد غزالی بھی جنھوں نے ۴۸۷ھ میں مدینۂ منورہ کی زیارت کی تھی اُن لوگوں کے ساتھ ان کا ذکر نہیں کرتے جن پر بقیع میں سلام پڑھا جاتا ہے۔

(احیاء العلوم عربی مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۲۴۸)

بقول سمہودی حضرت عقیل اور اُن کے بھتیجے عبداللہ بن جعفر طیار کی قبر کا ذکر بقیع کے مدفونین کے ضمن میں سب سے پہلے ابن نجار نے کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ان دونوں بزرگوں کے مزارات کا ذکر سب سے پہلے ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں کیا ہے۔ ابن نجار کی تاریخ بغداد غالباً اس کے بعد کی ہے ان کا سنہ وفات ۶۴۳ھ ہے۔

(ب) سمہودی کی رائے ہے کہ اس قبے میں جو حضرت عقیل کیطرف منسوب ہے صرف ابی سفیان بن حارث دفن ہیں جن کی وفات ۲۰ھ میں ہوئی تھی[1]۔ اور قبہ عقیل کی شہرت

---

[1] ابوسفیان بن حارث ایک دن قبرستان بقیع میں پھر رہے تھے۔ حضرت عقیل نے اُن سے دریافت کیا کہ

(بر صفحۂ آئندہ)

اس وجہ سے ہو گئی کہ یہاں عقیل کا مکان تھا ورنہ ان کی وفات امیر معاویہ کے زمانہ میں شام میں ہوئی تھی یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی لاش یہاں لاکر دفن کیگئی ہو۔

(وفاء الوفا جلد دوم صفحہ ۹۷)

(ج) اسیطرح حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کے یہاں دفن ہونے میں بھی شبہ ہے انکی وفات بروایت مشہور ۸۰ھ میں مدینہ ومکہ کے درمیان بمقام ابوا ہوئی۔ آنحضرت کی وفات کے وقت وہ دس برس کے تھے اس حساب سے سلہ ہجری میں پیدا ہوئے تھے حضرت عبداللہ عرب کے فیاض ترین لوگوں میں سے تھے۔ سمہودی کہتے ہیں کہ مقبرۂ عقیل جو مقبولیت دعا کیلئے مشہور ہے وہ اسی جواد کے دفن کی برکت سے ہے۔ سمہودی کے زمانہ ۸۹۳ھ میں اس مقبرے پر گنبد موجود تھا جس کا ذکر ابن بطوطہ وابن جبیر نے بھی کیا ہے۔ غالباً یہ قبہ بھی ۵۱۹ھ میں قبۂ اہلبیت کے ساتھ خلیفہ مسترشد باللہ نے تعمیر کرایا ہوگا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی جذب القلوب تالیف ۱۰۰۱ھ میں لکھتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں قبہ عقیل کے اندر دیوار پر ابوسفیان بن حارث اور عبداللہ بن جعفر طیار کا نام لکھا ہوا ہے۔"

گویا اس وقت یہ مدفن انھیں دو صاحبوں کا تصور کیا جاتا تھا۔ ۱۲۱۹ھ میں جب یہ قبہ اہل نجد نے توڑ ڈالا تو دوبارہ ۱۲۳۳ھ میں بحکم سلطان محمود خاں تعمیر کیا گیا۔ اس قبے کے اندر بھی صرف دو ہی نام ابی سفیان وحضرت عبداللہ کے لکھے تھے (نزھتہ الناظر بن جعفر برزنجی مطبوعہ مصر ص ۱۱۳) اس کے بعد ۱۳۴۳ھ میں اہل نجد نے حجاز پر دوبارہ تسلط حاصل کرکے اس قبے کو پھر منہدم کر دیا۔ مورخین وسیاح بہ صراحت نہیں کرتے کہ اس قبے کے اندر کتنی قبروں کی علامت بنی ہوئی تھی مگر اہل نجد کا طرز عمل یہ ہے کہ کسی قبر کے اندر سابق میں جتنی قبریں ظاہر کیگئی تھیں قبہ منہدم کر دینے کے بعد اتنی ہی قبروں کی علامت انھوں نے بنادی۔ مسئلہ حجاز یعنی رپورٹ

(بقیہ حاشیہ) ؟ بھائی کیا دیکھ رہے ہو؟ کہا اپنے دفن ہونے کیلئے ایک قبر کی جگہ تلاش کر رہا ہوں۔ حضرت عقیل ان کو اپنے احاطے میں لائے اور ایک جگہ مقرر کردی۔ ابوسفیان تھوڑی دیر وہاں بیٹھکر چلے گئے۔ دو تین روز بعد انھوں نے انتقال کیا حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور اسیجگہ دفن کیئے گئے (وفاء الوفا جلد دوم ۹۰)

وفد خلافت کمیٹی ۱۹۲۶ء میں غلطی سے قبۂ عقیل کو قبۂ حضرت زینب بنت حضرت امام حسنؑ تحریر کر دیا ہے
(ملاحظہ ہو مسئلہ حجاز تصویر متعلقہ ص ۸۰)

حضرت امام حسن علیہ السلام کی کسی صاحبزادی کا نام زینب نہ تھا اور نہ خاندان نبوت میں سے کسی صاحبزادی زینب کے مزار کا وجود کسی تاریخ یا سفرنامے سے جنت البقیع میں ثابت ہے۔ حضرت زینب کے نام سے کوئی قبہ یہاں کسی زمانہ میں بھی تعمیر نہیں ہوا۔ اسی طرح رپورٹ مذکور میں حضرت عقیل کو حضرت جعفر صادق کا فرزند تحریر کیا گیا ہے (مسئلہ حجاز صفحہ ۸۹) حضرت عقیل امیر المومنین علی کے بھائی ہیں ان کے والد ابی طالب تھے جعفر صادق علیہ السلام حضرت عقیل کے سکڑ پوتے ہیں۔

ذیحجہ ۱۳۵۵ھ میں اس گنہگار نے مقبرۂ عقیل میں ایک قبر دیکھی جس پر بعض مزور صرف ابی سفیان بن حارث اور حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کی زیارت پڑھاتے ہیں بعض محتاط زائر یہاں حضرت عقیل پر بھی سلام پڑھ دیتے ہیں۔ اہل مدینہ سے دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ جب یہاں قبہ موجود تھا اُس وقت بھی ایک ہی مشترکہ قبر تھی۔ موجودہ قبروں کی تشریح میں بہت جگہ کر چکا ہوں اسلیے اب یہاں اسکے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۱۱) گنج شہیداں

یزید پلید نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے فارغ ہو کر ۶۲ھ میں دس ہزار کا ایک لشکر بہ سرکردگی مسلم بن عقبہ مدینہ منورہ روانہ کیا تاکہ اہل مدینہ سے یزید کی بیعت لیجائے اور صحابہ و تابعین جو مدینہ منورہ میں سکونت رکھتے تھے اور یزید کی بیعت کے منکر تھے اُن سب کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ البتہ ایک امام زین العابدین علیہ السلام کے متعلق یزید کا یہ حکم تھا کہ اُن کو نہ چھیڑا جائے اُن کیلیے کربلا کا صدمہ ہی کافی ہے۔ جب یہ لشکر مدینہ پہونچا اہل مدینہ یزید کی بیعت پر رضامند نہ ہوئے۔ آخر مدینہ منورہ سے جانب مشرق ایک میل کی

فاصلہ پر بمقام حرۃ[1] جسے حرۂ واقم اور حرۂ زہرہ بھی کہتے ہیں لڑائی ہوئی جس میں فوج یزید کو فتح ہوئی اور پھر قتل عام شروع ہوا۔ ایک ہزار سات سو مہاجرین و انصار و تابعین۔ دس ہزار عام لوگ اور سات سو حافظ قرآن تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔ فسق و فجور اور ہر قسم کی برائی مباح کر دی گئی۔ لوٹ مار اور ہتک و ذلت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ یہاں تک کہ مدینہ بے چراغ ہو گیا۔ مورخین نے اس واقعہ کو واقعۂ کربلا سے بھی زیادہ ہولناک بیان کیا ہے اور یزید کے بدترین اخلاق ثابت کرنے کیلئے یزید کے احکام اور اسکی فوج کے جرائم کی صراحت کی ہے۔ واقعۂ حرہ کے متعلق بعض احادیث اور پیشین گوئیاں بھی کتب تواریخ میں بالتفصیل موجود ہیں۔ غرضکہ اس معرکہ میں جو لوگ شہید ہوئے تھے اُن میں سے بہت سے اصحاب جنت البقیع میں ایک ہی قبر کے اندر دفن کر دیے گئے تھے جس کی نشاندہی زمانہ حال کے سیاح مقبرۂ عقیل کی بائیں جانب کرتے ہیں۔ یہ گنج شہیداں کہلاتا تھا۔ مورخ و قدیم سیاح اس گنج شہیداں کی صراحت سے خاموش ہیں۔ نہ کسی نے اس کے مقام وقوع کا ذکر کیا اور نہ اسکی ظاہری شکل کا۔ البتہ چودھویں صدی ہجری کے سیاحوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حالیہ فتوحات نجد سے قبل یہ لکڑی کی جالیوں سے محصور تھا جسکی چھت بھی جالی کی تھی۔ بلا تشبیہ کبوتروں کے ٹھاٹھر کی شکل معلوم ہوتا تھا۔ اسکے اندر کسی قبر کی علامت نہ تھی ۱۳۴۵ھ میں اس گنہگار نے یہ جالی نہ دیکھی۔ معلوم ہوا کہ حکومت نجد نے اس کو ایک فرضی گنج شہیداں سمجھکر اس کے گرد جالی کا کٹہرا رکھنا غیر ضروری سمجھا۔

(۱۲) مقبرۂ امام مالک رح

مقبرۂ عقیل سے کوئی دس گز آگے بڑھکر بقیع کے بیچ میں امام مالک بن انس صحابی صاحب مذہب مالکی کا یہ مزار ہے۔ یہ ہجرت کر کے مدینہ میں جا رہے تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۷۹ھ میں انکی وفات ہوئی۔ ان کے قبے کی تاریخ بھی دوسرے قبوں کے ساتھ ساتھ سمجھنی چاہیے جو غالباً

[1] حرہ کے معنی سنگستان یعنی پہاڑی قطعۂ ارض کے ہیں۔

مسترشد باللہ نے پہلے پہل بنوایا تھا۔ اس کا ذکر ابن جبیر نے بھی کیا ہے مگر امام غزالی نے نہ ان کی قبر کا کچھ ذکر کیا نہ قبّے کا۔ بہر حال جو حوادث دوسرے قبوں پر گزرے ہیں وہ اس پر بھی گزرے۔ سنہ ۱۳۴۵ھ میں اس جگہ میں نے ایک قبر دیکھی جو زمین سے بالشت بھر اونچی تھی اور امام مالک کی قبر سے موسوم تھی۔

(۱۳) مقبرۂ نافع

امام مالک کی قبر کے پیچھے یہ مقبرہ واقع ہے مگر اس قبر کے متعلق اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ نافع مولائے ابن عمر راوی حدیث ہیں جن کی وفات سنہ ۱۱۷ھ میں ہوئی۔ بعض کہتے ہیں یہ امام نافع قاری مدینہ ہیں جن کا سنہ وفات سنہ ۱۶۹ھ ہے اہل مدینہ آخری روایت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک روایت سے یہ حضرت عمرؓ کے فرزند عبدالرحمٰن اوسط کا مزار ہے جنکی کنیت ابو شحمہ تھی اور مشہور ہے کہ انپر حد جاری ہوئی تھی جس کے صدمہ سے ان کا انتقال ہوا تھا۔

(۱۴) مقبرۂ ابو شحمہ بن عمرؓ بن خطاب

ابن جبیر نے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ کے قبے اور امام مالک کے قبے کے درمیان عبدالرحمٰن بن عمر بن خطاب کی قبر ہے۔ سید سمہودی کہتے ہیں کہ یہ تعریف اس قبے پر صادق آتی ہے جو نافع کی طرف منسوب ہے۔ امام غزالی وغیرہ متقدمین نے اس قبر کا کوئی ذکر نہیں کیا چھٹی صدی ہجری میں یہ قبر ظاہر[1] ہو کر دسویں گیارھویں صدی میں معدوم ہو گئی۔

[1] سنہ ۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے اس کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد چودھویں صدی کے بعض ہندوستانی سیاحوں نے اسکا پھر ذکر کیا ہے۔ اس قبر پر گنبد کا پتہ کسی زمانہ میں نہیں لگتا اگر حضرت نافع کی قبر کو ان کی قبر مان لیا جائے تو یہ بھی قبے دار کہی جاسکتی ہے۔ میں نے ۱۳۴۵ھ میں اس نام سے موسوم کوئی قبر نہیں دیکھی۔ میرے مزوروں اور اہل مدینہ نے بھی کچھ اطمینان بخش جواب نہیں دیا۔

(۱۵) مقبرۂ سیدنا حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ

مقبرۂ امام مالک و مقبرۂ نافع سے کوئی بیس گز کے فاصلہ پر بقیع کے بیچوں بیچ میں یہ مقبرہ ہے یہاں قبر صرف ایک ہی بنی ہوئی ہے مگر زائرین اپنی یاد سے یا اپنے اپنے مزوروں کی ہدایت کے مطابق کئی کئی بزرگوں پر یہاں زیارت پڑھتے ہیں۔ سابق میں چند سال قبل جب یہاں قبہ تھا اُس وقت بھی قبر ایک ہی تھی اور فاتحہ کئی شخصوں پر پڑھتے تھے۔ اس مقبرے کے گنبد کا ذکر غالباً سب سے پہلے ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"مزار سیدنا ابراہیم پر سفید قبہ ہے اور قبر پر لکڑی کے تختے لگے ہوئے ہیں جن پر خوبصورت برنجی کام ہے"

ابن جبیر کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس قبے میں کسی دوسرے صحابی کی بھی قبر تھی یا نہ تھی ان سے قبل ۵۰۵ھ میں امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں صرف ابراہیم ابن رسول اللہ کی زیارت کیلئے ہدایت کی ہے کسی اور صحابی کا جن کا مدفن یہ مقبرہ بتایا جاتا ہے اُنھوں نے ذکر نہیں کیا۔ ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ بھی قبروں کی تعداد ظاہر کرنے سے ساکت ہیں۔ سمہودی کے عہد یعنی ۸۹۲ھ میں علاوہ قبر ابراہیم کے دو قبریں اور بنی ہوئی تھیں جن کی نسبت وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ پہلے نہ تھیں اور ابن نجار وغیرہ متقدمین نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ یہ قبریں عثمان بن مظعون اور عبدالرحمن بن عوف کی بتائی جاتی ہیں۔"

معتبر روایتوں سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی قبر عثمان بن مظعون کی قبر کے

پاس ہے اور عبدالرحمٰن بن عوف بھی وہیں دفن ہوئے۔ انھیں روایتوں کے لحاظ سے ان دو قبروں کا اضافہ کر دیا گیا ہوگا۔ سمہودی کے زمانہ میں اس مقبرے پر عالیشان گنبد تھا اور قبر ابراہیم مثل حضرت امام حسنؑ و حضرت عباسؓ کی قبور کے بہت شاندار بنی ہوئی تھی۔ دوسری قبروں کی تفصیل نہ سمہودی نے بیان کی اور نہ اُن کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ۱۰۰۰ھ میں کی۔

حضرت ابراہیم کی قبر کی صراحت جو ابن جبیر کے بیان سے اوپر تحریر کی جا چکی ہے اس سے ثابت ہے کہ اس پر لکڑی اور برنجی جالیوں کا اسی قسم کا کام کیا ہوا تھا جیسا کہ قبر امام حسنؑ پر تھا۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ قبر اور اس کا قبہ بھی ۵۱۹ھ میں مسترشد باللہ نے تعمیر کرایا ہوگا۔ میں نے جو عکسی تصویریں جنت البقیع کی دیکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا قبہ مقبرۂ اہلبیت پر تھا اس کے بعد دوسرا نمبر قبۂ ابراہیم کا تھا۔ چودھویں صدی کے سیاح اس مقبرے میں علاوہ حضرت ابراہیم کے عثمان بن مظعون۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد ابن ابی وقاص کے مزارات بھی بتاتے ہیں۔ علامات قبر کی تفصیل کوئی نہیں کرتا۔ کتب تواریخ میں اس مقبرے کے مدفونین کی تعداد نو دس بتائی گئی ہے جن کی تفصیل ذیل میں کی گئی ہے۔ ۱۲۱۹ھ میں جب اہل نجد نے حجاز پر قبضہ کیا تو دوسرے قبوں کے ساتھ یہ بھی منہدم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۳ھ میں بعہد سلطان محمود خاں محمد علی پاشا والئ مصر نے حجاز پر ترکوں کا تسلط قائم کر کے دوسرے قبوں کے ساتھ اسے بھی تعمیر کرا دیا۔ سو برس بعد زمانہ نے جب پھر پلٹا کھایا اور ۱۳۴۴ھ میں جب اہل نجد نے حجاز پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو یہ قبہ پھر منہدم کر دیا گیا۔ اب ۱۳۴۵ھ میں صرف ایک قبر اُسی شکل کی جس کی صراحت میں دوسری قبروں کے ذکر میں کر چکا ہوں اس مقبرے میں موجود ہے جو قبر سیدنا حضرت ابراہیمؑ ابن رسول اللہؐ کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر عموماً حضرت ابراہیم کی زیارت کے ساتھ بلا اظہار نام یہ کہہ کر کہ "اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ مَنْ حَوْلَكَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ" یعنی آنحضرت کے اصحاب میں سے جو تمہارے قریب دفن ہیں ان کو بھی سلام پہنچے"۔ زیارت پڑھ دیتے ہیں۔ روایات مشہورہ کی بنا پر یہ مقبرہ جن اصحاب کا مدفن تصور کیا گیا ہے اب ان کے حالات دفن وغیرہ بہ ترتیب سنہ وفات درج کیے جاتے ہیں۔

(۲ الف) قبر سعد بن زرارہ۔

مقبرۂ ابراہیم ابن رسول اللہ میں سعد بن زرارہ صحابی کی قبر بھی بیان کیجاتی ہے۔ انھوں نے سنہ ۱ھ میں وفات پائی تھی اور اس اعتبار سے یہ پہلے مدفونین بقیع میں سے ہیں۔

(ب) قبر عثمان بن مظعون۔

مقبرۂ ابراہیم کے مدفونین میں حضرت عثمان بن مظعون وہ بزرگ ہیں جو بروایات مشہورہ سب سے پہلے جنت البقیع میں دفن ہوئے اور ان کے بعد جنت البقیع مسلمانوں کا عام قبرستان ہوگیا۔ اسلام لانے والوں میں ان کا چودھواں نمبر ہے۔ آنحضرت کو ان سے بڑی محبت تھی۔ بروایات مشہورہ ان کا انتقال شعبان سنہ ۲ھ یا سنہ ۳ھ میں ہوا۔ لیکن بقیع کا پہلا مدفون ان کو اسی وقت قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ ان کی وفات سنہ ۲ھ میں تسلیم کیجائے۔ عثمان بن مظعون کے انتقال کی اطلاع جب آنحضرت کو ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ:۔

"بقیع میں دفن کریں اور قبر لحد بنائیں"

چنانچہ وسط بقیع میں غرقد کے درخت کاٹ کر جگہ نکالی گئی۔ دفن کرنے سے قبل آنحضرت نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا:۔

"ہمارا سلف عثمان بن مظعون بہتر سلف ہے"

دفن کر چکنے کے بعد لحد کے پتھروں میں سے بچا ہوا ایک پتھر یا کوئی اور پتھر جو کہیں دور پڑا تھا آنحضرت نے خود اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر ان کے سرھانے نصب کر دیا۔ اور فرمایا:۔

"میں اس کو اپنے بھائی کی قبر کی نشانی ٹھہراتا ہوں۔ آئندہ میرے اہلبیتؑ سے جو مریگا اسکو میں اس کے پاس دفن کروں گا"

چنانچہ حضرت ابراہیم اور صاحبزادی رقیہ کو آنحضرت نے اسی جگہ دفن کیا۔ آنحضرت نے اس مقام کا نام جہاں عثمان بن مظعون کی قبر بنائی گئی تھی روحا رکھا تھا یعنی جائے راحت۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی قبر زاویہ دار عقیل میں ہے۔ ایک روایت ہے کہ ان کا مدفن محمد بن حنفیہ کے مکان کے نزدیک ہے۔

رسول اللہ کے مبارک ہاتھ کا لگایا ہوا پتھر کوئی چالیس برس تک حضرت عثمان بن مظعون کی قبر پر رہا۔ جب امیر معاویہ کی جانب سے سنہ ۴۱ھ میں مروان مدینہ کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے یہ کہکر

"میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ حضرت عثمان بن عفان خلیفہ چہارم کی قبر تو بلا امتیاز کے رہے اور عثمان بن مظعون کی قبر پر نشانِ امتیاز ہو"

وہ پتھر یہاں سے نکال کر حضرت عثمان کی قبر پر نصب کر دیا۔ بعض لوگوں نے مروان کو اس حرکت پر لعنت ملامت بھی کی کہ آنحضرت کا نصب کیا ہوا پتھر تجھکو نہ اکھاڑنا چاہیے تھا مگر اس نے جواب دیدیا کہ اب ہمارا حکم نہیں ٹلتا۔

(وفاء الوفا۔ جذب القلوب۔ السکینہ۔ نزھتہ الناظرین)

(ج) رقیہ بنت رسول اللہ۔

ایک روایت سے حضرت رقیہ بنت رسول اللہ بھی اسی مقبرے میں دفن ہیں ان کے حالات دفن وغیرہ مقبرۂ بنات النبی میں تحریر کیے جا چکے ہیں۔

(د) قبر خنیس بن خذافہ۔

یہ بزرگ مہاجرین اولین اور اصحاب ہجرتین سے ہیں۔ آنحضرت سے قبل حضرت حفصہ بنت عمر کے شوہر تھے۔ اُحد کی لڑائی میں ان کے زخم کاری لگا تھا جس سے جاں بر نہ ہو سکے۔ شوال ۳ھ میں رحلت کی اور عثمان بن مظعون کے جوار میں سپرد خاک کیے گئے۔

(ھ) قبر فاطمہ بنت اسد۔

بعض قوی روایتوں کے اعتبار سے حضرت فاطمہ بنت اسد یعنی حضرت علی کی والدہ ماجدہ بھی اسی مقبرے میں دفن ہیں۔ ان کے حالات دفن مقبرۂ فاطمہ بنت اسد کے زیر عنوان ملاحظہ فرمائیے

(و) قبر حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ۔

عام طور پر اگرچہ بقیع کے دوسرے مدفون حضرت ابراہیم تصور کیے گئے ہیں مگر سنین وفات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے قبل بھی بعض بزرگوار البقیع میں دفن ہو چکے تھے۔ انکی والدۂ ماجدہ حضرت ماریہ قبطیہ ہیں۔ ان کی ولادت ذیحجہ ۸ھ میں ہوئی اور باختلاف روایت ایک برس دو مہینے آٹھ دن یا ایک سال چھ مہینے کچھ دن کی عمر میں بحالت شیرخوارگی قضا کی اس حساب سے محرم ۱۰ھ یا جمادی الاول ۱۰ھ میں ان کی رحلت ہوئی۔ آنحضرت نے ان کو عثمان بن مظعون کے پہلو میں دفن کیا۔ حضرت علی نے قبر میں اُتارا۔ انکی قبر لحد بنائی گئی۔

اُس پر کچی اینٹیں چنی گئیں اُن کے شگاف میں سے ایک جگہ روشنی نظر آتی تھی اُس پر آنحضرت نے ایک مٹی کا ڈھیلا رکھدیا اور فرمایا کہ ایسی چیزوں سے مُردے کو نہ نفع پہنچتا ہے نہ نقصان مگر زندوں کی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہیں اس کے بعد قبر ابراہیم پر مٹی ڈالی۔ پانی چھڑکا۔ قبر کے اطراف پتھر کے ٹکڑے بندش کے طور پر جما دیے اور فرمایا "السلام علیکم"

حضرت ابراہیم کی قبر بقیع کے بیچ میں واقع ہے۔ اس جگہ کا نام رَوحا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ بقیع کے آخری حصہ میں جسے زورا کہتے ہیں ابراہیم مدفون ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ دار عقیل کے زاویہ میں ان کی قبر ہے۔ بعض حمام بنی قطیفہ میں بتاتے ہیں۔ یہ سب مقام تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بقیع میں واقع ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ نام مشہور تھے آج کل اہل مدینہ ان ناموں سے واقف نہیں اور پورا قبرستان ایک ہی نام جنت البقیع کے نام سے موسوم ہے۔

حضرت ابراہیم کے دفن کے بعد سے مختلف قبائل نے بقیع میں اپنے اپنے خاندان کیلئے ہڑواڑیں مقرر کردیں۔

حضرت ابراہیم کی قبر کی موجودہ کیفیت اوپر تحریر کیجا چکی ہے۔

(ز) قبر عبدالرحمن بن عوف۔

یہ جلیل القدر صحابی از روئے احادیث اہل سنت عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں یعنی اُن دس صحابہ میں جن کے جنتی ہونے کی بشارت آنحضرت نے دی ہے۔ ان کی قبر بھی مقبرۂ ابراہیم میں بیان کیجاتی ہے۔ ان کی رحلت کا وقت جب قریب پہنچا تو حضرت عائشہؓ نے ان سے کہلا بھیجا کہ اگر تمھارا دل رسول اللہ اور اپنے بھائی ابوبکرؓ و عمرؓ کے پاس دفن ہونیکو چاہتا ہے تو حجرۂ شریفہ میں تمھارے دفن کا انتظام کردیا جائے۔ انھوں نے عرض کیا۔ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کا مکان آپ پر اور تنگ کردیا جائے۔ اس کے علاوہ میرے اور عثمان بن مظعون کے درمیان یہ عہد تھا کہ ہم دونوں ایک ہی جگہ گڑینگے۔ چنانچہ ۳۱ھ یا ۳۲ھ میں یہ بھی یہاں دفن کیے گئے۔

(ح) قبر عبداللہ بن مسعود۔

ان کا مدفن بھی مقبرۂ ابراہیم خیال کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۳۲ھ میں یہ مدینے میں مرے اور بقیع میں دفن ہوئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ۳۶ھ میں انکی وفات کوفے میں ہوئی

اور وہیں دفن ہوئے۔

(ط) قبر سعد ابن ابی وقاص۔

ان کا شمار بھی عشرۂ مبشرہ میں ہے۔ یہ فاتح ایران ہیں۔ جب ان کا وقتِ رحلت قریب پہنچا تو ایک دن یہ بقیع میں گئے اور دارِ عقیل کے گوشۂ شامیہ میں عثمان بن مظعونؓ کی قبر کے پاس ایک قبر کھودنے کیلیے کہا۔ جب قبر کھد چکی تو انھوں نے چند کیلیں وہاں گاڑیں اور وصیت کی کہ میرے مرنیکے بعد یہ جگہ صحابہ کو دکھا دینا اور مجھے یہیں دفن کرنا۔ چنانچہ ایساہی ہوا اور باختلاف روایات ۵۴ھ یا ۵۵ھ ہجری میں فوت ہو کر اس مقبرے میں دفن ہوئے۔

---

(۱۵) مقبرہ حلیمہ سعدیہؓ

حضرت حلیمہ کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ حلیمہ دائی کے قصہ نے جو مولوی غلام امام شہید کی تصنیف ہے ان کی شہرت غیر معمولی کر دی ہے۔ انھوں نے آنحضرت کو دودھ پلایا تھا اور زمانۂ طفلی آنحضرت نے انکے قبیلے میں گذارا تھا۔

بقیع کے آخر میں دیوار کے متصل جانبِ شمال ان کا مزار ہے۔ متقدمین یعنی امام محمد غزالی وغیرہ کے زمانہ میں تو کیا ابن جبیر و ابن بطوطہ کے وقت تک اس مزار کا پتہ نہ تھا حالانکہ اُسوقت بقیع کے تمام مشہور مزارات پر قبے تعمیر ہو چکے تھے۔

علامہ سمہودی نے بھی ۸۹۳ھ میں بقیع کے مقابر میں اس کا شمار نہیں کیا۔ البتہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے زمانہ ۱۰۰۰ھ میں یہ مزار اور اسپر قبہ موجود تھا جسکی نسبت وہ جذب القلوب میں لکھتے ہیں:۔

> "ایک چھوٹا سا قبہ حضرت فاطمہ بنت اسد کے قبے کی راہ میں حضرت حلیمہ سعدیہ کی طرف منسوب ہے مگر اہل تواریخ نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ نہ اثباتاً نہ نفیاً۔"

زمانۂ حال کے سیاح و مورخ اس قبے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ غالباً دسویں ہجری میں

یہ تعمیر ہوا ہوگا۔ سمہودی کے وقت تک جن کی وفات ۹۱۱ھ میں ہوئی اس کا وجود نہ تھا۔ یہ قبہ بھی اہل نجد کے ہاتھ سے دو مرتبہ منہدم ہوا ہے۔ اب ۱۳۴۵ھ میں زمین سے بالشت بھر اونچی ایک قبر موجود ہے جس پر سلام و فاتحہ پڑھتے ہیں۔

(۱۶) مقبرۂ ابی سعید الخدری

حضرت حلیمہ کے مزار کے قریب جانب مشرق حضرت ابی سعید الخدری کا مزار ہے۔ یہ صحابیٔ رسول اللہ ہیں۔ ان کا نام جابر بن عبد اللہ ہے۔ اہل سنت کی کتب میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ احادیث ان کی روایت کی ہوئی موجود ہیں۔ انکے والد عبد اللہ اصحاب بدر میں سے تھے جو غزوۂ احد میں ۳ھ میں شہید ہوئے تھے۔ ابی سعید الخدری جب بہت بڈھے ہو گئے تو اپنے فرزند عبد الرحمن سے ایک دن فرمایا کہ "بیٹا میرے تمام ساتھی ایک ایک کر کے چل بسے اب میری باری ہے۔ تو میرا ہاتھ پکڑ کر بقیع میں مجھے لے چل"۔ عبد الرحمن ان کو لے گئے۔ جب بقیع میں آخری حد کے قریب پہنچے تو ایک جگہ دکھا کر جہاں کوئی دفن نہ تھا فرمایا کہ "جب میں مر جاؤں تو میرے لیے یہیں قبر کھودنا۔ کسی کو میرے انتقال کی خبر نہ کرنا۔ کوچۂ عمقہ سے کہ ادھر سے آدمیوں کا گزر کم ہے میرا جنازہ نکالنا اور جنازہ جلدی جلدی لے چلنا تاکہ اس کے ساتھ کوئی نہ ہو لے۔ مجھ پر کسی کو رونے اور نوحہ نہ کرنے دینا۔ اور میری قبر پر خیمہ بھی نہ لگانا"۔ جب ان کی رحلت ہوئی تو باوجودیکہ عبد الرحمن نے کسی کو اطلاع نہ کی تھی پھر بھی سب آدمی ان کے گھر کو گھیر کر اس غرض سے کھڑے ہو گئے کہ جنازہ باہر نکلے تو ساتھ ہو جائیں۔ اگرچہ عبد الرحمن نے کسیکو جنازہ لیجانے کے وقت سے مطلع نہ کیا تھا اور خاموشی کیساتھ بہت سویرے بقیع میں میت لیگئی تھی مگر وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ سب لوگ آپ سے آپ پہلے ہی سے جنازے کے آنے کے منتظر کھڑے ہیں۔ مورخین مدینہ جنت البقیع میں ان کا دفن ہونا بیان کرتے ہیں مگر جگہ کا تعین نہیں کرتے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے جذب القلوب تالیف ۱۰۰۱ھ میں انکے قبے کا ذکر نہیں کیا

جعفر برزنجی نزھتہ الناظرین تالیف سنہ ۱۱۵۷ھ ہجری میں اس قبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ جدید مقابر سے ہے جو سمہودی کے بعد بنائے گئے۔ سمہودی کے وقت سنہ ۸۹۳ھ میں موجود نہ تھا بعد میں عوام میں مشہور ہو گیا ہے"

(نزھتہ الناظرین مطبوعہ مصر ص ۱۱۳)

بہرحال اگر بارھویں صدی ہجری میں بھی یہ قبہ تعمیر ہوا ہو تو دو دفعہ یہ بھی منہدم ہو چکا ہے۔ میں نے سنہ ۱۳۲۵ھ میں شرعی وضع کی ایک قبر دیکھی جو ابی سعید الخدری کے نام سے موسوم ہے

(۱۷) مقبرۂ سعد بن معاذ

سعد بن معاذ الاشہلی آنحضرتؐ کے ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ غزوۂ خندق میں سنہ ۵ھ میں ان کے ایک زخم لگا تھا جس کے صدمے سے جاں بر نہ ہو سکے اور رحلت فرمائی آنحضرتؐ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی اور حضرت مقداد بن الاسود کے احاطے کے پاس سے جو گلی گئی تھی اُس کے ایک طرف البقیع کی آخری حد میں مقداد کے مکان کے پاس دفن فرمایا۔

علامہ سمہودی کہتے ہیں کہ سعد بن معاذ کی قبر کی جو کیفیت متقدمین نے بیان کی ہے اور جو مقام وقوع اسکا ظاہر کیا ہے اسکی تعریف قبر فاطمہ بنت اسدؓ پر صادق آتی ہے۔ شاید کہ یہ قبر سعد بن معاذ کی ہو گی مگر شبہ سے فاطمہ بنت اسد کی مشہور ہو گئی۔ (مزید تفصیل کے لیے حالات مقبرۂ فاطمہ بنت اسد ملاحظہ ہوں۔)

(۱۸) مقبرہ جنابہ فاطمہ بنت اسدؓ

مقبرۂ ابی سعید الخدری سے جانب مشرق کوئی بیس پچیس گز چلکر حضرت عثمان بن عفان

خلیفۂ سوم کے مزار کے قریب حضرت علی کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت اسد کا مقبرہ ہے۔ اس بزرگ خاتون کی فضیلت میں صرف اسقدر عرض کر دینا کافی ہے کہ یہ حضرت علی و حضرت عقیل و حضرت جعفر طیار کی والدۂ ماجدہ اور آنحضرت کی شفیق چچی ہیں۔ انھوں نے حضرت علی کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ سنہ ہ میں ان کا انتقال ہوا۔ جب آنحضرت کو اسکی خبر ہوئی تو ان کے مکان پر تشریف لیگئے اور ان کے سرھانے بیٹھکر فرمایا " یا امیّ بعد امیّ " (اے میری ماں کے بعد میری ماں) ان کی بہت کچھ تعریف کی اور اپنا پیراہن کفن کیلیے دیا۔ جب جنازہ باہر نکلا تو رستے بھر کبھی سرھانے کیطرف اور کبھی پائنتی کی جانب کندھا دیتے ہوئے قبرستان تک گئے۔ قبر تیار ہونے کے بعد اس کے اندر اُترکر اپنے ہاتھ سے لحد بنائی اور مٹی اپنے ہاتھ سے باہر پھینکی۔ اسکے بعد لحد کے اندر لیٹ گئے۔ کچھ آیات قرانی پڑھیں اور یہ دعا کی۔

"یا اللہ تو ہی مارتا ہے اور تو ہی جلاتا ہے۔ تو ہی وہ زندہ ہے جو کبھی نہ مریگا۔ بطفیل اپنے اس نبی کے اور بطفیل ان نبیوں کے جو مجھسے پہلے گذرے ہیں میری ماں فاطمہ بنت اسد کو بخشدے اور ان کی قبر کو وسیع فرما۔ تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھکر رحم کرنے والا ہے "

پھر قبر سے باہر آکر فرمایا " بسم اللہ وعلی اسم رسول اللہ "[لہ] اس کے بعد نو تکبیروں سے یا ستر تکبیروں سے نماز جنازہ پڑھی۔ دفن کیا اور قبر کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا:-

"اے ماں اور پرورش کرنے والی اللہ تجھکو جزائے خیر دے۔ کیا اچھی ماں اور کیا اچھی پالنے والی تھی "

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس وقت ہم نے دو باتیں ایسی دیکھیں جو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ایک یہ کہ آپ نے اپنی قمیص ان کے کفن کیلیے دی۔ دوسری یہ کہ آپ انکی قبر میں لیٹے۔ فرمایا کہ قمیص دینے سے غرض یہ تھی کہ حلہ ہائے بہشت ان کو نصیب ہوں اور قبر میں لیٹنے سے یہ مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو وسیع فرمائے۔ آنحضرت نے یہ بھی فرمایا کہ "ابو طالب کے بعد میرے ساتھ دل سے نیکی کرنیوالا سوائے فاطمہ بنت اسد کے کوئی نہ تھا"

لہ۔ اللہ کے نام سے اور رسول اللہ کے نام پر۔

امام محمد غزالی نے (۵۰۵ھ) احیاء العلوم میں فاطمہ بنت اسد کا شمار مدفونین بقیع میں نہ معلوم کس وجہ سے نہ کیا واللہ عالم اُس وقت انکی قبر موجود تھی یا نہ تھی۔ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں انکے مزار کی زیارت اسی جگہ کی تھی یعنی حضرت عثمان بن عفان کے مقبرے کے نزدیک۔ اُسوقت ان کے مزار پر یہ عبارت کندہ تھی:۔

"ما ضم قبر احد۔ کفاطمہ بنت اسد (رضی اللہ عنہا وعن بنیہا)"

جس کا مطلب ہے کہ کوئی قبر فاطمہ بنت اسد کی قبر کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اللہ اِن سے اور ان کے فرزندوں سے راضی ہو۔

۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ نے بھی اسی جگہ اس قبر کی زیارت کی تھی۔ ۱۰۰۱ھ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جذب القلوب میں اس مزار کے قبے کا ذکر کیا ہے بعض دوسری قبروں کیطرح اس قبے کی ابتدا ابھی نہیں معلوم ہوتی ممکن ہے کہ قبۂ اہلبیت کے ساتھ ساتھ اس کی تعمیر بھی اولاً ۵۱۹ھ میں ہوئی ہو۔ یہ قبہ ۱۲۱۹ھ تک رہا اور اہل نجد نے جب اسکو منہدم کردیا تو ۱۲۳۳ھ میں ترکوں کا حجاز پر تسلط ہوجانیکے بعد سلطان محمود خاں کے حکم سے محمد علی پاشا والی مصر نے دوبارہ اسے تعمیر کرایا۔ اس کے سو برس بعد اہل نجد نے حجاز فتح کرکے دوبارہ قبر و قبہ کو منہدم کیا اور اب ۱۳۴۵ھ میں یہاں زمین سے بالشت بھر اونچی ایک قبر زیارت گاہ ہے جس کے گرد بندش کے طور پر معمولی پتھر جما دیے گئے ہیں اور ایک ناتراشیدہ پتھر بلا کسی کتبہ کے قبر کے سرھانے نصب ہے۔

اگرچہ تقریباً آٹھ سو برس سے آج تک حضرت فاطمہ بنت اسد کی قبر کی زیارت اسی جگہ اور اسی قبر پر ہوتی رہی ہے مگر علامہ سمہودی اس قبر کو حضرت فاطمہ بنت اسد کی اصلی قبر نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"آنحضرت نے عثمان بن مظعون کی قبر کی ملحقہ زمین کو اپنے خاندان کی ہڑواڑہ قرار دیا تھا اور ان کے دفن کے وقت یہ فرمایا تھا کہ آیندہ میرے عزیزوں میں سے جو مریگا اُس کو یہیں دفن کرونگا۔ پس باوجود اُس محبت و خصوصیت کے جو آنحضرت کو جنابۂ فاطمہ بنت اسد سے تھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کو آنحضرت نے بقیع کے سب سے آخری حصے میں (جہاں اُس وقت نہ کوئی دفن ہوتا تھا۔

اور نہ جو داخل البقیع تھا) دفن فرمایا ہو"

یہ دلائل مذکورہ اور بعض دوسری روایات کی بنا پر علامہ موصوف انکی قبر حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ کے مقبرے میں تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ سعد بن معاذ اشہلی کی قبر کے ذکر میں علامہ موصوف نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:۔

"متقدمین نے سعد بن معاذ کی قبر کی جو تعریف کی ہے وہ اُس قبے پر صادق آتی ہے جو فاطمہ بنت اسد کے نام سے منسوب ہے۔ شاید یہ قبر سعد بن معاذ کی ہوگی مگر شبہ سے اسکو قبر فاطمہ بنت اسد کہنے لگے ورنہ حضرت فاطمہ بنت اسد کی قبر مقبرۂ اہلبیت رسالت میں ابراہیم ابن رسول اللہ کی قبر کے پاس یعنی مقام روحا واقع البقیع میں حمام بنی قطیفہ کے نزدیک ہے۔"

ایک روایت یہ ہے کہ البقیع کی فصیل کے پاس جانب مغرب جو مسجد ہے اور جسے مسجد اُبی بن کعب کہتے ہیں یہ وہاں دفن ہیں۔

اس گنہگار کی رائے میں ان کی قبر فی الحقیقت عثمان بن مظعون کی قبر کے پاس ہوگی۔ جب گردش زمانہ سے وہ قبر مٹ گئی تو دوبارہ قبر بناتے وقت یا قبہ تیار کرتے وقت مغالطہ ہوگیا اور عثمان بن مظعون کے پاس ان کی قبر تیار کرنیکے بجائے عثمان بن عفان کے پاس قبہ تعمیر ہوگیا اور پھر اس کی اصلاح کسی زمانہ میں نہ کیگئی۔

بعض اہل کشف نے بذریعۂ مکاشفہ حضرت علی کو اپنی والدہ کے پاس اسی موجودہ مقبرے میں دیکھا ہے اور اس قسم کے درویش یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت علی کا جسد مبارک بھی کوفے سے لاکر یہاں سپرد خاک کیا گیا ہے۔

ایک روایت سے حضرت امام حسن علیہ السلام کا مرقد بھی اس مقبرے میں معلوم ہوتا ہے جس کی صراحت قبر امام حسن علیہ السلام کے ذکر میں کیجاچکی ہے۔

(۱۹) مقبرہ حضرت عثمانؓ ابن عفان خلیفۂ سوم

بقیع کے کنارۂ مشرقی میں سب کے پیچھے حضرت عثمانؓ بن عفان خلیفۂ سوم کا مقبرہ ہے۔

۲۵ھ میں جب مصریوں اور اہل مدینہ کے ہاتھ سے حضرت عثمانؓ قتل کیے گئے تو لوگوں نے چاہا کہ ان کو آنحضرتؐ کے روضۂ مطہرہ میں دفن کریں مگر مخالف مانع ہوئے اور نماز جنازہ پڑھنے اور دفن کرنے سے روکا۔ بالآخرام المومنین حضرت ام حبیبہ کے سمجھانے سے یورش کم ہوگئی اور انکی لاش کو دفن کرنے کیلئے بقیع میں لیگئے وہاں بھی مخالفوں نے مزاحمت کی ناچار بقیع کے مشرق میں حدود بقیع کے باہر ان کے فرزند حضرت آبان کے ایک باغ میں جسے حش کوکب کہتے تھے دفن کردیا اور قبر پر ایک دیوار گرادی تاکہ مدفن کا نشان نہ ملے۔

بعض مورخوں نے اس مقام کو حسن کوکب لکھا ہے مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا حش کے معنی کھجور کے خودرَو درخت کے ہیں اور کوکب کے معنی بڑے کے ہیں۔ کھجور کے کسی خودرو بڑے درخت کی وجہ سے اس جگہ کا یہ نام پڑ گیا ہوگا۔

حضرت عثمانؓ کے دفن ہونے سے قبل اہل مدینہ اس جگہ دفن ہونا مکروہ سمجھتے تھے اس کے بعد سے وہ کراہت جاتی رہی۔

حضرت عثمان کی قبر کچھ عرصہ تک جس کی مدت تخمیناً سولہ سال ہوگی عام نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ ۴۱ھ میں جب امیر معاویہ کی جانب سے مروان مدینہ کا عامل مقرر ہوا تو اُس نے حش کوکب کو بھی حصار کھینچکر بقیع میں داخل کرلیا اور عثمان بن مظعون کی قبر کا پتھر جو آنحضرت نے یہ کہکر کہ

"ہم نے تجھکو پرہیزگاروں کا امام قرار دیا"

اپنے ہاتھ سے نصب فرمایا تھا اُکھاڑ کر حضرت عثمان کی قبر پر نصب کردیا اور اب یہ قبر پوری طرح نمودار ہوگئی۔ اس کے قبے کی نسبت صحت کیساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پہلے پہل کب بنا سمہودی کہتے ہیں کہ ابن نجار نے (جنکی وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی) اس قبے کا ذکر نہیں کیا۔ علامہ موصوف بعض دوسرے مورخوں کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ قبہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے

کسی امیر اسامہ بن سنان الصالحی نے یا عزیزالدین سلمہ نے سنہ ۶۰۱ھ میں تعمیر کرایا ہے ممکن ہو کہ سمہودی کے زمانہ کا قبہ سنہ ۶۰۱ھ میں بنا ہو مگر سنہ ۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے لکھا ہے کہ مزار پر ایک چھوٹا سا قبہ ہی۔ قبر کی شکل کی کوئی صراحت نہیں کرتا۔ غرضکہ اس مزار پر چھٹی صدی ہجری سے تیرھویں صدی کے اوائل تک قبہ رہا۔ ممکن ہے اس درمیان میں کچھ رد و بدل ہوا ہو۔ سنہ ۱۲۱۹ھ میں اہل نجد نے اسے منہدم کر دیا پھر سنہ ۱۲۳۴ھ میں محمد علی پاشا والئ مصر نے حسب الحکم سلطان محمود خاں تعمیر کرایا۔ جسے سنہ ۱۳۴۴ھ میں اہل نجد نے دوبارہ منہدم کر دیا اور سابقہ قبر کو مٹا دیا۔ میں نے سنہ ۱۳۴۵ھ میں دیکھا کہ ایک کچا چبوترہ زمین سے بالشت بھر اونچا بنا دیا گیا ہے اور بندش کے طور پر اس کے گرد پتھر جما دیے ہیں ایک معمولی ناتراشیدہ پتھر علامت قبر کیلئے سرھانے نصب ہے۔

(۲۰) بقیع میں سب سے پہلے کسکی زیارت کیجائے

علماء کو اس بارہ میں اختلاف ہے کہ پہلے کس کی زیارت کیجائے اور کس ترتیب سے زیارت کیجائے۔ وفاء الوفاء اور جذب القلوب وغیرہ میں یہ مباحث بصراحت درج ہیں۔ اہل بقیع کے مدارج و مراتب کے اعتبار سے کوئی کہتا ہے کہ فلاں قبے پر پہلے صلواۃ و سلام و فاتحہ پڑھی جائے۔ کوئی کہتا ہے فلاں پر۔ مختلف زمانوں میں ترتیب زیارت مختلف رہی ہے۔ اس وقت بھی مختلف مذاہب کے لوگ جدا جدا عمل کرتے ہیں اور مزور بھی عموماً اپنے مذہب یا اپنے زائرین کے مذہب کے اعتبار سے سلام و فاتحہ پڑھاتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت اکثر حضرت عثمان بن عفان کے مزار سے زیارت شروع کرکے مقبرۂ اہلبیت پر ختم کرتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کا تعلق بقول شخصے زائر کے مراتب ذوق و شوق و مدارج عشق و محبت پر منحصر ہے۔ ترتیب زیارت کے باب میں علما کا قیاس۔ فقہاء کی رائے۔ مجتہدین کا اجتہاد اور مولویوں کا فتویٰ چاہے کچھ بھی ہو مگر ایک مجذوب فقیر کی بڑ یہ ہے کہ زائر سب سے پہلے سیدۃ النساء العالمین خاتون جنت جنابہ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کے مزار مقدس پر حاضر ہو کہ یہ ہمارے مولا اور ہمارے آقا کی لخت جگر ہیں

ان کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے بعد قبۂ اہلبیت کے دوسرے مدفونین پر سلام پڑھے کہ
ان میں رسول اللہ کا ایک وہ فرزند بھی ہے جس کا پاس خاطر حضور سرور عالم رکوع و سجود میں
بھی فرماتے تھے - اس طرح فی الجملہ اس حکم کی بھی تعمیل ہو جاتی ہے کہ :-

"نماز میں محمد کے بعد آل محمد پر درود پڑھا جائے"۔

اس کے بعد اگر عقل و ہوش اجازت دے تو آگے پیچھے۔ دائیں بائیں جو قبر جہاں نظر پڑے
اس پر فاتحہ پڑھتا ہوا اس سرے سے اُس سرے تک چلا جائے اور ایک ہی مرتبہ پر قناعت
نہ کرکے صلواۃ وسلام پڑھتا ہوا مسلسل ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر گذرتا رہے۔
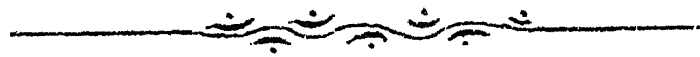
(۲۱) مزارات جنت البقیع کی عدم صحت

جو لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جنت البقیع کے مزار ابتدا سے فتوحات وہابیہ تک
جوں کے توں منیر بٹھیں لگے ہوئے چلے آرہے تھے۔ اُنپر لوح وکتبہ وتعویذ موجود تھے۔ عالیشان
قبے بنے ہوئے تھے۔ ضریحیں نصب تھیں۔ زریں غلاف پڑے رہتے تھے۔ پھولوں کی چادریں
چڑھائی جاتی تھیں۔ پنکھے لٹکائے جاتے تھے۔ عود بتیوں کی لپیٹیں آتی تھیں۔ روشنی ہوتی تھی
عرضیاں ٹانگی جاتی تھیں۔ منتیں مرادیں مانتے تھے۔ صندل وچراغاں ہوتا تھا۔ عُرس منائے
جاتے تھے۔ ان کو یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوگا کہ قبرستان جنت البقیع میں تین سو برس تک
اہلبیت وائمہ اطہار جیسی مقدس ہستیوں کی قبروں کا پتہ بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہ تھا کہ کس طرف ہیں
اور کس گوشہ میں۔ پانسو برس تک بقیع کے مشہور ترین بزرگوں کی قبریں بلا کسی نمود ونمائش
اور قبوں کے محض مٹی کے ڈھیر رہے اور ابتدائے اسلام سے تقریباً پانسو برس تک عرب کے
مسلمان اور حجاز کے بادشاہ تحفظ قبور وتعظیم قبور کے بارہ میں وہابیوں سے کچھ بہتر نہ تھے۔
یہاں کے مزاروں کے متعلق اُن مسلمانوں کی غفلت صرف اسی حد تک نہ تھی کہ انھوں نے اُنپر
عمارتیں اور قبے وغیرہ تعمیر نہ کرائے بلکہ وہ ان قبروں کے مقام ووقوع کو بھی بھول گئے۔ اُن کو

اتنا بھی یاد نہ رہا کہ اس امام کی قبر کہاں ہے اور اُس صحابی کی کدھر۔ یہاں تک کہ ایک ہی قبر میں متعدد اشخاص دفن ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے ایک ہی جگہ کئی کئی آدمیوں کی قبر سمجھی جائیگی اور ایک ایک شخص کا مدفن کئی کئی مقامات پر تصور ہونیگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجُز دو چار قبروں کے جنت البقیع کے تمام مزاروں کی صحت میں شک ہونیگا۔ یہ شک و شبہ کچھ اس زمانہ کے بال کی کھال نکالنے والے لوگوں نے نہیں کیا بلکہ آج سے ایک ہزار برس پہلے ابوالحسن علی بن حسین مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب تالیف ۳۳۶ھ میں حضرت فاطمۂ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کی قبر کی عدم صحت کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا:۔

"اگلے زمانہ میں قبروں پر عمارت نہیں بنائی جاتی تھی اور چونا گچی بھی نہیں ہوتی تھی اس وجہ سے قدیم وجدید والیان مدینہ کو اہلبیتؑ کی قبریں مٹا کر اظہار عداوت کا موقعہ ملجاتا تھا"

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ عربی مطبوعہ مصر جلد دوم ص ۹۶)

اب سے کوئی ساڑھے چار سو برس پیشتر مدینۂ منورہ کے سب سے زیادہ مستند مورخ سید نور الدین علی سمہودی نے یہاں کی قبروں کی عدم صحت کی نسبت یہ تحریر کیا:۔

"اس میں شک نہیں کہ بقیع میں صحابہ وسادات وائمہ بکثرت دفن ہیں مگر زمانۂ قدیم کے مسلمان قبروں کی تعظیم میں مبالغہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور قبریں پختہ نہیں بناتے تھے اس وجہ سے اُن کے آثار بالکل مٹ گئے اور اب بجز معدودے چند قبروں کے باقی قبروں کا تعین نہیں کیا جا سکتا"۔

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ عربی مطبوعہ مصر جلد دوم ص ۱۰۱)

سید موصوف نے اپنی دوسری کتاب خلاصۃ الوفا میں اسی بارہ میں یہ رائے ظاہر فرمائی ہے:

"اگلے لوگ چونکہ قبروں پر نہ تو عمارت بناتے تھے اور نہ کتبے نصب کرتے تھے اس لئے مدفونین بقیع کی بہت بڑی تعداد کی نہ تو قبریں معلوم ہیں اور نہ اس کا پتہ کہ کس سمت اُن کی قبریں ہیں"

(خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ عربی مطبوعہ مکہ معظمہ ص ۲۰۱)

اب سے ساڑھے تین سو برس قبل ۱۰۰۰ھ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی یہ لکھ گئے ہیں:۔

"گمان غالب یہ ہے کہ اہل بقیع کی قبریں صحیح طور پر معلوم نہیں۔ چند لوگوں کی قبریں جو معلوم ہوئی ہیں اُن کی بھی سمت معلوم ہوئی ہو گی کہ فلاں صاحب فلاں طرف دفن ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگلے زمانہ میں قبروں پر عمارتیں نہیں بنائی جاتی تھیں اور نام بھی کندہ نہیں کرتے تھے اس وجہ سے نشان مٹ گئے اور اس زمانہ میں بعض لوگوں نے بعض قبروں اور قبول کا جو تعین کر لیا ہے وہ قیاس غالب کے اعتبار سے ہے ورنہ حقیقت تو وہی ہے جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں"

(جذب القلوب الی دیار المحبوب فارسی باب ۱۲ ذکر جنت البقیع)

۱۲۸۵ھ میں جعفر برزنجی نے بھی تقریباً یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو نزھتہ الناظرین عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۲)

مولوی صبغتہ اللہ صاحب مہاجر ساکن مدراس کی بھی یہی رائے ہے۔ اُن کا آخری فقرہ یہ ہے:۔

"یہاں کے مدفونین کا تحقیق سے نشان نہیں ملتا۔ جن کا نشان ملا ہے وہ گمان غالب پر ہے"

بقیع کی کثرت قبور کی نسبت مولوی خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کا یہ فقرہ بھی قابل غور ہے:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ بقیع میں ایک قبر کے اندر کئی کئی اصحاب و اہل بیت کو دفن کیا گیا ہے۔ کیونکہ متعدد مزارات اتنی کم جگہ میں ہیں کہ ہمارے ملک میں اتنی جگہ ایک قبر کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی"

(سفرنامہ مصر و شام و عرب صفحہ ۱۷۶)

مزارات بقیع کی عدم صحت کے جہاں دوسرے وجوہ ہو سکتے ہیں ، اُن میں مذکورہ بالا بھی ایک وجہ ہے جس کے باعث بیشتر ایک مختصر سے قبے پر کئی کئی شخصوں کی زیارت پڑھی جاتی تھی۔

اور اب ایک ایک قبر یا ایک چھوٹے سے چبوترے پر کئی کئی بزرگوں کی زیارت پڑھتے ہیں۔

۱۳۴۳ھ تک جنت البقیع میں اہلبیتؑ وصحابہ و تابعین کے صرف بارہ قبے تھے جن میں صرف ایک قبۂ اہلبیتؑ بہت بڑا تھا باقی قبے ایسے چھوٹے پست اور مختصر تھے کہ ان میں ایک قبر کی جگہ بھی مشکل سے تھی۔ بہرحال ان بارہ قبوں میں صرف (۳۵) صاحبوں کی قبور یا جائے دفن کی نشاندہی کیجاتی تھی اب اُن قبوں کی جگہ معمولی قبریں یا کئی کئی قبروں کے مشترک چبوترے بنا دیے گئے ہیں مگر ان (۳۵) صاحبوں میں سے بجز تین چار کی باقی تیس تیس بزرگوں کے جائے دفن کے بارہ میں مختلف اقوال و روایات وارد ہیں اور مختلف مقامات پر ان کے مدفن بیان کیئے جاتے ہیں۔ ان مقامات کی بقدر ضرورت تفصیل تو ہر بزرگ کی قبر کے ذکر میں کیجا چکی ہے لیکن جن صاحبوں کے مدفن میں اختلاف ہے اُن کی ایک مختصر فہرست بھی توضیحاً یہاں درج کیجاتی ہے۔

۱۔ از روئے روایات حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کا مدفن مدینۂ منورہ میں دس جگہ تصور کیا گیا ہے۔ چار جگہ مسجد نبوی میں اور چھ جگہ جنت البقیع میں۔

۲۔ حضرت عباس عم رسول اللہ کی قبر تین جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ایک تو مقبرۂ اہلبیتؑ میں جس کا دوسرا نام ہی قبۂ عباس مشہور ہے۔ دوسرے گوشۂ دار عقیل میں۔ تیسرے بقیع کے بیچوں بیچ میں۔

۳۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کا مدفن کم سے کم بارہ مقام پر بیان کیا جاتا ہے ایک تو مقبرۂ اہلبیت واقع بقیع میں۔ دوسرا مقبرۂ فاطمہ بنت اسد واقع بقیع میں۔ دو جگہ کوفہ میں۔ علاقۂ بنی طے میں۔ بلخ میں۔ مرغنان واقع ترکستان میں۔ کابل میں۔ چہار جوا ور کوپا واقع ترکستان میں۔ بیت اللہ میں اور نجف اشرف میں۔

۴۔ امام حسن علیہ السلام کا مدفن دو جگہ خیال کیا جاتا ہے۔ ایک تو مقبرۂ اہلبیتؑ میں۔ دوسرے مقبرۂ فاطمہ بنت اسد میں۔

۵۔ امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک مقبرۂ اہلبیت واقع بقیع میں مدفون سمجھا جاتا ہے مگر دمشق، کربلا و قاہرہ کو بھی سر مبارک کے مدفن ہونیکا شرف حاصل ہے۔

۶۔ امام زین العابدین علیہ السلام کا مزار مقبرۂ اہلبیتؑ میں سمجھا گیا ہے۔ ایک مزار شوستر

واقع ایران میں بھی ہے۔

۷۔ امام محمد باقر علیہ السلام کی قبر مقبرۂ اہلبیت میں سمجھی جاتی ہے۔ قدیم سیاحوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ سابق میں علامت قبر بھی یہاں نہ تھی۔ آج کل بھی بعض معلم عدم صحت قبر کی وجہ سے یہاں ان کی زیارت نہیں پڑھاتے۔

۸۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی قبر عام طور سے مقبرۂ اہلبیت میں خیال کیجاتی ہے مگر اگلے زمانہ میں اسکی علامت نہ تھی۔ قدیم سیاح بھی اس کا ذکر نہیں کرتے۔ مشرقی ترکستان کے ضلع ختن کے ایک گاؤں میں بھی ان کا مزار ہے اور اس گاؤں کا نام ہی "مزار امام جعفر صادق" مشہور ہے۔

۹۔ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کا مدفن مدینہ میں تین جگہ بیان کیا گیا ہے۔

(الف) مقبرۂ ازواج النبی میں۔

(ب) دار عقیل میں۔

(ج) امام زین العابدین علیہ السلام کے مکان میں۔ اس کے علاوہ دمشق میں بھی ان کا مزار ہے۔

۱۰۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ کی قبر دو جگہ خیال کیجاتی ہے۔ ایک تو مقبرۂ ازواج النبی میں۔ دوسری جنابِ سیدہ فاطمۂ زہرا کی قبر کے متصل مقبرۂ اہلبیت میں۔

۱۱۔ چھٹی صدی ہجری میں مقبرۂ ازواج النبی واقع بقیع میں صرف چار قبریں تھیں۔ نویں صدی میں قبروں کی کوئی علامت نہ تھی۔ قبے کے اندر زمین مسطح تھی۔ تیرھویں چودھویں صدی ہجری میں ازواج رسول اللہؐ کے نام سے اس قبے میں چھ سات قبریں نمودار ہوگئیں۔

۱۲۔ حضرت عقیل ابن ابی طالب کا مزار جنت البقیع میں تصور کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں شام میں ہے۔

۱۳۔ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کی قبر دار عقیل واقع بقیع میں بیان کیجاتی ہے۔ ایک روایت کے بموجب اُن کا مدفن مکہ مدینہ کے درمیان مقام ابوا میں ہے۔

۱۴۔ نافع مولیٰ ابن عمر کے نام سے جو قبر بقیع میں مشہور ہے اُس کی نسبت شبہ ہے

کہ وہ ابن عمرؓ کے مولیٰ نافع کی ہے یا نافع قاری مدینہ کی۔

۱۵۔ سیدنا ابراہیم ابن رسول اللہ کا مدفن بقیع میں چار جگہ بیان کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ حضرت عثمان بن مظعون صحابی بقیع کے سب سے پہلے مدفون کی قبر تین مختلف مقامات پر بیان کیگئی ہے۔

۱۷۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود صحابی کا مزار بقیع میں تصور کیا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کوفے میں ہے۔

۱۸۔ چھٹی صدی ہجری میں حضرت عمر کے فرزند ابوشحمہ کی قبر بقیع میں موجود تھی۔ نویں صدی میں معدوم ہوگئی۔ چودھویں صدی میں پھر ظاہر ہوگئی۔

۱۹۔ حضرت حلیمہ سعدیہ کے مزار کا وجود ۸۹۳ھ تک بقیع میں نہ تھا اب موجود ہے۔

۲۰۔ حضرت ابی سعید الخدری صحابی کے مزار کا پتہ ایک ہزار ہجری تک بقیع میں نہ تھا بعد میں یہ قبر نمودار ہوگئی اور اب بھی موجود ہے۔

۲۱۔ حضرت فاطمہ بنت اسد والدہ ماجدہ علیؑ ابن ابی طالب کا مدفن بقیع میں تین جگہ خیال کیا جاتا ہے

(الف) گوشۂ دار عقیل میں۔

(ب) مقبرۂ ابراہیم ابن رسول اللہؐ میں۔

(ج) حمام ابن ابی قطیفہ کے متصل۔

فہرست مندرجۂ بالا سے اگرچہ مزارات جنت البقیع کی عدم صحت ظاہر ہے جس کی وجہ سے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس بزرگ سے کوئی قبہ پیشتر منسوب تھا یا اب کوئی قبر موسوم ہے وہ بزرگ دراصل اُسی میں دفن ہیں اور جس قبر پر کسی بزرگ کے نام سے فاتحہ پڑھی جاتی ہے آیا وہ اُسی کی قبر ہے یا کسی اور کی۔ مگر مسلمانوں میں جو طریقہ فاتحہ و دعا و زیارت و سلام کا رائج ہے وہ زمان و مکان سے متاثر نہیں ہوتا۔ فاتحہ خوانی کسی خاص شکل و وضع کی قبروں کیساتھ مشروط ہے نہ قبہ و ضریح سے محدود۔ اگر شرعی شکل کی کوئی قبر ہے تو اُس تک بھی ہماری دعا و فاتحہ پہونچ جاتی ہے اور غیر شرعی تک بھی رسائی کر لیتی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ قبر و مزار کا وجود بعض اوقات

زائر کے تخیلات و تصورات پر زبردست اثر ڈال سکتا ہے اور کسی بزرگ کے مرقد کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا تصفیۂ نفس و تزکیۂ باطن کا باعث ہو سکتا ہے لیکن فاتحہ و سلام کیلئے یہ لازم نہیں ہے کہ آنکھوں کے سامنے ضریح۔ مقبرہ۔ مزار یا مٹی کا ڈھیر ہو جبھی فاتحہ قبول ہو۔ قبر کی علامت تو کیا چیز ہے اگر مدفن کا بھی صحیح علم نہ ہو تب بھی ہماری فاتحہ ہمارا سلام ہماری دعا۔ ہر جگہ اور ہر صورت میں اپنا کام کر جاتی ہے۔ مدفونین البقیع کے آرام گاہ خواہ کسی وضع کے ہوں ہماری نظر میں قبرستان بقیع جنت البقیع ہے۔ ہمکو یہاں علیحدہ علیحدہ قبروں کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک گنج شہیداں ہے۔ اس کی ایک مٹھی خاک میں بیشمار صحابہ و سادات و اہلبیت کے ذرات جسم شامل ہیں۔ یہاں کی ہر قبر پر بلکہ یہاں کے ہر قطعۂ ارض پر اُن تمام بزرگواروں کی زیارت پڑھی جا سکتی ہیں جو یہاں دفن ہیں۔

(۲۲) کیفیت زیارت قبور

آنحضرت کبھی کبھی بقیع تشریف لیجاتے تھے اور وہاں کے مدفونین کیلیے ان الفاظ میں دعائے مغفرت فرماتے تھے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنُوْنَ وَ اَتَاکُمْ مَا تُوْعَدُوْنَ وَ اِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِاَھْلِ بَقِیْعِ الْغَرْقَدِ۔

اے گروہ مومنین کے مکان تجھپر سلام۔ تم سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ تم کو مل گیا۔ انشاء اللہ ہم بھی اب تم سے آکر ملنے والے ہیں۔ اے میرے اللہ تو اہل بقیع کو بخشدے"

ایک مرتبہ آنحضرتؐ چودھویں شعبان کو آدھی رات کے وقت بھی بقیع میں تشریف لیگئی تھے اور اہل بقیع کے واسطے دعا کی تھی۔ اسی اتباع میں ابتک اہل مدینہ خصوصاً شب برات کی رات کو اور عموماً جمعرات یا جمعہ کو بقیع میں فاتحہ و زیارت کیلیے جایا کرتے ہیں۔ یہاں کے

مدفونین پر سلام و زیارت پڑھنا مستحب سمجھا جاتا ہے۔
نجدی حکومت سے بیشتر گورستان بقیع کے ہر قبے کی حالت ہندوستان کی درگاہوں کی سی تھی۔ ہر قبر کے مجاور مقرر تھے یہ خدمت نسلاً بعد نسل چلتی تھی۔ زائرین کو بطیب خاطر یا بہ جبر کچھ نہ کچھ اُن کو دینا پڑتا تھا۔ ۱۸۱۵ء میں فرنگی سیاح برکھارٹ جس نے حضرت فاطمہ کی زیارت دو جگہ پڑھی تھی۔ لکھتا ہے:۔

"جب تک اس امر کا فیصلہ نہ ہو کہ حضرت فاطمہؑ کی اصلی قبر کون سی ہے؟ دو جگہ زیارت پڑھوائی جاتی ہے اور ڈبل فیس وصول کیجاتی ہے"

نجدیوں کی حکومت سے قبل شیعوں سے قبۂ اہلبیت اور حضرت حمزہ کی قبر پر بطور خاص رقم لیجاتی تھی۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین جنھوں نے ۱۳۲۹ھ میں زیارت کی تھی فرماتے ہیں:۔

"بعوض زیارت اہل عجم سے جزیہ مانگنا اور بھی قابل نفرت حرکت ہے"

بیت الحزن کی زیارت کے موقع پر خواجہ صاحب مرحوم فرماتے ہیں:۔

"اس میں داخلہ کیلئے جبراً ٹیکس لینے والا ایک عرب بیٹھا ہے۔ میں نے بھی کچھ دیا۔ کہتا ہے کہاں سے کھاؤں"

حضرت امیر حمزہ کی زیارت کے موقع پر خواجہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"روضے میں داخل ہوتے وقت ہر شیعہ سے فیس طلب کرتے ہیں۔ خاصکر ایرانیوں سے جب تک ساڑھے تین آنے فی کس نہ لے لیں داخل نہیں ہونے دیتے۔ جب میں والان حضرت امیر حمزہ میں داخل ہونے لگا تو ایک شخص نے روکا کہ تم سے پانچ قرش (پانچ آنہ) سے کم نہ لینگے۔ میں نے کہا میں جزیہ نہ دونگا۔ انھوں نے کہا باہر جاؤ۔ میں حضرت حمزہ کو سلام کرکے لوٹا اور کہا کہ والی کے پاس جاؤنگا"

اسکے بعد ان کے اور خواجہ صاحب کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا۔

(روزنامچہ سیاحت صفحہ ۴۰۷، ۴۰۸)

زیارت کی فیس کے علاوہ اگر زائرین قبۂ اہلبیتؑ پر روشنی کرنا چاہتے تھے تو اس کا بھی کچھ دینا پڑتا تھا۔ خواجہ غلام الثقلین فرماتے ہیں:۔

"آج جمعرات تھی بوجہ شب جمعہ بہت سے آدمیوں نے کچھ دے دلا کر اجازت حاصل کی کہ روضۂ بقیع میں مغرب کے قریب روشنی کریں چنانچہ کی۔ بعد مغرب روضہ بند کر دیا جاتا ہے۔ دو گھنٹے تک کھلنے کی اجازت کیلیے بہت روپیہ چاہتے تھے مگر کوئی دے نہ سکا۔ بہت سے غریب آدمی جو اندر جانے کا ٹیکس نہ دے سکے انھوں نے قبے کے باہر زیارت پڑھی۔

(روزنامچہ صفحہ ۱۰۸)

مدینہ میں چونکہ پھول بہت کم ہوتے ہیں اس لیے بیشتر زائر قبروں پر چڑھانے کیلئے ریحان کی سبز شاخیں لیجاتے تھے۔ سابق میں بعض آدمی زائروں کیطرف سے سورۂ یٰسین و سورۂ تبارک وغیرہ پڑھنے کیلیے بقیع میں بیٹھے رہا کرتے تھے اور کچھ لیکر یہ خدمت انجام دیدیتے تھے۔ اگلے زمانہ میں فقیروں کے بھی غول کے غول یہاں موجود رہتے تھے۔ بعض سیاحوں نے اسکا ذکر کیا ہی کہ یہ لوگ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ فاتحہ تک نہیں پڑھنے دیتے۔ سعدی کے اس مصرعہ کی تصدیق یہاں ہوا کرتی تھی۔ ع

کہ آستین کریماں بدست درویشاں

اور خیرات بانٹنے والوں کے کپڑے ان کے ہاتھ سے ثابت نہ بچتے تھے۔

اس زمانہ میں بقیع پورا شہر خاموشاں ہو گیا ہے۔ نہایت حضور قلب اور کامل توجہ کیساتھ فاتحہ وزیارت پڑھی جاتی ہے نہ کوئی جز یہ مانگتا ہے نہ ٹیکس۔ بقیع کے دروازے کے باہر غریب عورتیں اور بچے بیٹھے رہتے ہیں جن کو کچھ نہ کچھ دینا ہر زائر کا اخلاقی و انسانی فرض ہے۔ اہل مدینہ پر جتنا خرچ کیا جائے کم ہے۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ جن مزارات سے توسل و تشفع کی امید رکھتے ہیں اُن کے خادموں کو دو چار آنے دینا بھی ناگوار گزرتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون

اہل نجد کی حکومت میں زیارت قبور کے واقعات گزشتہ دو برس میں مختلف رہے ہیں۔ سنہ ۱۳۴۴ھ میں جو حجاج مکہ و مدینہ گئے اُن میں سے بعض کو جنھوں نے غالباً حج سے قبل زیارت کرنا چاہی تھی۔ نجدی سپاہیوں نے یہ کہکر کہ "تم لوگ فاتحہ پڑھنا نہیں جانتے۔ قبروں پر مشرکانہ رسوم انجام دیتے ہو" فاتحہ کی اجازت نہ دی۔ یہ زمانہ نجدیوں کے ابتدائی تسلط اور انتہائی جوش کا تھا

اس کے بعد بعض زائرین نے قبروں کو زمین سے ہموار پایا اور معلموں کی نشاندہی پر فاتحہ پڑھی یہ دوسرا دور تھا بعض نے بیان کیا کہ ہم نے مشاہیر کی قبروں پر دو دو تختے علامت قبر کے طور پر رکھے دیکھے۔ معلموں کی ہدایت کے موافق زیارت پڑھی کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ یہ تیسرا دور تھا میں نے ۱۳۷۵ھ میں جو حالت مزارات مقدسہ کی دیکھی اس کی مزارات البقیع کے عام حالات میں نیز دوسرے مقامات پر کر چکا ہوں اور آگے بھی مختصر عرض کروں گا۔ ان قبروں کو شرعی قبر کہئے یا گور غریباں۔ ہندوستان کے ہر قبرستان اور ہر تکیے میں ایسی بیشمار قبریں موجود ہیں۔ مدینہ منورہ میں مجھے آٹھ دن رہنا نصیب ہوا اور الحمد للہ کہ کبھی دن میں دو مرتبہ اور کبھی ایک مرتبہ جنت البقیع میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ میں جنابہ سیدہ فاطمہ زہرا اور بعض دوسرے بزرگواروں کی قبروں پر حالت مراقبہ و معانقہ میں دیر دیر تک بیٹھا رہا۔ میرے مختلف مزور بھی بعض اوقات میرے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی ان کی حسب ہدایت اور کبھی جسطرح میرے دل میں آیا میں نے سلام پڑھا۔ زیارت پڑھی۔ فاتحہ پڑھی۔ بہت مرتبہ رقت ہوئی۔ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ نہ کسی نے مجھے روکا نہ ٹوکا۔ میں نے مصریوں۔ ایرانیوں اور ہندیوں کو کبھی اپنے اپنے طور پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے دیکھا انپر بھی کوئی معترض نہ ہوا۔ غرضکہ فاتحہ و زیارت و صلوٰۃ و سلام کی عام اجازت تھی۔ ہر مذہب و ملت کے مسلمان اپنے اپنے طریق پر کسی مزور کے ذریعہ سے یا کتاب میں دیکھکر یا زبانی جسطرح چاہتے تھے فاتحہ وغیرہ پڑھ سکتے تھے[۱] یہاں میں نے کسی کو قبر پر سجدہ کرتے۔ بوسہ دیتے۔ طواف کرتے یا قبر کے پاؤں پڑتے نہیں دیکھا واللہ عالم نجدیوں کے خوف سے ایسا نہ کیا یا میرے زمانہ کے زائرین ایسا عمل پسند نہیں کرتے تھے۔ زائرین کی حفاظت یا نگرانی کیلئے صرف ایک سپاہی جنت البقیع کے دروازے پر کھڑا رہتا تھا وہ زائرین کی نقل و حرکت کا کچھ نگران بھی نہ تھا نہ اس کی نگاہ ہمارے ساتھ ساتھ بقیع کے ہر گوشے اور ہر کونے میں پہنچ سکتی تھی۔

میرے ایک حیدر آبادی دوست۔ جو میری مدینہ منورہ جانے کے کچھ دن بعد قافلہ کیساتھ

---

[۱] ۱۳۷۶ھ میں جو صاحب زیارت کو گئے تھے ان میں سے بعض نے کہا کہ ان کو کتاب میں دیکھکر زیارت نہ پڑھنے دی البتہ زبانی یا کسی معلم کے ساتھ زیارت پڑھنے کی اجازت تھی۔

گئے تھے مجھسے بیان کیا کہ اُنھوں نے حضرت فاطمہؑ کی قبر کے قدموں پر گرنے کیلیے ایک نجدی سپاہی سے اجازت مانگی تھی مگر اُس نے منع کیا اور اُس کے پیٹھ موڑتے ہی یہ اس بات پر آمادہ ہو کر کہ اگر وہ دیکھ بھی لیگا تو دو چار چھڑیاں کھالوں گا۔ جنابہ سیدہ کے مزار کے قدموں پر گر پڑے۔

(۲۳) منہدم شدہ قبوں کی ترمیم کے متعلق نجدیوں کے خیالات

قبوں کی دوبارہ تعمیر کے بارہ میں جو میری گفتگو حجاز کے بعض سر برآوردہ اہل نجد سے ہوئی اگر اُس کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ مضمون نامکمل رہجائیگا۔ اسلیے لبطور سوال وجواب اس گفتگو کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں۔ سوال میری طرف سے ہے اور جواب اہل نجد کی جانب سے۔

س "قبوں کے شرعی جواز و عدم جواز کے متعلق میں ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ اس بارہ میں علمانے بہت کچھ کہہ لیا ہے اور آیندہ بھی کہینگے۔ میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ جس قبے کی سب سے زائد تعظیم کیجا سکتی ہے وہ گنبد خضرا ہے۔ جب اس کو قائم رکھا گیا ہے تو ایسی صورت میں اگر دوسرے قبوں کو بھی جو عظمت و منزلت میں اس کے بعد ہیں برقرار رکھا جاتا تو کیا مضائقہ تھا۔ جب زائرین کوئی حرکت قبۂ خضرا پر ایسی نہیں کرتے جو آپ کے نقطۂ نظر میں خلاف شرع ہو تو دوسرے گنبدوں پر بھی کوئی بیجا حرکت کرنے کیلیے ان کی ہمت نہ پڑتی"

ج "گنبد خضرا سے دوسرے قبوں کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ یہ گنبد آنحضرتؐ کے بیت الشرف کا گنبد ہے وہ قبروں کے گنبد تھے"

س ۔ مکان اور مقبرے کا ایسا باریک فرق عام مسلمان نہیں سمجھ سکتے۔ جس جگہ کوئی قبر موجود ہو وہ مقبرہ ہے"

ج "مکان اور قبر میں فرق ہے اور بڑا فرق ہے"

س "ہندوستان میں مشہور ہے کہ روضۂ سرور کائناتؐ پر بھی آیندہ دست درازی کیجائیگی"

جیساکہ اب سے سو برس قبل امیر سعود ابن عبدالعزیز نے جرأت کی تھی مگر بعض معجزوں نے اُسکو اس ارادہ سے باز رکھا"

ج "محض غلط ہے۔ ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے۔ نہ ایسی جرأت کیجائیگی اور نہ امیر سعود نے ایسا ارادہ کیا تھا"

س "بعض مسلمان مورخوں نے اور نیز ایک فرنگی سیاح مسمی برکھارٹ نے جو ۱۸۱۴ء میں حجاز آیا تھا سعود کے اس ارادہ کا ذکر کیا ہے"

ج "عام مسلمان اور عیسائی دونوں ہمارے دشمن ہیں"

س "اگر مسلمانوں کی تالیف قلوب کے خیال سے ان قبوں کو دوبارہ تعمیر کر دیا جائے تو غالبًا یہ عمل نامناسب نہ ہوگا۔ ایک مشہور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ:۔

آنحضرت نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ اگر تیری قوم جدید الاسلام نہ ہوتی تو میں اس کعبہ کو جو کفار قریش کا بنایا ہوا ہے ڈھا کر بنیاد ابراہیمی پر از سر نو تیار کرتا مگر یہ لوگ میرے اس عمل سے بھڑک جائینگے"

جب آنحضرتؐ نے کعبۂ مکرمہ جیسی محترم عمارت کو باوجود کراہت کے محض جدید الاسلام مسلمانوں کی تالیف قلوب کے خیال سے قائم رکھا تو آپ بھی اگر قدیم الاسلام مسلمانوں کی تالیف قلوب کیلیے ان قبوں کو برقرار رکھتے تو کیا مضائقہ تھا۔

ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ جزیرہ نمائے سینا کے عیسائیوں نے آنحضرت سے اتحادی معاہدہ کیا تھا اتفاق سے ان عیسائیوں کا گرجا منہدم ہوگیا۔ اُنھوں نے آنحضرت سے اسکی تعمیر کیلیے چندہ طلب کیا۔ آنحضرت نے بیت المال سے مدد فرمائی۔ جب ایک کلیسہ کی تعمیر مسلمانوں کے بیت المال سے کردیگئی تو ان قبوں کی تعمیر بدرجۂ اولیٰ ہونی چاہیئے"

ج "آنحضرت مقتدر تھے۔ ہم غیر مقتدر ہیں"

س "آپ اُس مقتدر نبی کی تابع و مقلد ہیں۔ آپ کیواسطے آنحضرت کا عمل کافی دلیل ہدایت ہے"

ج "آپ تالیف قلوب پر بہت زور دے رہے ہیں تو اب ہم یہ کہینگے کہ ہم نے بھی تالیف قلوب تو کی مگر اُن مسلمانوں کی جو راہِ اسلام میں حکومت نجد کے ہاتھ پر مرنے جینے کی بیعت

کر چکے ہیں۔ جو ہر آڑے وقت میں حکومت کا ساتھ دینگے اور جو حفاظت اسلام و حفاظت حرمین کیلیے اپنی جانیں لڑا دینگے۔ ہم پر ایسے مسلمانوں کی تالیف قلوب واجب نہیں ہی جنھوں نے تُرکوں کو حرمین سے نکلوا دیا جنھوں نے رنگروٹ بھرتی کر کرکے ترکوں کے مقابلہ کیلیے بھیجے جن کا روپیہ گولیاں بن بن کر ترکوں کے کلیجے میں داخل ہوا۔

جب یہ پکے" مسلمان پیراہن خلافت کو پارہ پارہ کر چکے تو اُس وقت کفنیاں گلے میں ڈال کر ہائے خلیفہ! ہائے خلیفہ!! کہتے دنیا بھر میں پھرے۔ ان کی یہ گریہ وزاری فرعون کی سی توبہ تھی اور ان کا یہ بے وقت کا ماتم یہودا اسقریوطی کا رونا تھا جس نے پہلے تو تیس روپیے میں حضرت عیسیٰ کو پکڑوا کر صلیب پر چڑھوا دیا اور پھر شرمندگی کے مارے درخت سے اُلٹا لٹک کر جان دیدی۔ حضرت عیسیٰ کے اس حواری کے گناہ کا کفارہ تو بظاہر ہو گیا مگر ان مسلمانوں کی پیشانیوں پر دین فروشی کا جو داغ لگا ہے اُسکو صرف دوزخ کی آگ ہی مٹا سکیگی"۔

س :۔ میں آپ کی اس گرم و تلخ و تیز گفتگو کو حمیت اسلامی و غیرت دینی پر محمول کر کے اس وقت اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا کہ مبادا صحبت بدمزا ہو جائے۔ تاہم یہ عرض کرونگا کہ اہل نجد کے سوا آپ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو بھی اپنا بھائی تصور کیجئے۔ اگر موقع ہوگا تو وہ بھی حفاظت حرمین کیلیے اپنی جانیں قربان کر دینگے اور آپ کے دوش بدوش اعدائے دین کا مقابلہ کرینگے"۔

ج :۔ (قہقہہ) یہ برادران یوسف ترکوں کیساتھ اسلام کی حفاظت خوب کر چکے ہیں۔ انھوں نے جب اپنے حقیقی بھائیوں کیساتھ یہ کچھ کیا تو ہم تو ان کے سوتیلے بھائی ہیں ہمارے ساتھ جو کچھ کریں تھوڑا ہے۔ خدا ان سے کام ہی نہ ڈالے ؎

توبہ خویشتن چہ کر دی کہ بہ ما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

یہ مسلمان مرد میدان نہیں ہیں البتہ جلسوں میں باتیں بنانا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالکر ٹھہر کنا ان کو خوب آتا ہے۔ بظاہر قوم کا رونا یہ روتے ہیں مگر اصل میں وہ انھیں کا رونا ہوتا ہی۔

اور انھیں ترکیبوں سے یہ اپنا دوزخ بھرتے ہیں۔ ؎

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کیساتھ
فکر لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

یہ اپنے تئیں خادم حرمین اور خدام کعبہ کہتے ہیں مگر ع

ہیچ کافر نہ کند آنچہ مسلماں کردند

انھوں نے حرمین کی خدمت کیا کی؟ یہی نا کہ ترکوں کو حرمین سے نکلوا دیا۔ یہ اپنے ہاتھ سے کعبہ میں روشنی اور روضۂ رسول اللہ کی جاروب کشی تو کیا کرتے انھوں نے تو حرمین کو بے چراغ کر دینے کی کوشش کی۔ وابستگان حضرت بیت اللہ اور خادمان مرقد رسول اللہ کو بھوکا مار ڈالنے کے فتوے دیے۔ حج کو حرام ٹھہرا دیا تاکہ مسلمان ادھر کا رخ نہ کریں۔ خدا و رسول کے پڑوسیوں کے تمام کاروبار بند ہو جائیں۔ فاقہ کشی کی تاب نہ لا کر وہ یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ مکہ ویران و مدینہ برباد ہو جائے۔ اور حجاز مقدس دام و دد کا مسکن بن جائے۔ یہی خدمت کعبہ ہے؟ یہی لوگ خدام کعبہ ہیں؟ ؎

اگر حقیقت اسلام در جہاں این است
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی
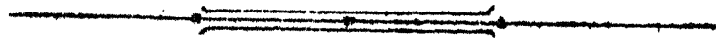
فصل سوم

مدینے کے بعض دوسرے قبرستان

(۱) مقبرۂ عمات رسول

مدینۂ منورہ کی فصیل سے باہر باب جمعہ سے نکلتے ہی احاطۂ بقیع کی بائیں جانب مقبرۂ عمات نبیؐ واقع ہے۔ بقیع سے متصل ہونے کی وجہ سے بعض سیاحوں نے اسکا ذکر مقابر بقیع میں کیا ہے۔ اس زمانہ میں یہ مشہور ہے کہ اُس میں آنحضرت صلعم کی دو پھپھیاں صفیہ بنت عبد المطلب اور عاتکہ بنت عبد المطلب دفن ہیں۔ مگر ابن جبیر و ابن بطوطہ۔ سید سمہودی اور شیخ عبد الحق اس مقبرے میں صرف حضرت صفیہ کا مزار بیان کرتے ہیں۔ حضرت عاتکہ کے حالات کا پتہ نہ لگا۔ حضرت صفیہ کا مختصر تذکرہ تحریر کیا جاتا ہے۔

صفیہ حضرت امیر حمزہ[1] کی حقیقی بہن تھیں۔ ان کے شوہر ام المومنین خدیجہ رض کے بھائی عوام بن خویلد تھے جن سے حضرت زبیر[2] پیدا ہوئے۔ از روئے احادیث اہل سنت زبیر کا

ف[1] ۔ امیر حمزہ آنحضرت کے حقیقی چچا نہ تھے۔ آنحضرت کے حقیقی چچا صرف حضرت ابیطالب تھے۔

ف[2] ۔ زبیر حضرت علی کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ چونکہ جنگ جمل میں جو جمادی الثانی ۳۶ھ میں ہوئی تھی حضرت علی کے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

شمار اُن دس صحابہؓ میں ہے جن کے قطعی جنتی ہونے کی نسبت آنحضرتؐ نے بشارت دی ہے
جنگ احدؓ میں حضرت حمزہ کی شہادت کی خبر سنکر صفیہ مدینہ سے میدان جنگ میں
تشریف لیگئی تھیں۔ آنحضرت نے اس خیال سے کہ حمزہ کی لاش کی دردناک حالتؓ صفیہ سے
دیکھی نہ جائیگی اُن کے فرزند حضرت زبیر سے فرمایا کہ اپنی ماں کو حمزہ کی لاش پر نہ جانے دو۔
صفیہ نے عرض کیا مجھکو سب معلوم ہو چکا ہے خدا کی راہ میں جو کچھ ہوا میں اُس پر صبر کرتی ہوں
جنگ خندق میں جو شوال ۵ھ میں واقع ہوئی۔ صفیہ قلعہ رقاع میں جو انصار مدینہ کی
ایک گڑھی تھی مسلمان عورتوں کیساتھ تھیں۔ دروازے پر حسان بن ثابتؓ شاعر پہرہ دے
رہے تھے۔ یہاں سے یہودیوں کے قبیلہ بنی نضیر کا علاقہ قریب تھا۔ ایک یہودی مسلمانوں کے
قلعہ کی تھانگ لینے کیلئے ادہر آیا۔ حضرت صفیہ نے حسان بن ثابت سے کہا کیا دیکھتے ہو
اس کو ٹھکانے لگا دو۔ علالت و ضعف کی وجہ سے حسان کی ہمت نہ پڑی۔ آخر صفیہ نے
جلدی میں کوئی ہتھیار نہ ملا تو خیمہ کی ایک چوب سے اُس یہودی کا خاتمہ کر دیا اور اس کا سر
کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینکدیا جس سے یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ اس قلعہ میں مسلمانوں کی کچھ
فوج موجود ہے۔ حضرت صفیہ کی وفات تہتر سال کی عمر میں ۲۰ھ میں ہوئی۔
آٹھویں صدی ہجری تک حضرت صفیہ کے مزار پر قبہ نہ تھا۔ نویں صدی میں سید سمہودی

بقیہ حاشیہ۔ خلاف ہو کر حضرت عائشہ کیطرف سے لڑے تھے اسلیے شیعہ انکے معتقد نہیں ہیں۔ جنگ جمل سے کنارہ کشی کے
بعد ۳۶ھ میں چونسٹھ برس کی عمر میں عمرو بن جرموز کے ہاتھ سے مارے گئے۔

۵۱۔ ان دس صحابیوں کو عشرۂ مبشرہ کہتے ہیں۔ کسی شاعر نے ان کے نام ایک قطعہ میں اسطرح نظم کیے ہیں۔

ده یار بهشتی اندمی دان ... بوبکر و عمر علی و عثمان

سعد است و سعید و بوعبیده ... طلحہ و زبیر و عبدرحمان

۵۲۔ جنگ احد کے تفصیلی واقعات آگے ایک علیحدہ عنوان کے تحت میں بیان کیے گئے ہیں۔

۵۳۔ مشرکین نے حضرت حمزہ کی لاش کی حالت ناک کان کاٹ کر اور پیٹ چاک کر کے بہت خراب کر دی تھی تفصیل کے لیے
مقبرہ شہدائے احد کے حالات ملاحظہ ہوں۔

۵۴۔ حضرت حسان بن ثابت سب سے پہلے نعت گو شاعر و صحابی ہیں۔ ایکسو بیس برس کی عمر پائی۔ ساٹھ سال جاہلیت میں اور
(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ایک چھوٹے سے قبے کی نشاندہی کرتے ہیں مگر یہ نہیں لکھا کہ وہ قبہ کس نے بنوایا تھا۔ اس قبے کو بھی غالباً وہی حادثات پیش آئے جو جنت البقیع کے دوسرے قبوں پر گذرے جنکے لحاظ سے یہ اولاً ۱۲۱۹ھ میں اہل نجد کے ہاتھ سے منہدم ہوا پھر ۱۲۳۳ھ میں محمد علی پاشا نے بنوایا۔ پھر ۱۳۴۴ھ میں دوبارہ اہل نجد نے مسمار کیا۔ ۱۳۴۵ھ میں اس فقیر نے اسے منہدم ہی پایا اور دو قبروں کا ایک مشترک چبوترہ دیکھا جسے قبر صفیہ و عاتکہ سے منسوب کرتے ہیں۔ قبروں کی شکل کی یہاں تشریح کرنیکی ضرورت نہیں ہے کئی مرتبہ اس سے قبل کہا جا چکی ہے۔

(۲) مقبرہ حضرت اسماعیل بن جعفر صادق علیہ السلام

حضرت اسماعیل فرقۂ اسماعیلیہ کے ساتویں امام ہیں۔ ان کی کنیت ابو محمد ہے۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ کی تمام اولاد میں یہ سب سے بڑے تھے اور جناب صادقؑ کو ان سے محبت بھی بہت تھی اسوجہ سے عام طور پر لوگوں کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ امامت انھیں کو ملیگی۔ ۱۳۳ھ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی میں ہی حضرت اسماعیل کی وفات ہو گئی مگر دور دراز مقامات کے شیعوں کو اس کی اطلاع نہ ہوئی تو وہ یہی سمجھتے رہے کہ اسماعیل ابھی زندہ ہیں۔ یہاں تک کہ پندرہ برس بعد ۱۴۸ھ میں جب امام جعفر صادق علیہ السلام نے رحلت فرمائی تو اُس وقت ان لوگوں نے قیاس کر لیا کہ اب حضرت اسماعیل اُن کے جانشین و امام ہیں۔ مدینے کے گرد و نواح میں جو لوگ رہتے تھے وہ یہ عقیدہ رکھنے لگے کہ حضرت اسماعیل چونکہ امامت کیلیے نامزد ہو چکے تھے اسلیے وہ امام برحق ہیں اور ان کے بعد امامت ان کی اولاد میں منتقل ہو گئی ہے[۱]۔ عام طور پر فرقۂ اسماعیلیہ کے

بقیہ حاشیہ۔ ساٹھ سال اسلام میں گذارے۔ باختلاف روایت ۵۰ھ یا ۵۸ھ میں وفات ہوئی۔

[۱] - ان لوگوں کے اماموں کی تعداد بائیس ہے جن میں مصر کے دس فاطمی خلیفہ بھی شامل ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد ان کے امام حضرت اسمٰعیل پھر محمد پھر محمد حبیب پھر عبید اللہ مہدی اور اُن کی اولاد ہے۔ بعض لوگ اولاد اسماعیل بن جعفر صادق میں اور بھی کئی صاحبوں کو امام تصور کرتے ہیں۔

پیرو امام جعفر صادق کے بعد اُن کے فرزند امام موسیٰ کاظم علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتے مگر بعض اسماعیلیہ ایسے بھی ہیں جو حضرت اسماعیل کے بعد امام موسیٰ کاظم اور اُن کے بعد سلسلہ اثنا عشری کے باقی تمام اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں[۱]۔ غرضکہ حضرت اسماعیل کو امام ماننے والوں کا فرقہ جو ابتدا میں شیعہ اسماعیلیہ سے موسوم تھا۔ جزدی جزدی اختلافات کی وجہ سے اُس کی بہت سی شاخیں ہو گئیں۔ (توضیحاً ملاحظہ ہو کتاب مذاہب اسلام مؤلفہ مولوی نجم الغنی صاحب)

حضرت اسماعیل کی وفات بمقام عریض ہوئی تھی جو مدینہ کی نواح میں ایک سر سبز وادی وچراگاہ ہے اُن کی لاش مدینہ لاکر بقیع کے متصل دفن کیگئی۔ اِن کا مزار مدینہ میں جانب مشرق ہی بقیع میں داخل ہونیسے قبل زائر کے داہنی طرف پڑتا ہے۔ امام غزالی و ابن جبیر و ابن بطوطہ وغیرہ سیاحوں نے ان کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ سمہودی کہتے ہیں کہ اس مزار پر ۵۴۲ھ میں امیر سیف الدین ابن ابی الہیجا[۲] نے قبہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کی نشاندہی گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بھی کی ہے۔ غالباً یہ قبہ تیرہویں صدی ہجری کے ربع تک موجود تھا اور دوسرے قبوں کیساتھ ۱۲۱۹ھ میں اہل نجد نے پہلی مرتبہ اسے منہدم کیا۔ ۱۲۳۲ھ میں محمد علی پاشا نے حجاز پر تسلط حاصل کر کے اسے پھر تعمیر کرایا۔ اسکے بعد ۱۳۴۴ھ میں اہل نجد نے پھر منہدم کر دیا۔ ۱۳۴۵ھ میں یہ گنہگار حضرت اسماعیل کی قبر کی زیارت سے مشرف ہوا۔ یہ بالشت بھر اونچی قبر تھی جسکے اطراف پتھر جمے ہوئے تھے۔ فرقۂ اسماعیلیہ کے زائر اس درگاہ پر خاص عقیدت ظاہر کرتے ہیں۔

---

[۱] ان کے اماموں کی تعداد وغیرہ ہے عموماً بوہروں کا یہی عقیدہ ہے۔

[۲] یہ شخص فاطمی خلفائے مصر کا جو اسماعیلیہ طریقہ رکھتے تھے وزیر تھا۔ نہایت فیاض و مخیّر تھا۔ مدینے میں بعض مساجد وغیرہ اس کی یادگار تھیں۔ اس کی وفات بھی مدینے میں ہوئی تھی اور بقیع میں اس کی قبر پر گنبد بنا ہوا تھا جو اہل نجد کے پہلے قبضۂ حجاز کے وقت ۱۲۱۹ھ میں توڑ ڈالا گیا اس کے بعد پھر کبھی تعمیر نہ ہوا۔

(۳۳) مقبرہ حضرت عبداللہ والد ماجد آنحضرت صلعم

تاریخ عرب میں حضرت عبداللہ بھی ذبیح راہِ خدا سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے والد حضرت عبدالمطلب نے یہ منّت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اُن کو دس فرزند[1] عنایت کریگا تو ایک لڑکے کو وہ راہِ خدا میں ذبح کرینگے۔ اس قربانی کا قرعہ حضرت عبداللہ کے نام پر نکلا مگر حضرت عبدالمطلب کو ان سے بیحد محبت تھی اور ان کا ذبح کرنا گوارا نہ تھا یوں کہیئے کہ ان کی پیشانی سے نور رسالت جلوہ گر دکھائی دیتا تھا اور دنیا کی کایا پلٹ دینے والی ایک زبردست مقدس ہستی اُنسے وجود میں آنے والی تھی اس وجہ سے عبدالمطلب ان کو ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے اسلیے دوبارہ قرعہ ڈالا پھر انھیں کے نام پر نکلا پھر اُلٹ پلٹ کر اور کئی مرتبہ قرعہ اندازی کیگئی مگر کسی اور لڑکے کے نام پر نہ نکلکر ہر دفعہ انھیں کے نام پر آیا۔ آخر اُس زمانہ کے دانشمندوں کے مشورہ سے حضرت عبدالمطلب نے ان کا فدیہ ایک سو اونٹ ذبح کیے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے انا ابن الذبیحین یعنی میں دو ذبیحوں (اسماعیل و عبداللہ) کا فرزند ہوں۔

حضرت عبداللہ تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ قریش کے قافلے کیساتھ حضرت عبدالمطلب نے اُن کو کھجوریں لانے کیلئے مدینے بھیجا۔ ان کی طبیعت پیشتر سے ناساز تھی اور باختلاف روایت اُنھوں نے مدینے میں جہاں اُن کا ذاتی مکان تھا یا مکہ و مدینہ کے رستے میں بمقام ابوا رحلت فرمائی۔ وقتِ وفات حضرت عبداللہ کی عمر پچیس یا اٹھائیس سال تھی اور حسب روایت مشہورہ ہنوز سرور کائنات عالم ظہور میں نہیں آئے[2] تھے۔

---

[1] حضرت عبدالمطلب کے دس فرزندوں کے نام یہ ہیں۔ حارث۔ زبیر۔ ابوطالب۔ حمزہ۔ غیداق۔ ضرار مقوم۔ ابولہب۔ عباس۔ عبداللہ۔ تمام فرزندوں میں حارث بڑے تھے اسیوجہ سے عبدالمطلب کی کنیت ابوحارث تھی۔ حارث چاہ زمزم کھودنے میں اپنے والد کے شریک تھے۔ عبداللہ و ابوطالب حقیقی بھائی تھے۔

[2] ایک روایت ہے کہ اس وقت آنحضرت کا سن دو مہینے کا تھا۔ ایک روایت ہے کہ حضرت عبداللہ کی وفات کے وقت آنحضرت اٹھائیس دن کے تھے۔

حضرت عبداللہ کے مدفن کی نسبت زیادہ قوی روایت یہ ہے کہ وہ ابوا میں دفن کیئے گئے۔ ابوا کو بعض مورخ مدینے سے تیئیس میل بتاتے ہیں۔ سمہودی اُحد کے قرب و جوار میں اسکی نشاندہی کرتے ہیں۔ اُحد مدینے سے تین میل ہے۔ ابن ایثر مؤلف تاریخ کامل بھی اس کو اُحد کے قریب ہی بتاتا ہے۔ صاحب مراۃ الحرمین کہتے ہیں کہ بحراحمر کے مشہور بندرگاہ رابغ سے (جو جدّے سے ایک سو میل ہے) جانب مدینہ تیرہ میل کے فاصلہ پر ابوا واقع ہے۔ سید سمہودی کہتے ہیں کہ حضرت آمنہ ہر سال مکہ سے اپنے شوہر عبداللہ کی قبر کی زیارت کیلئے ابوا تشریف لیجایا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ جب آنحضرت چھ برس کے تھے حضرت آمنہ ابوا تشریف لے گئیں اور وہیں وفات پائی۔ مورخین حضرت عبداللہ و حضرت آمنہ کی قبریں موضع ابوا میں بتاتے ہیں مگر ابوا کی چشم دید حالت۔ علامت قبر و قبہ و مزار کی صراحت کوئی نہیں کرتا کہ کس حالت میں ہے۔ اگرچہ قدیم سیاح و مورخین نے مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ کے مزار کا ذکر مطلق نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سید جعفر برزنجی مدنی نے بھی نزھتہ الناظرین میں جو ۱۲۹۶ھ کی تالیف ہے۔ اس مزار کا وجود ظاہر نہیں کیا مگر چودھویں صدی ہجری کے سیاح اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً مولوی صبغتہ اللہ صاحب اپنی کتاب السکینہ میں فرماتے ہیں:-

> "زقاق سیدنا عبداللہ کے نام سے مدینے میں ایک محلہ ہے اس میں ایک قبے کے اندر حضرت عبداللہ کی قبر ہے۔ یہ خاص مکان اُن کا تھا اسمیں دفن ہوئے سبز غلاف قبر پر پڑا ہے جس میں سفید ریشم سے ان کا نام بُنا ہوا ہے۔ یہ قبہ ۱۲۴۵ھ میں سلطان محمود خاں نے بنوایا۔ بعض کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ کو ابوا میں دفن کیا گیا"

۱۳۴۵ھ میں جب یہ فقیر مدینہ منورہ گیا تھا تو زقاق سیدنا عبداللہ میں جو مدینے کی جانب غرب شہرپناہ کے متصل واقع ہے۔ مزار حضرت عبداللہ کی زیارت سے مشرف ہوا تھا۔ مزار پر قبہ نہیں رہا۔ محلے کا نام جو حضرت عبداللہ کے مکان و مزار کی وجہ سے مشہور ہوگیا ہے وہ بدستور چلا آرہا ہے۔

(۴) مقبرہ حضرت مالک بن سنان رضؓ

آنحضرت کے والد ماجد حضرت عبداللہ کے مزار کے قریب مالک بن سنان کا مزار ہے اسپر پیشتر ایک قبہ بھی تھا۔ اس کے متعلق پتہ نہیں لگتا کہ کب بنایا گیا تھا مگر نویں صدی ہجری میں وہ موجود تھا مالک بن سنان کے فرزند ابو سعید الخدری مشہور صحابی و راوی حدیث ہیں۔ مالک بن سنان جنگ احد میں شہید ہوئے تھے اور وہیں دفن کیے گئے تھے مگر جب امیر معاویہ کے زمانہ[1] میں ۴۱ یا ۴۲ ہجری میں اُحد کیطرف سے نہر[2] لائی گئی اور بعض شہیدوں کے جسم وہاں سے منتقل کیے گئے تو ان کو بھی اُحد سے لاکر یہاں دفن کیا گیا۔

مدینے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہاں والے مالک بن سنان کی بڑی تعظیم کرتے ہیں ان کی نام کی جھوٹی قسم کبھی نہیں کھاتے۔ مدینہ میں ان کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ یہ جنگ اُحد میں شہید ہوگئے تھے۔ ان کی والدہ مدینہ کے دروازے پر کھڑی اُحد سے واپس آنیوالوں سے اُنکی خبر پوچھتی تھیں ہر ایک یہ کہدیتا تھا کہ معلوم نہیں۔ آخر آنحضرت سے دریافت کیا اُنھوں نے فرمایا پیچھے آرہے ہیں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کے قول کی تصدیق کیلیئے مالک بن سنان کو زندہ کر کے بھیجدیا۔ وہ اپنی ماں سے ملے چونکہ بُری طرح زخمی تھے کچھ دن بعد وفات پائی۔

اِن کے قبے کے دروازے پر یہ عبارت لکھی تھی:-

"مالک بن سنان بیرق دار رسول اللہ"

اب وہ قبہ نہیں رہا۔ قبر موجود ہے جس کے سامنے کسی شخص کی دیوار سے ملحق تین قبریں اور ہیں کہتے ہیں کہ وہ بھی شہدائے اُحد ہیں۔

---

[1] - امیر معاویہ بن ابو سفیان کا زمانہ ۴۱ ہجری سے ۶۰ ہجری تک رہا۔

[2] - اس نہر کی کیفیت اور بعض شہیدوں کے جسموں کی منتقلی کا ذکر شہدائے اُحد کے حالات میں آگے کیا گیا ہے۔

(۵) مقبرۂ شہدائے اُحد

۱ الف ـ جبل اُحد ـ

جبل اُحد مدینے کے شمال میں تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے ـ باب مجیدی سے اُحد تک
پکی سڑک جاتی ہے ـ گاڑیاں وہاں تک پہنچ سکتی ہیں ـ رستے میں کہیں کہیں کھجور کے درخت ہیں
مینھ خوب برستا ہے تو کھیت بو دیے جاتے ہیں بعض جگہ کنوؤں کے پانی سے زراعت ہوتی ہے ـ
میں نے گرمی کے موسم میں وہاں نہایت اچھے تربوز دیکھے تھے ـ اُحد اس وقت ایک چھوٹے سے
گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کوئی پچیس تیس گھر ہونگے ـ پولس کا ایک تھانہ بھی ہے اور نجدی
سپاہی متعین ہیں[ل] ـ اُحد کی بستی میں زیادہ تر وہ لوگ رہتے ہیں جو سابق میں حضرت امیر حمزہ کی مزار کے
مجاور رہتے تھے ـ یہ لوگ اپنا سلسلۂ نسب بنی عباس سے ملاتے ہیں ـ یہاں ایک کنواں ہے جس کا پانی
اچھا ہے ـ اُحد کی وجہ تسمیہ یہ بیان کیجاتی ہے کہ یہ بالکل الگ تھلگ کھڑا ہے ـ کسی طرف کسی پہاڑ
سے ملتا نہیں اسوجہ سے اسکو اُحد کہتے ہیں ـ لفظ "احد" توحد سے مشتق ہے ـ بعض کہتے ہیں
کہ اہل توحید کا نصرت گاہ ہونے کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا ہے ـ مگر پہلی وجہ زیادہ قرین قیاس ہے
جبل اُحد مشرق سے مغرب تک کوئی چار میل لمبا ہوگا ـ اس میں کالے پیلیا اور سرخ کئی رنگ کے
پتھر ہیں ـ اس کی چوٹی زمین سے عمودی شکل میں بہت بلند ہے جس سے اسکی چڑھائی مشکل ہوگئی ہے ـ
موسم گرما میں جب میں نے دیکھا تھا تو اسے بالکل خشک و بے گیاہ پایا ـ اسپر چرند و پرند کا نام
نہ تھا ـ اُحد کے دامن میں جنوب کیطرف وادی ہے جو نالا بنکر بہتی ہے اور مینھ کے بعد اس میں کچھ
گھاس اور جھاڑی کہیں کہیں ہو جاتی ہے ـ حدیث میں وارد ہے کہ اُحد جنت کے پہاڑوں میں سے ہے ـ

[ل] ـ میں نے نجدی سپاہیوں کو انعام و اکرام کے معاملہ میں بہت سیر چشم پایا ـ پولیس کے عام سپاہیوں
اور دفتر کے چپراسیوں کی طرح لپٹ کر تو کیا مانگینگے اشارے کنایہ سے بھی سوال نہیں کرتے ـ میں نے
ان سپاہیوں سے یہ کام لیا تھا کہ حضرت حمزہ کے مزار پر جو مساکین خیرات لینے آئے تھے اُن کو قطار بنا کر بٹھا دیں
تاکہ سہولت سے اُنکو دیا جاسکے اس کے بعد ان سپاہیوں کو بھی کچھ نذر کیا مگر اُنھوں نے اپنی زبان سے یہ نہ کہا کہ
یہ کم ہے کچھ اور دو ـ یا یہ کہ ہمارے آدمی جو موجود نہیں ہیں اُن کا بھی اسمیں حصہ لگیگا ـ

جب تم ادھر سے گذرو تو یہاں کے پھل کھاؤ۔ اگر پھل نہ ہوں تو یہاں کی گھاس پات بھی وہی اثر رکھتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ یہ پہاڑ ہمکو دوست رکھتا ہی اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔ اس حدیث کے الفاظ بطور استعارہ واقع ہوئے ہیں جن سے یہ مراد لیجا سکتی ہے کہ اُحد کے رہنے والے ہم سے محبت رکھتے ہیں اور ہمکو اُنسے محبت ہے۔

ب۔ قبۂ ہارون

اسلام سے قبل بھی جبل اُحد غالباً متبرک پہاڑ سمجھا جاتا تھا۔ مدینہ وحوالی مدینہ میں یہودی آباد تھے۔ ان کی زیارت کیلیے اُحد پر حضرت ہارون کی قبر موجود تھی۔ اور انھیں کی یادگار میں اُحد کے ایک حصّے کو وادی ہارون کہتے تھے۔ یہ نام ابتک چلا آرہا ہے مسلمانوں میں یہ روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون حج کے بعد مدینے تشریف لائے تو اُنھوں نے جبل اُحد پر قیام کیا اور اتفاقاً حضرت ہارون نے وہیں وفات پائی حضرت ہارون کی قبر کی نشاندہی سید سمہودی کے زمانہ یعنی نویں صدی ہجری سے ابتک ہورہی ہے۔ برٹن فرنگی سیاح حجاز جو ۱۲۶۹ھ میں مدینے گیا تھا اپنے سفرنامے کی جلد اول میں جبل اُحد پر قبۂ ہارون کا وجود ظاہر کرتا ہے۔ اُسوقت یہ بہت ہی خستہ حالت میں تھا وہ کہتا ہے:۔

اس قبے تک چڑھنے اُترنے میں آٹھ نو گھنٹے لگتے ہیں۔ کوئی صاحب گرمی کے دنوں میں اسپر چڑھنے کا قصد نہ کریں۔ ہارون کی قبر بلند ترین چوٹی پر ہے۔

مدینے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اسپر چڑھتے چڑھتے کسی عرب کا سانس چڑھگیا تھا اُس نے جل کر کہا:۔

من طلع قبتہ ہارون   ملعون ابن ملعون

یعنی قبۂ ہارون پر جو چڑھے وہ ملعون کا بچہ ملعون ہے۔

سنہ ۱۳۲۹ھ میں حاجی عبدالرحیم صاحب بنگلوری نے بھی اس قبے کا ذکر کیا ہی۔ میں نے سنہ ۱۳۴۵ھ میں اس قبے کا کوئی نشان نہیں پایا۔ اہل نجد کے آنیسے قبل گروش زمانہ نے اسے منہدم کر دیا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھکر حضرت ہارون پر فاتحہ پڑھنا مجھ جیسے کمزور آدمی کا

کام نہ تھا اس لیے میں نے برٹن صاحب کی نصیحت پر عمل کیا۔ اور دامن کوہ میں فاتحہ پڑھی۔

ج۔ جنگ اُحد

زمانۂ اسلام میں احد کی شہرت جنگ اُحد کے باعث ہے جس میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب آنحضرت کے چچا شہید ہوئے تھے۔ سنہ ۲ھ میں مکہ معظمہ کے کفار قریش کو بمقام بدر[۱] مسلمانوں کے مقابلہ میں سخت ہزیمت اٹھانی پڑی تھی اس کا انتقام لینے کیلیے شوال سنہ ۳ھ میں مکے کے تین ہزار آدمیوں نے بسرکردگی ابوسفیان مدینے پر چڑھائی کی۔ اس لشکر میں دو سو سوار۔ سات سو زرہ پوش اور کئی ہزار اونٹ تھے۔ قریش کو جوش دلانے کیلیے ہندہ[۲] زوجۂ ابوسفیان کی ماتحتی میں پندرہ عورتیں بھی تھیں جو دف بجا بجا کر اور مقتولین بدر پر نوحے گا گا کر اپنے مردوں کو لڑائی کی ترغیب دلاتی تھیں۔

صحابہ سے مشورہ کے بعد آنحضرت صلعم ایک ہزار مسلمانوں کیساتھ مدافعت کیلیے مدینے سے باہر نکلے مگر عبداللہ ابن اُبی بن سلول منافق مع اپنے تین سو آدمیوں کے اس بنا پر رستے میں سے

---

[۱] بدر مدینے سے پانچ منزل جانب جدہ واقع ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کے گرد ٹوٹی پھوٹی فصیل ہے اور تھوڑے سے پختہ و نیم پختہ مکانات ہیں۔ قصبے کے بیچ میں سے ایک بڑا نالا بہتا ہے۔ بدر کی آبادی سے ایک میل کے فاصلہ پر دامن کوہ میں جانب جنوب اُن تیرہ اصحاب کی قبریں ہیں جو جنگ بدر میں شہید ہوئے تھے۔ یہ لڑائی رمضان سنہ ۲ھ میں ہوئی تھی۔ جب آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا کہ قریش مکہ بڑی تیاری کے ساتھ مدینے پر حملہ کرنے والے ہیں اور ابوسفیان ایک ہزار آدمیوں کے قافلے کے ساتھ شام سے آرہا ہے تو آنحضرت تین سو تیرہ مسلمانوں کیساتھ مدینے سے روانہ ہوئے۔ اسکی اطلاع جب اہل مکہ کو ہوئی تو انھوں نے نو سو پچاس آدمی ابوسفیان کی مدد کیلیے بھیجے۔ تائید غیبی سے مسلمانوں کو زبردست فتح ہوئی۔ انکے صرف تیرہ آدمی شہید ہوئے۔ کفار کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر ہی قید ہوئے جن میں حضرت عقیل بن ابیطالب اور حضرت عباس ابن عبدالمطلب بھی تھے جو فدیہ لیکر چھوڑے گئے اور مسلمان ہوئے۔ اس لڑائی میں بہت سے پرانے دشمنان اسلام مارے گئے منجملہ اُن کے ابوجہل بھی تھا۔

[۲] فتح مکہ کے بعد سنہ ۸ھ میں ہندہ بھی مسلمان ہوگئی تھی۔ حضرت حمزہ کا جگر کھانے سے ہندہ کو جگرخوارہ کہتے ہیں۔ ہندہ کی لڑکی ام حبیبہ آنحضرت کی بیوی تھیں۔ ہندہ اپنی لڑکی سے ملنے کے لئے کبھی کبھی آیا کرتی تھی مگر آنحضرت اسکی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

واپس ہو گیا کہ اُس کی رائے مدینے میں ٹھہر کر لڑائی کرنے کی تھی جو آنحضرتؐ نے منظور نہیں فرمائی۔ اب صرف سات سو مسلمان آنحضرت کیساتھ رہ گئے۔ ۷ شوال ۳ہجری کو شنبہ کے دن لڑائی ہوئی۔ آنحضرت نے پچاس تیر اندازوں کو ایک درہ پر مقرر کر کے حکم دیا کہ یہاں سے کسی حالت میں بھی نہ ہٹیں۔ مشرکین کی فوج میمنہ کی کمان خالدؓ بن ولید اور میسرہ کی عکرمہؓ بن ابی جہل کے ہاتھ میں تھی۔ ہندہ اُسوقت جو اشعار گا رہی تھی اُن کا یہ مطلب تھا:۔

اے عبدالدار کی اولاد والو تم پر افسوس ہے

افسوس ہی تم پر۔ تم ایک ظالم کے ہاتھ سے مارے گئے

لڑائی شروع ہوئی مسلمانوں نے سخت حملہ کیا اور کفار میدان جنگ سے بھاگے۔ مسلمان مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے اور تیر انداز بھی اپنی جگہ چھوڑ کر سامان پر ٹوٹ پڑے۔ خالد بن ولید نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اسی اثناء میں کسی شیطان نے یہ خبر اُڑا دی کہ آنحضرت شہید ہو گئے۔ اب لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ مسلمانوں میں بھاگڑ مچ گئی اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کے قدم اُکھڑ گئے۔ مشرکین نے پتھروں کا مینھ برسانا شروع کیا۔ آنحضرت کے بھی

---

۵۱ خالد بن ولید نے ۸ھ میں اسلام قبول کیا۔ حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے زمانہ میں بڑی بڑی سیاسی و جنگی خدمات انجام دیں۔ فتح شام میں بھی بہت حصہ لیا۔ آخر میں حضرت عمر نے ان کی بعض نامناسب کارروائیوں کی بنا پر ان کو معزول کر دیا۔ اہل سنت میں یہ سیف اللہ کے نام سے مشہور ہیں۔ انکی وفات بمقام حمص واقع شام ۲۱ ہجری میں ہوئی۔

۵۲ عکرمہ بن ابو جہل نے ۸ھ میں بعد فتح مکہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت عمر کے زمانہ میں جب ملک شام میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں لڑائی ہو رہی تھی اُس وقت بمقام یرموک عیسائیوں کا ہجوم دیکھکر عکرمہ نے لشکر اسلام کو للکارا کہ "ہے کوئی ایسا جو مرنے پر بیعت کرے"۔ یہ بیعت بڑی سخت ہوتی تھی۔ اس میں یہ عہد کرنا پڑتا تھا کہ میدان جنگ سے ہم زندہ واپس نہ آئینگے ہماری لاش ہی آئیگی۔ ایسے جانباز بھی ایک سو آدمی نکل آئے جنھوں نے ہزاروں عیسائیوں کو لقمۂ اجل بنا دیا اور خود بھی مر کر ڈھیر ہو گئے۔ مرتے وقت عکرمہ نے کہا "خدا کی قسم حضرت عمر کا یہ خیال غلط تھا کہ عکرمہ بھی اپنے باپ ابوجہل کی بائینتی جائیگا۔ دیکھو میں مسلمان مر رہا ہوں"۔ یہ واقعہ ۱۳ھ کا ہے۔

۵۳۔ یہ اشارہ ابوجہل۔ عتبہ۔ شیبہ۔ اور ولید بن عتبہ کیطرف ہے جو بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔

دو پتھر لگے جن سے سامنے کے دو دانت[1] بری طرح ہل گئے اور خود کی کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں۔ اس کے علاوہ تلواروں کے بھی زخم آئے۔ خود کی کڑیاں نکالنے سے دانت ٹوٹ گئے۔ جب یہ خبر مدینے میں پہنچی تو جنابہ فاطمۂ زہراؑ چند عورتوں کو اپنے ساتھ لیکر اُحد پہنچیں۔ آنحضرت کے زخموں کو دھویا اور اُن میں جلے ہوئے کپڑے کی راکھ بھری۔ حضرت طلحہ کا ہاتھ آنحضرتؐ کی محافظت میں کٹ گیا۔ حضرت حمزہ کو جبیر بن مطعم کے حبشی غلام[2] نے شہید کیا۔ اُسکو نیزہ پھینک کر مارنے میں بڑی مشق تھی۔ یہ ایک پتھر کی آڑ میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ اُدھر سے حضرت حمزہ گذرے اُس نے پشت پر نیزہ مارا جو ناف میں ہو کر نکل گیا۔ ابھی کچھ جان باقی تھی کہ ابوسفیان نے کنپٹی میں نیزہ چبھو کر خاتمہ کر دیا۔

اس لڑائی میں کُل ستّر مسلمان شہید ہوئے۔ بعض نے کچھ کم و زائد تعداد بھی لکھی ہے۔ کفار کی طرف سے صرف بائیس یا تیس آدمی مارے گئے۔ ہندہ اور اُسکی ہمراہی عورتوں نے مسلمان مقتولوں کے ناک کان کاٹ کر ہار بنائے اور اپنے گلوں میں پہنے۔ ہندہ نے حضرت حمزہ کا پیٹ چیر کر اُنکا کلیجہ چبایا۔ اس لڑائی میں اگرچہ کہ کفار کو فتح ہوئی تھی مگر اُنکی ہمت نہ پڑی کہ مسلمانوں کا تعاقب کرتے اس لیے وہ یہاں سے مکے چلے گئے۔ آنحضرتؐ نے رات اُحد میں گزاری اور دوسرے دن اپنے مقتول ساتھیوں کو دفن کرکے مدینے واپس ہوئے۔

د۔ شہدائے اُحد کے نام

(۱) حمزہ بن عبد المطلب (۲) عبد اللہ بن جحش (۳) مصعب بن عمیر (۴) شماس بن عثمان

[1] میدان احد میں جس جگہ آنحضرت کے دندان مبارک دفن کیے گئے تھے وہاں ۱۲۳۰ھ میں سلطان محمود خاں نے ایک قبہ بنوا دیا تھا جسے قبۃ الثنایا کہتے تھے۔ اس سے قبل یہاں کوئی قبہ نہ تھا۔ ہندوستان کے چودہویں صدی ہجری کے سیاح اس قبے کا ذکر کر رہے ہیں۔ بعض نے اس کا نام مسجد الثنایا بھی تحریر کیا ہے۔ ثنایا سامنے کے دانتوں کو کہتے ہیں۔ مولوی صبغۃ اللہ صاحب نے اسی مسجد ہی لکھا ہے اور دندان مبارک کے متعلق ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں "اس مسجد کی قبلہ رو دیوار میں ایک پتھر نصب ہے۔ مسجد کے مجاور نے ہمیں بتایا کہ حضور کے شہید شدہ دندان اس پتھر میں نصب ہیں۔ مجھ راسطور نے اپنی آنکھوں سے بعض انسانی دانتوں کو اُن پتھروں میں نصب پایا میں نے اپنی انگلیوں سے مس کرکے بھی دیکھا۔ میرے ساتھ جتنے لوگ تھے سب نے دیکھا لیکن میرے قافلے والوں نے دوسرے وقت جاکر دیکھا تو وہ دانت اُنکو نظر نہ آئے۔" (السکینہ ص ۱۲۸)۔

[2] اسکا نام وحشی تھا۔

یہ چار مہاجر تھے۔ انصار میں سے (۵) عمرو بن معاذ (۶) حارث بن انس بن رافع (۷) عمارہ بن زیاد بن السکن (۸) سلمہ بن ثابت (۹) عمرو بن ثابت (۱۰) ثابت بن وقش (۱۱) رفاعہ بن وقش (۱۲) حسیل بن جابر (۱۳) صیفی بن قبطی (۱۴) حباب ابن قبطی (۱۵) عباد بن سہل (۱۶) حارث بن اوس (۱۷) ایاس بن اوس (۱۸) عبید بن تیہان (۱۹) حبیب بن زید (۲۰) یزید بن حاطب (۲۱) ابو سفیان بن حارث بن قیس (۲۲) انیس بن قتادہ (۲۳) حنظلۃ الغسیل ابن ابی عامر (۲۴) ابو حبہ بن عمرو (۲۵) عبید اللہ بن جبیر (۲۶) خیثمہ بن ابو سعد (۲۷) عبداللہ بن مسلمہ (۲۸) سبیع بن حاطب (۲۹) عمرو بن قیس (۳۰) قیس بن عمرو (۳۱) ثابت بن عمرو بن زید (۳۲) عامر بن مخلد (۳۳) ابو ہبیرہ (۳۴) عمرو بن مطرف (۳۵) اوس بن ثبت برادر حسان بن ثابت (۳۶) انس بن نضر (۳۷) قیس بن مخلد (۳۸) کیسان مولی بنی نجار (۳۹) سلیم بن حارث (۴۰) نعمان بن عبد عمرو (۴۱) خارجہ ابن زید (۴۲) سعد ابن الربیع (۴۳) اوس بن الارقم (۴۴) مالک بن سنان (۴۵) سعد بن سوید (۴۶) عتبہ بن ربیع (۴۷) ثعلبہ بن سعد (۴۸) نقیب ابن فروہ (۴۹) عبداللہ بن عمرو (۵۰) ضمرۃ الجہنی (۵۱) نوفل بن عبداللہ (۵۲) عباس بن عبادہ (۵۳) نعمان بن مالک (۵۴) المخذر بن زیاد (۵۵) عبادہ بن الحسحاس (۵۶) رفاعہ بن عمرو (۵۷) عبداللہ بن عمرو بن ورم (۵۸) عمرو بن الجموح (۵۹) الخلاد (۶۰) ابو ایمن (۶۱) عبیدہ بن عمرو (۶۲) عنترہ (۶۳) سہل بن قیس (۶۴) ذکوان بن عبد قیس (۶۵) عبید بن المعلی۔ (۶۶) مالک بن نمیلہ (۶۷) حارث بن عدی (۶۸) مالک بن ایاس (۶۹) عیاس بن عدی (۷۰) عمرو بن ایاس

(وفاء الوفا جلد دوم ص ۱۱۳)

۸۔ شہدائے احد کا کفن دفن۔

لڑائی ختم ہو جانے کے بعد آنحضرتؐ نے اپنے شہید ساتھیوں کا معائنہ فرمایا۔ مصعب بن عمیر کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر یہ آیت پڑھی:-

من المومنین رجال صدقوا ما عاھد واللہ علیہ

یعنی مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اُس وعدے کو سچ کر دکھایا جو اُنھوں نے خدا سے کیا تھا اِسکے بعد یہ دعا کی:-

اللھم ان عبدك ونبيك يشهد ان هؤلاء شهداء

(یا اللہ یہ تیرا بندہ اور تیرا نبی گواہی دیتا ہے کہ یہ شہید ہیں)

پھر فرمایا:۔

آؤ اور شہدائے اُحد پر سلام پڑھو۔ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں جو شخص ان پر سلام پڑھیگا یہ اُس کا جواب دینگے۔

نیز بعض دوسرے شہیدوں کی لاشوں کے قریب کھڑے ہو کر فرمایا:۔

"یہ میرے اصحاب ہیں قیامت کے دن میں انکی نسبت گواہی دوں گا۔"

جب آنحضرت اپنے چچا حمزہ کی لاش کے پاس پہونچے تو دیکھا کہ ان کی ناک اور کان کاٹے گئے ہیں اور ان کا پیٹ چیر کر جگر نکال لیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اس سے بڑھکر مصیبت مجھپر کوئی نہ پڑیگی اور میرے لیے اس سے زیادہ دردناک منظر کوئی نہ ہوگا۔ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ حمزہ کی بہن صفیہ کو بہت رنج ہوگا اور میرے بعد سنت ہو جائیگی تو میں حمزہ کی لاش کو یوں ہی پڑا ہوا چھوڑ دیتا تاکہ چیل کوّے اور صحرائی درندے اس کو کھا لیتے۔

اسی اثنار میں جبریل نے ندا دی کہ:۔

"آسمانوں پر یہ لکھا گیا کہ حمزہ بن عبد المطلب اللہ اور اُس کے رسول کے شیر ہیں۔"

پھر آنحضرت نے اپنی چادر حمزہ کی لاش پر اُڑھا کر نماز جنازہ پڑھی اور جب دوسرے مقتول آتے تو اُن کے ساتھ ان پر بھی نماز پڑھتے تھے۔ اسطرح حضرت حمزہ پر بہتّر مرتبہ نماز جنازہ پڑھی اور دفن کر دیا۔ آنحضرت دو دو تین تین شہیدوں کو ایک ایک کپڑے میں لپٹواتے تھے اور فرماتے تھے کہ:۔

"جس جس کو علم قرآن زیادہ ہو پہلے اُس کو دفن کرو۔"

بعض بعض شہید دو دو تین تین ملا کر دفن کیے گئے۔ چنانچہ حضرت حمزہ کی قبر میں مصعب بن عمیر علمدار لشکر اسلام اور حضرت حمزہ کے بھانجے عبد اللہ بن جحش دفن کیے گئے۔ حضرت حمزہ جبل رماۃ یعنی اُحد کی اُس چوٹی کے قریب شہید ہوئے تھے جہاں آنحضرت نے تیراندازوں کو

مامور فرمایا تھا۔ وہاں سے اُن کی لاش کو وادی میں منتقل کرنیکا حکم دیا اور وہاں انکی قبر بنائی گئی۔

۹۔ شہدائے اُحد کے اجسام کی منتقلی۔

سید سمہودی کہتے ہیں کہ شہدائے اُحد کے اجسام کی منتقلی اور اُن کی قبروں کی اُلٹ پلٹ تین دفعہ ہوئی ہے :۔

(۱) پہلی مرتبہ اس وجہ سے کہ بعض بعض لاشوں کے دفن میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ ایک کا قرابتدار دوسرے کے پاس دفن کردیا گیا تھا۔ لوگوں نے آنحضرتؐ کی اجازت سے یا بطور خود اُن کی لاشوں کو نکال کر جدا جدا دفن کردیا۔ بعض کو یہاں سے لیجاکر بقیع میں دفن کیا گیا۔ بعض کو قبا میں بعض کو کہیں اور۔

(۲) دوسری مرتبہ امیر معاویہ کی نہر کی وجہ سے منتقلی ہوئی۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ امیر معاویہ نے ۴۳ھ یا ۴۶ھ میں اہل مدینہ کیلیے ایک نہر نکالی تھی جو اسی مشہد کی طرف سے آئی تھی۔ نہر کھودنے کے وقت اُن کے عامل نے یہ منادی کردی تھی کہ امیرالمومنین کی نہر آ رہی ہے جس کسی کا مُردہ یہاں دفن ہو وہ یہاں آئے اور اُسکو اُکھاڑ کر کہیں اور لیجائے۔ کہتے ہیں کہ اُسوقت ایک کدال حضرت حمزہ کے پاؤں میں لگی اُس سے خون جاری ہوا۔ مورخین کا بیان ہے کہ بعض شہیدوں کی قبروں کو کھولا گیا تو مع کفن کے اُن کی لاشیں بالکل تروتازہ نکلیں۔ بعض شہیدوں کو دیکھا تو وہ اپنے زخموں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے جب اُن کا ہاتھ ہٹایا جاتا تو زخم سے خون بہنے لگتا تھا اور جب ہاتھ چھوڑ دیتے تو پھر وہ خود بخود زخم پر پہنچ جاتا تھا۔

(۳) تیسری مرتبہ قبروں کے کھلنے کی وجہ ایک سیلاب ہوا جس کے سبب سے لاشیں منتقل کرنی پڑیں۔ یہ سیلاب تیسری صدی میں آیا تھا۔ اس کی زد میں حضرت حمزہ کی قبر بھی آگئی تھی اور اُن کی پنڈلی نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بعد جسم مبارک یہاں سے منتقل کرکے ایک ٹیلے پر قبر بنادی گئی جو اب تک موجود ہے۔

(خلاصۃ الوفاء و مرآۃ الحرمین)

۱۰۔ مزار حضرت حمزہ۔

شہدائے اُحد میں سب سے زیادہ بزرگ ہستی حضرت حمزہ کی ہے۔ ان کی شہادت [illegible]

مصرع

قدیم سے دو مقامات کی زیارت ہوتی رہی ہے ایک تو ان کے شہید ہو کر گرنے کی جگہ کی جسے مَصرَع کہتے ہیں اور جو کتب تاریخ میں قبۂ مصرع یا مسجد مصرع کے نام سے مشہور ہے۔ ہمارے زمانہ کے سیاح اسکو مسجد حمزہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری زیارت گاہ حضرت حمزہ کی قبر ہے۔ بقول سید سمہودی مسجد مصرع غالباً پہلی مرتبہ دوسری ہجری میں تعمیر ہوئی تھی مگر امام محمد غزالی جنھوں نے سنہ ۴۸۷ھ میں مدینے کی زیارت کی تھی اپنی کتاب احیاء العلوم میں اسکا کچھ ذکر نہیں کرتے۔ سنہ ۵۸۰ھ میں ابن ابی الہیجا وزیر سلاطین عبیدیۂ مصر نے اس مسجد کی ترمیم کرائی اور سن تعمیر کے متعلق حسب ذیل کتبہ ایک پتھر پر کندہ کراکے اُس میں نصب کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم - انما یعمر مساجد اللہ من آمن
باللہ والیوم الآخر۔ ھذا مصرع حمزہ بن عبد المطلب
علیہ السلام و مصلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
عمرہ العبد الفقیر الی رحمۃ ربہ حسین بن ابی الہیجا
غفر لہ ولوالدیہ
سن ثمانین وخمسمائۃ

مطلب اس کا یہ ہے کہ:-

"جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں وہ مسجدیں تعمیر کراتے ہیں۔ یہ مقام حضرت حمزہ علیہ السلام کے زخمی ہو کر گرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے اس کو اپنے رب کی رحمت کے خواستگار بندۂ فقیر حسین ابن ابی الہیجا نے اللہ اُس کی اور اُس کے ماں باپ کی مغفرت کرے۔ سنہ ۵۸۰ھ میں تعمیر کرایا"

سنہ ۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے اس مسجد کا ذکر کیا ہے۔ سید سمہودی کے زمانہ تک یہ مسجد موجود تھی مگر مرمت طلب ہو گئی تھی۔ چنانچہ اُسوقت جمادی الاول سنہ ۸۹۰ھ میں سلطان قایتبے مصری نے اُس کی ترمیم و توسیع کرائی اور اس کے مغرب کیطرف جو کنواں تھا اُسے بھی مسجد میں شامل کر لیا۔ سید ممدوح کہتے ہیں کہ بعض ناواقف لوگوں نے اس مسجد کے کتبے کو اُٹھا کر حضرت حمزہ کے مزار کے

قبے میں قبر کے سرہانے لگا دیا تھا۔ اس ترمیم کے وقت شیخ الحرم شجاعی شاہین نے جس کے سپرد تعمیر کا انتظام تھا وہ پتھر قبۂ مزار سے نکال کر پھر اسی جگہ مسجد مصرع میں پہنچا دیا۔ اسکے بعد سنہ ۱۲۱۹ھ میں جب بسر کردگی امیر سعود اہل نجد کا قبضہ مدینۂ منورہ پر ہوا تو مزارات کے قبوں کے ساتھ شاید اس مسجد کو بھی انھوں نے منہدم کر دیا تھا۔ سنہ ۱۲۳۳ھ میں فرنگی سیاح برکھارٹ یہاں آیا تھا وہ اپنے سفرنامے میں اس مسجد کا ذکر نہیں کرتا۔ حجاز پر ترکوں کا دوبارہ تسلط ہوجانے کے بعد سنہ ۱۲۶۵ھ میں اس مسجد کی پھر تعمیر ہوئی جیسا کہ ان اشعار سے ثابت ہے جو حضرت حمزہ کی قبر کی پائین کندہ تھے اور جن کو جنرل ابراہیم رفعت پاشا نے مراۃ الحرمین میں نقل کیا ہے۔ سنہ ۱۲۶۹ھ میں جب انگلستان کے مشہور و معروف سیاح کپتان برٹن کا ادھر سے گزر ہوا تو انھوں نے اس مسجد کو دیکھا تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ یہ مسجد چودھویں صدی ہجری تک قائم تھی۔ سنہ ۱۳۴۳ھ میں جب اہل نجد کا دوبارہ حجاز پر قبضہ ہوا تو انھوں نے پھر حسب عادت قدیم اس مسجد کو بھی اس بنا پر منہدم کر دیا کہ:-

"وہ خالص خدا کے واسطے تعمیر نہیں ہوئی تھی بلکہ حضرت حمزہ کی یادگار تھی اور بعض مسلمان خدا کی مسجدوں سے زیادہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور قبرستان میں یا قبروں کے پاس مسجد بنانے کی بھی شرعاً ممانعت ہے"

اس مسجد کے انہدام سے ہندوستان کے بعض مسلمانوں کو بہت رنج ہوا کہ وہابی مسجدوں کو بھی ڈھاتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک وہابی دوست سے اس کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس قسم کی مسجدوں کی نسبت حضرت عمرؓ کا مندرجۂ ذیل واقعہ اور ان کی رائے قابل غور ہے:-

"ایک دفعہ حضرت عمرؓ سفر حج سے واپس آرہے تھے راستہ میں ایک مسجد تھی جس میں ایک دفعہ آنحضرت نے نماز پڑھی تھی اس خیال سے لوگ اس کی طرف دوڑے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اہل کتاب ان ہی باتوں کی بدولت تباہ ہوئے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی یادگاروں کو عبادت گاہ بنا لیا"

(الفاروق مولفہ مولوی شبلی نعمانی مطبوعہ رحمانی پریس دہلی باب امامت و اجتہاد صفحہ ۲۲۹)

میں نے جواب دیا کہ تعظیم کا تعلق نیت سے ہے اور نیت کا علم خدا کو یا کسی قدر ہمارے مولویوں کو ہے اس لیے میں اس مسئلہ کا تصفیہ انھیں دونوں کے سپرد کرتا ہوں۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں جب یہ گنہگار مدینۂ منورہ میں حاضر ہوا تو مسجد مصرع کی جگہ خالی دیکھی۔

(۲) مزار حمزہ

حضرت حمزہ کی قبر میں ان کے بھانجے عبداللہ بن حجش اور لشکر اسلام کے علمدار مصعب بن عمیر بھی دفن ہیں۔ اس قبر پر کوئی چھ سو برس تک گنبد تعمیر نہیں ہوا۔ سنہ ۴۸۷ھ میں امام محمد غزالی نے شہدائے احد کی زیارت کے متعلق احیاء العلوم میں ہدایت کی ہے مگر حضرت حمزہ کی قبر کی کوئی صراحت نہیں کی۔ سنہ ۵۸۰ھ میں ابن جبیر نے اس قبر کو بغیر قبے کے دیکھا تھا۔ سنہ ۵۹۰ھ میں پہلے پہل اس قبر کو الناصر لدین اللہ کی والدہ نے پختہ بنوایا اور اس پر قبہ تعمیر کرایا۔ اس قبے کا دروازہ لکڑی کے تختوں کا تھا جس پر لوہے کے پتر جڑے ہوئے تھے۔ قبر چونے کی تھی اور اس پر لکڑی کے تختے اسی طرح جمائے گئے تھے جیسے کہ جنت البقیع میں قبر ابراہیم ابن رسول اللہؐ و قبر عباسؓ و قبر امام حسنؑ پر تھے۔ قبر کے اطراف پتھر کی بندش تھی۔ سنہ ۵۹۰ھ تاریخ تعمیر کا کتبہ خط کوفی میں مشہد کی دیوار پر نصب کیا گیا تھا۔ سنہ ۸۹۳ھ تک یہ قبر و قبہ موجود تھا مگر تھوڑا سا تغیر ہو گیا تھا۔ سید سمہودی کہتے ہیں:-

"قبر میں اسقدر تغیر ہو گیا ہے کہ اس پر اب تختے نہیں رہے وہ پوری کی پوری چونے گچی کی بنا دی گئی ہے۔"

یہ قبر و قبہ غالباً تیرہویں صدی کے آغاز تک بلا کسی رد و بدل کے قائم رہے یہاں تک کہ سنہ ۱۲۱۹ھ میں اہل نجد نے پختہ قبر و قبہ کو منہدم کر کے کچی قبر بنا دی۔ سنہ ۱۲۳۳ھ میں فرنگی سیاح برکھارٹ جب یہاں آیا تھا اس وقت قبہ نہ تھا۔ اس کا پتہ نہیں لگتا کہ محمد علی پاشا والی مصر نے دوسرے قبوں کیساتھ اسے بھی تعمیر کرایا یا نہیں؟ لیکن سنہ ۱۲۶۹ھ میں انگلستان کے مشہور سیاح برٹن نے یہاں قبہ دیکھا تھا جسکا ذکر اس نے اپنے سفرنامے کی جلد اول میں کیا ہے اور مسجد حمزہ و مقبرہ حمزہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے:-

نمبر (۱) چبوترہ ہے۔ نمبر (۲) دروازہ۔ نمبر ۳ مسجد کی مینار پر چڑھنے کا رستہ۔ (۴) صحن (۵) دالان مسقف
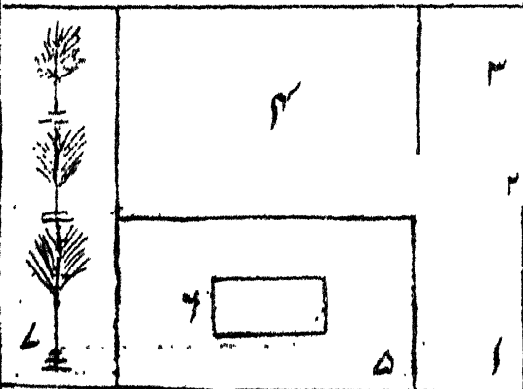
(۶) مقبرہ حمزہ (۷) زاویہ جہاں کھجور کے درخت ہیں۔ برٹن صاحب کے زمانہ میں قبے کے اندر لیمپ ہانڈیاں اور شتر مرغ کے انڈے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر کچھ آیات اور کچھ اشعار خوشخط تحریر تھے۔ رواق کے پیچھے حضرت حمزہ کی قبر سیاہ پتھر کی ڈھلواں بنی ہوئی تھی جسپر غلاف نہ تھا۔ قبر کے چاروں طرف لکڑی کا کٹھرہ نصب تھا۔

برٹن صاحب کی علمی قابلیت کا تذکرہ مزار اقدس رسول اللہؐ میں تفصیل سے کیا جاچکا ہے یہاں صرف اسقدر لکھدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برٹن صاحب حضرت حمزہ کی قبر کو سیاہ پتھر کا لکھکر حاشیہ میں یہ تحریر کرتے ہیں کہ :-

"ابن جبیر کے زمانہ میں قبر سرخ پتھر کی تھی"

(سفر نامہ برٹن انگریزی جلد اول)

اس جگہ بھی برٹن صاحب کو عربی عبارت سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ ابن جبیر کہتے ہیں :-

"گنج شہیدان کے گرد سرخ زمین حضرت حمزہ سے منسوب ہے اس مٹی کو لوگ تبرکاً حاصل کرتے ہیں۔

(ترجمہ سفرنامہ ابن جبیر ص ۱۷۱)

قیاس ہوتا ہے کہ ابن جبیر کے زمانہ میں اہل مدینہ اس مقام کی مٹی کے سرخ ہونے کی وجہ یہ قرار دیتے ہونگے کہ حضرت حمزہ کے خون کے اثر سے لال ہوگئی ہے اور لوگ اسکو تبرک سمجھکر لیجاتے ہونگے۔ اسکو برٹن صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ قبر کا رنگ سرخ تھا" ۱۲۸۷ھ میں اس قبر و قبے کی ترمیم کی پھر ضرورت ہوئی اور رزام پاشا کسی ترک نے اسے بنوایا اور سن تعمیر وغیرہ کی نسبت قبر کے ایک طرف کچھ اشعار وغیرہ بھی تحریر کردیئے (مرآۃ الحرمین)

ہمارے زمانہ کے تمام سیاح قبہ حمزہ و قبر حمزہ کا ذکر کرتے ہیں۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنے روزنامچے میں کسیقدر صراحت سے لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

"روضے کی کرسی قدآدم بلند ہے اور مسجد کا صحن وسیع ہے۔ گنبد جس میں قبر ہے تقریباً دس گز لمبا دس گز چوڑا ہے اور البقیع کے گنبد کی وضع کا ہے۔ قبر مبارک کے گرد لوہے اور گلٹ کی جالی ہے۔ اندر پردہ سبز مخمل کا نہایت قیمتی پڑا ہے۔

قبر اوپر سے اور چاروں طرف سے کھلی ہوئی ہے اور برخلاف دیگر مقابر

مدینۂ منورہ کے صاف نظر آتی ہے۔ مقبرے کے اندر ایک بڑا قصیدہ سبز

زمین پر سفید حرفوں میں حمزہ کی تعریف میں لکھا ہوا ہے۔

(روزنامچہ)

تیرھویں صدی ہجری تک حضرت حمزہ کی قبر پر غلاف کا پتہ نہیں لگتا۔ چودھویں صدی کے سیاحوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سنین میں مختلف رنگوں کا غلاف رہا ہے بتلاتے ۱۳۲۵ھ میں ڈاکٹر نور حسین صاحب نے زیارت کی تھی اُس وقت ارغوانی رنگ کی مخمل کا زریں غلاف تھا۔ صاحب مراۃ الحرمین نے ۱۳۲۵ھ میں لکھا ہے کہ اُس وقت باب کعبہ کا پردہ جس پر آیات قرآنی سُنہری حرفوں میں کڑھی ہوئی تھیں قبر پر پڑا تھا۔

۱۳۴۴ھ میں جب اہل نجد نے حجاز پر دوبارہ تسلط حاصل کیا تو حسب عادت قدیم اُنھوں نے قبے کو منہدم کر کے قبر کو پھر کچا بنا دیا جسکی اطراف ناتراشیدہ پتھر بطور بندش کے جمے تھے۔

۱۳۴۵ھ میں جب یہ گنہگار مدینۂ منورہ گیا ہے تو اس نے حضرت حمزہ کی کچی قبر اسی حالت میں دیکھی اس کے سرہانے ایک ناتراشیدہ پتھر بھی نصب تھا۔

ح۔ گنج شہیداں اور بعض دوسری قبریں۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ حضرت حمزہ کی قبر میں اُن کے بھانجے عبداللہ بن جحش اور لشکر اسلام کے علم بردار مصعب بن عمیر بھی دفن ہیں۔ تقریباً نو سو برس تک تین شہیدوں کی یہ ایک قبر حضرت حمزہ کے مقبرے یا قبے میں رہی۔ ۹۳۰ھ میں اس قبے میں دو قبریں اور بن گئیں جن کی نسبت سید سمہودی نے یہ تحریر فرمایا ہے:۔

"حضرت حمزہ کی قبر کے پاس ایک قبر سنقر ترکی کی ہے جو سلطان قایدبے کے زمانہ میں مسجد حمزہ کی تعمیر کا متولی تھا اور دوسری قبر کسی شریف مدینہ کی ہے ان کو شہدائے احد نہ سمجھنا چاہیے۔"

مگر آخر میں چلکر لوگ ان کو شہدائے اُحد ہی کی قبریں سمجھنے لگے۔ ۱۲۳۳ھ میں جب برکھارٹ یہاں آیا تو اُس نے حضرت حمزہ کی قبر کے علاوہ تین قبریں اور دیکھی تھیں جن کو وہ عبداللہ بن جحش

مصعب بن عمیر اور جعفر بن شمس کی بیان کرتا ہے[۱]۔ معلوم ہوتا ہے کہ سمہودی کے بعد کوئی اور ایک جنازہ یہاں دفن کیے گئے۔ ۱۲۶۹ھ میں برٹن نے یہاں قبر حمزہ کی سرہانے صرف سفیدی کی ہوئی ایک قبر دیکھی جسے، وہ عبداللہ بن جحش کی بتاتا ہے اور ایک قبر اور دیکھی جس کو وہ شماس بن عثمان کی کہتا ہے۔ گردشِ زمانہ نے اس وقت تیسری قبر باقی نہیں رکھی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں مولوی خواجہ حسن نظامی صاحب نے اس مقبرے میں کئی قبریں نئی دیکھیں جن کی نسبت انھوں نے صراحت نہیں فرمائی کہ کس کی تھیں۔ اس پر انھوں نے افسوس ظاہر کیا ہے اور فرماتے ہیں :-

"افسوسناک منظر"

"شہدائے احد جس مقام پر دفن ہیں وہ مختصر جگہ ہے مگر افسوس ہے کہ اس مقام پر میں نے چند تازہ قبریں دیکھیں۔ یہ بات میرے خیال میں شہدا کی بے حرمتی ہے۔ ان نئے مُردوں کو مقبرۂ شہدا کے متصل دفن کرنا لازم تھا نہ کہ خاص مقبرے کے اندر اور سابقہ قبروں کے اوپر۔"

(سفرنامہ مصر و شام و حجاز ص ۱۷۱)

شہدائے احد کا گنج شہیداں ابن جبیر کے زمانہ میں حضرت حمزہ کے مزار کے سامنے موجود تھا مگر اس کی صراحت نہیں کی کہ کیا شکل تھی۔ سمہودی و شیخ عبدالحق کے زمانہ میں گنج شہیداں میں علامت قبور نہ تھیں۔ برٹن کے وقت ۱۲۶۹ھ میں گنج شہیداں کے گرد ایک نیچی چار دیواری کھچی ہوئی تھی جس پر سفیدی کی ہوئی تھی اور اس میں کچھ قبریں بھی بنی ہوئی تھیں اور ان کے اطراف پتھر رکھے ہوئے تھے۔

میں نے ۱۳۵۴ھ میں حضرت حمزہ کی قبر کے متصل دو قبریں اور دیکھیں جن میں سے ایک دراصل کسی ترکی عہدہ دار کی اور دوسری کسی شریف مدینہ کی ہے مگر اس زمانہ کے معلم و اہل مدینہ عموماً ان کو شہدائے احد کی بتاتے ہیں اور عبداللہ بن جحش و مصعب بن عمیر سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ یہ دونوں بزرگ حضرت حمزہ ہی کی قبر میں دفن ہیں۔

حضرت حمزہ کی قبر کے پاس میں نے ایک چبوترہ دیکھا جو گنج شہیداں کہلاتا ہے اسے علیحدہ علیحدہ

[۱]۔ مگر شہدائے احد میں جعفر بن شمس کوئی بزرگ نہیں ہیں۔

قبروں کی علامتیں نہیں ہیں۔

ط۔ شہدائے اُحد کی زیارت وسلام

کہتے ہیں کہ آنحضرت نے شہدائے اُحد کی لاشوں کے پاس جاکر صحابہ سے فرمایا تھا کہ

"آؤ اور شہدائے اُحد پر سلام پڑھو۔ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں جو شخص

انپر سلام پڑھیگا یہ اُس کو سلام کا جواب دینگے"

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا حضرت حمزہ کی زیارت کیلیئے اُحد جایا کرتی تھیں اور اُن کی قبر کی درستی و مرمت کیا کرتی تھیں۔ اُنھوں نے اس قبر کی شناخت کیلیئے اسپر ایک پتھر رکھدیا تھا۔ ایک روایت ہے کہ جنابہ سیدہ ہر جمعہ کو وہاں جاکر نماز پڑھا کرتی تھیں اور رویا کرتی تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ دوسرے تیسرے دن زیارت کیلیے جایا کرتی تھیں۔

(وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ عربی مطبوعہ مکہ جلد دوم)

اہل مدینہ عموماً جمعرات کے دن زیارت اُحد کیواسطے جایا کرتے ہیں بعض اہل دل ہر جمعرات کو صبح کی نماز مسجد نبوی میں پڑھکر اُحد جاتے ہیں اور وہاں سے واپس ہوکر نماز ظہر پھر مسجد نبوی میں ادا کرتے ہیں۔ امام محمد غزالی نے احیاء العلوم میں تاکید کی ہے کہ زائر کو لازم ہے کہ جمعرات کے دن شہدائے اُحد پر سلام پڑھنے جائے۔ عموماً شہدائے اُحد پر یہ سلام پڑھا جاتا ہے۔

"السلام علیك یا سیدنا حمزۃ بن عبد المطلب السلام علیك یا عم رسول اللہ۔ السلام علیك یا عم نبی اللہ السلام علیك یا عم حبیب اللہ۔ السلام علیك یا سید الشہدا ویا اسد اللہ واسد رسولہ۔ السلام علیکم یا شہدا یا سعدا۔ السلام علیکم بما صبرتم۔ فنعم عقبی الدار السلام علیکم یا شہداء اُحد کافۃ عامۃ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

یعنی اے ہمارے سردار حمزہ بن عبد المطلب آپ پر سلام اے رسول اللہ کے چچا

اے اللہ کے نبی کے چچا۔ اے حبیب خدا کے عم بزرگوار آپ پر سلام۔ ای شہیدوں کے
سردار۔ اے اللہ اور اس کے رسول کے شیر آپ پر سلام۔ اے شہیدو اے
خوش نصیبو تمہارے صبر کرنے پر سلام۔ خانۂ آخرت تم کو مبارک ہو۔ ای اُحد کے
شہیدو تم پر سلام اور خدا کی رحمت و برکت۔

بعض لوگ آنحضرت پر سلام پڑھنے کے بعد مسجد نبوی میں تمام کیطرف مُنھ کرکے شہدائے اُحد پر بھی ہر روز سلام پڑھتے ہیں۔

ای۔ حضرت امیر حمزہ کا عُرس

اہل مدینہ بلکہ تمام حجاز والے حضرت حمزہ سے ایک خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ چند سال قبل تک بیمار تندرست ہونیکی اور حاجتمند حاجت روائی کیلئے ان سے منت مانتے تھے۔ تقریباً سو برس سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہر سال ۱۲ رجب کو بڑی دھوم دھام سے عُرس ہوا کرتا تھا۔ مدینے والے اور آس پاس کے عرب یہاں آتے تھے اور اُن مکانوں میں جو مدینے کے مالدار لوگوں نے تبدیل آب وہوا اور تفریح طبع کیلئے یہاں بنا رکھے تھے آکر رہتے تھے۔ ہر طرف ڈیرے نصب ہوجاتی تھی اور بازار لگجاتا تھا۔ یہ میلہ تین چار دن تک رہتا تھا جن کی منتیں مرادیں پوری ہوتی تھیں وہ حضرت حمزہ کے نام پر بھیڑ بکری ذبح کرتے تھے۔ اب وہ میلا اُکھڑ گیا۔ اہل نجد ان باتوں کو خلاف شرع سمجھتے ہیں۔ آج کل مدینے والے چند روز کیلیے تبدیل آب وہوا کے واسطے کبھی کبھی یہاں آجاتے ہیں اور اُن مکانوں میں جو زمانہ کے ہاتھ سے ثابت رہگئے ہیں ٹھہر جاتے ہیں۔

---

(۶) مقبرۂ محمد نفس زکیہ رضؓ

(❖)

ان کا نام محمد ہے ان کے والد عبداللہ محض حضرت حسن مثنیٰ بن امام حسن علیہ السلام کے فرزند تھے محمد کا لقب مہدی اور عرف نفس زکیہ رضؓ ہے انھوں نے ابوجعفر منصور خلیفۂ بغداد کے زمانہ میں جس کا عہد سلطنت ۱۳۷ھ سے ۱۵۸ھ تک رہا خروج کیا تھا منصور پہلا عباسی خلیفہ ہے جس نے

علویوں اور عباسیوں میں عداوت کی بنیاد ڈالی اور حضرت علیؑ کی اولاد میں سے جن جن کو دیکھ دیکھ

مشیین۔ عابد و عالم و متقی پایا چن چن کر قید و قتل کرایا۔ ڈر یہ تھا کہ مسلمان اُن کیطرف رجوع ہو کر

کہیں انکو اپنا خلیفہ نہ بنالیں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد میں کئی منچلے ایسے گزرے ہیں جو

عباسیوں کے مظالم سے تنگ آکر اُن کی حکومت کو تہ و بالا کر دینے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور

اُن کے علم و تقدس کے لحاظ سے بعض طالبانِ حق ان کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو جاتے تھے۔

انھیں موقع طلب بزرگوں میں حضرت محمد نفس زکیہؒ بھی تھے۔ جب منصور کے مظالم کی حد باقی نہیں

رہی اور اُس نے نفس زکیہؒ کے والد اور حقیقی بھائی موسیٰ کو قید کیا اور اُن کے چچا حسن و ابراہیم و

جعفر و عباس کو اور اُن کے کئی صاحبزادوں کو قید کر کے ان میں سے اکثر کو شہید کر دیا تو اب

نفس زکیہ کو گرفتار کرنے کی فکر ہوئی۔ حاکم مدینہ ان کی تلاش میں رہنے لگا اور یہ جگہ جگہ چھپتے

پھرے۔ منصور کے جاسوس ہر طرف ان کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک

کنوئے میں ڈول کیطرح لٹک کر جان بچائی۔ ایک دفعہ دوا دوش میں انکی زوجہ محترمہ پہاڑ پر سے

گر پڑیں جس سے اسقاطِ حمل ہو گیا۔ غرض جب یہ چھپنے اور بھاگے بھاگے پھرنے سے تنگ آگئے

تو مجبوراً ۱۴۵ھ میں ڈیڑھ سو آدمیوں کیساتھ خروج کیا اور تکبیریں کہتے ہوئے مدینے کے قید خانے پر

ٹوٹ پڑے۔ قیدیوں کو رہا کیا اور مسجد نبوی میں خطبہ پڑھکر لوگوں سے بیعت لی۔

جب ان کے خروج کی خبر بغداد میں پہنچی تو وہاں امام مالک[1] رحمۃ اللہ علیہ و

---

[1] امام مالک بن انس ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ انس اُنکے علاوہ ہیں جو آنحضرت صلعم کے صحابی تھے۔ امام مالک کا بچپن بہت ہی فقر و فاقہ میں گزرا۔ اپنے مکان کی چھت کی لکڑیاں فروخت کر کے انھوں نے کتابیں خریدیں اور اسطرح علم حاصل کیا انکی کتاب موطا کتب احادیث میں مشہور رہی۔ جب ہارون الرشید حج کو گیا تھا اُس نے یہ کتاب دیکھکر ان کو تین ہزار دینار انعام دیے تھے منصور عباسی خلیفہ بغداد نے کسی مسئلہ پر اسکی خلاف مرضی فتویٰ دینے پر انکو بڑی ذلت کیساتھ قید کیا اور اس زور سے مشکیں کسوائیں کہ انکا ایک ہاتھ بازو سے اُکھڑ گیا اسکے بعد ستر کوڑے پٹوائے۔ کہتے ہیں کہ اس مخالفت کی اصل وجہ یہ تھی کہ امام مالک نے محمد نفس زکیہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اُن کے ساتھ ہو کر جہاد کرنے کیلیے مسلمانوں کو ترغیب دی تھی۔ امام مالک اہل سنت کے مشہور چار اماموں میں سے ہیں۔ انکے پیرو افریقہ میں بہت ہیں۔ ۴۰۶ھ میں جب شرف الدولہ معز والی افریقہ ہوا تو اُس نے وہاں مذہب مالکی کا رواج دیا۔ اس سے قبل افریقہ کے مسلمانوں کا طریق حنفی تھا۔ مالکی مصلی کعبہ میں بھی موجود ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

امام ابوحنیفہؒ رح نے مسلمانوں کو فتویٰ دیا کہ ان کے ساتھ ہو کر جہاد کریں۔ بہت سے لوگ انکے ساتھ ہو گئے۔ مگر خاندان رسالت میں سے بعض بزرگواروں نے بخیال دور اندیشی ان کا ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام بھی شروع ہی سے ان سے الگ رہے اور جناب صادق ع کے فرزند حضرت عبداللہ نے کچھ دن بعد ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ محمد نفس زکیہ رض مدینے پر قبضہ کرنیکے بعد مکے کیطرف بڑھنا چاہتے تھے۔ اسی اثنا میں منصور نے اپنے چچا عیسیٰ بن موسیٰ کو چار ہزار کا لشکر دیکر ان کے مقابلہ کیلیے روانہ کیا۔ عیسیٰ نے جبل سلع پر جو مدینے سے کوئی دو میل کے فاصلہ پر جانب جنوب پر واقع ہے ڈیرے ڈالے۔ اس کی آمد کی خبر سنکر

بقیہ حاشیہ۔ اور یہ لوگ شیعوں کی طرح ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔ امام مالک کی وفات ۱۷۹ھ میں بمقام مدینہ منورہ ہوئی اور بقیع میں دفن ہوئے۔ توضیحاً ملاحظہ ہوں حالات جنت البقیع۔

۵۱ ۔ امام ابوحنیفہ رح کی ولادت بمقام کوفہ ۸۰ھ میں ہوئی۔ ان کا لقب امام اعظم ہے۔ فقہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد ہیں۔ اہل سنت کا بہت بڑا گروہ ان کا مقلد ہے۔ عہدۂ قضا قبول نہ کرنے پر دو مرتبہ ان کو سو سو کوڑے لگائے گئے۔ انھوں نے بھی مسلمانوں کو ترغیب دی تھی کہ محمد نفس زکیہ رض اور اُن کے بھائی ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کر کے خلفائے بغداد سے جہاد کریں۔ امام ابوحنیفہؒ کی وفات ۱۵۰ھ ہجری میں بغداد میں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ خلیفۂ وقت کے اشارہ سے کسی نے ان کو زہر دیدیا۔

۵۲ ۔ امام جعفر صادق ع محمد نفس زکیہ کے چچازاد بھائی تھے۔ چوتھی پشت میں دونوں بزرگوں کا سلسلۂ نسب امیرالمومنین علی ابن ابیطالب پر منتہی ہوتا ہے جیساکہ شجرۂ ذیل سے واضح ہوگا۔ اثنا عشری سلسلۂ امامت کے لحاظ سے امام جعفر صادق ع چھٹے امام ہیں بعض لوگ حضرت نفس زکیہ کے خروج پر اعتراض کرتے ہیں کہ امام برحق امام جعفر صادق ع کی موجودگی میں اُنکی خلاف مرضی ان کو حکم امامت بلند نہ کرنا چاہیے تھا۔ میں کہتا ہوں جن مصیبتوں میں یہ گرفتار تھے اُنکی وجہ سے ان کو تلوار پر ہاتھ ڈالنا حلال ہو گیا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ جناب صادق علیہ السلام نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا اور اُن کے فرزند عبداللہ ان کو چھوڑ کر کیوں الگ ہو گئے یہ عمل اُن بزرگواروں کا کسی مصلحت پر مبنی ہوگا۔
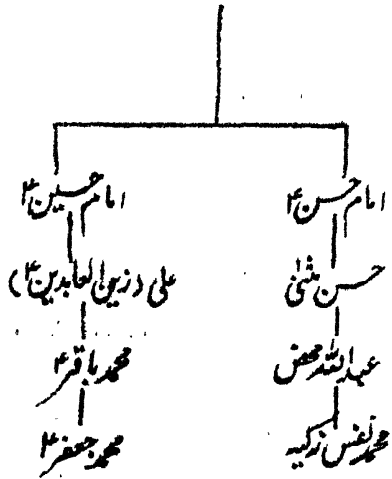
علی ابن ابی طالب ع

امام حسن ع	امام حسین ع
حسن مثنیٰ	علی زین العابدین ع
عبداللہ محض	محمد باقر ع
محمد نفس زکیہ	محمد جعفر ع

امام جعفر صادق ع مخفی طور پر مدینے سے کہیں باہر چلے گئے۔ عیسیٰ نے اُن کا مال و اسباب ضبط کر لیا۔ اور نفس زکیہ رض سے کہلا بھیجا کہ اگر تم منصور کی بیعت کرتے ہو تو تم کو امان دیتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ بے عزتی کی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔ عیسیٰ نے اپنی فوجوں کو حملے کا حکم دیا۔ محمد نے مدینے کے گرد خندق کھودی اور مقابلہ کیلیے تیار ہو گئے۔ تین دفعہ دشمنوں کو پسپا کیا۔ آخر عیسیٰ کی فوجوں کی کثرت دیکھکر بہت سے لوگ نفس زکیہ رض کو چھوڑ کر چلے گئے اور صرف تین سو جاں نثاران کے ساتھ رہ گئے۔ انھوں نے ۱۴ رمضان ۱۴۵ھ کو غسل کر کے عطر لگایا۔ گھوڑوں کی کوچیں کاٹ ڈالیں۔ تلواروں کے میان توڑ کر پھینک دیے اور احد احد کہتے ہوئے دشمن پر جا پڑے۔ اسوقت محمد نفس ذکیہ رض کے ہاتھ میں ذوالفقار[1] حیدری تھی۔ جو انھوں نے

[1] نقرہ کی جمع نقار ہے۔ نقرہ مُہرے یا ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ذوالفقار کے معنی نقروں والی کے ہیں۔ چونکہ اس تلوار کی ساخت ایسی تھی جیسی پیٹھ کی ہڈی ہوتی ہے اور اس میں (۱۷) مُہرے تھے اس وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا تھا۔ بعض لوگ ذوالفقار کو دو نوک والی تلوار سمجھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ذوالفقار اصل میں منبہ بن حجاج کی تلوار تھی جو کہ ۲ھ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے جنگ بدر میں مارا گیا تھا اُس وقت ذوالفقار مال غنیمت میں آئی تھی اور آنحضرت ص نے اسے اپنے لئے پسند فرمایا تھا۔ اسکے بعد ۵ھ میں جنگ احزاب میں جسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں آنحضرت ص نے یہ تلوار حضرت علی ع کو عنایت فرمائی۔ ایک تو وہ تلوار اعلیٰ درجہ کی اُس پر حیدر کرار کا ہاتھ غرضکہ اس تلوار کی وہ شہرت ہوئی کہ دُنیا میں کسی تلوار کی نہ ہوئی ہوگی۔ یہاں تک کہ کوہ و صحرا میں یہ آواز گونجنے لگی

لافتیٰ اِلّا علی لا سیف اِلّا [illegible]

معرکۂ کربلا کے بعد غالباً ذوالفقار خاندان رسالت میں کسی نہ کسیطرح آگئی اور در [illegible] کے بعد منصور خلیفۂ بغداد کے اسلحہ خانہ میں داخل ہوئی اور پھر نہ معلوم کہاں گئی۔ اور اب کہاں ہے۔ ذوالفقار رہے [illegible] اسکے کارنامے ابتک آسمانِ شہرت پر برقِ یمانی بنکر چمک رہے ہیں ہندوستان کے بعض شہروں میں ماہ محرم میں علم کیطرح ذوالفقار بھی بنایا جاتا ہے جس کی دو تین ترکیبیں میری نظر سے بھی گذری ہیں۔ ایک یہ کہ ایک بڑی بانس کے سرے پر کمان باندھ دیجاتی ہے اور کمان کے دونوں سروں سے لکڑی کی دو تلواریں لٹکا دی جاتی ہیں۔ منّت والے اس ذوالفقار کو جگہ جگہ لیے پھرتے ہیں۔ کہیں کہیں ایک لمبے بانس پر دو نوک کی تلوار باندھ دیجاتی ہے اور اُسے ذوالفقار کہا جاتا ہے۔ بعض جگہ ذوالفقار اسطرح بناتے ہیں کہ ایک بانس پر پچیس تیس یا کم و بیش تلواریں [illegible]

بقیہ صفحہ آئندہ

اپنے ہاتھ سے ستر آدمی مارے ان کی درمیان میں عباسی فوج کے بعض سپاہیوں نے یہ چال چلی کہ کسی عورت کی سیاہ اوڑھنی لیکر اس کا پھریرا مسجد نبوی پر اُڑا دیا جس سے محمد کے ساتھی یہ سمجھے کہ مدینے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا مگر محمد اب بھی استقلال کے ساتھ دشمنوں کے حملوں کا جواب دیتے رہے یہاں تک کہ ایک شخص نے انکی پشت پر نیزہ مارا جب یہ زخم کے صدمے سے جھکے تو حمید بن قحطبہ نے سینہ میں برچھا لگایا اور تلوار سے ان کا سر جدا کر دیا۔ محمد کے ساتھیوں میں امام زین العابدین علیہ السلام کے دو پڑپوتے حسین و علی فرزندان حسن بن زید بن زین العابدین بھی شہید ہوئے مگر ان دونوں صاحبزادوں کے والد حسن بن زید منصور کی فوج کیساتھ تھے اور انھیں کے ایک فرزند قاسم بن حسن ہاتھ فتح لیکر منصور کے دربار میں گئے تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

محمد نفس زکیہ رض کو دعویٰ تھا کہ وہ مہدی موعود ہیں۔ فرقہ زیدیہ[۵] میں سے بعض انکو

بقیہ حاشیہ۔ پھیلا کر باندھ دیتے ہیں۔ ہر تلوار کی نوک پر ایک ایک نیبو لگا دیا جاتا ہے اور ایک پٹکا علم کے پٹکے کی طرح بانس میں آویزاں کر دیتے ہیں اور سہرا باندھ دیتے ہیں مختلف اشخاص اس وزنی ذوالفقار کے اٹھانیوالے ہوتے ہیں جو طرح طرح کرتب دکھاتے ہیں اور اسکی جھوک سنبھال کر کبھی کندھے پر کبھی دانتوں پر کبھی ٹھوڑی پر اور کبھی کلائی پر اسکو اٹھا کر کئی کئی منٹ تک لیے رہتے ہیں۔ ذوالفقار کے نیبو مختلف حاجتوں کیلیے کھلائے جاتے ہیں جنکی منت پوری ہوتی ہے وہ سال آیندہ چاندی کا نیبو بنا کر ذوالفقار پر چڑھاتے ہیں۔ ایک سیاہ پرند جسکی دُم دو شاخہ ہوتی ہے وہ بھی ذوالفقار کہلاتا ہے۔

[۵]۔ فرقہ زیدیہ امام زین العابدین علیہ السلام کے بعد بجائے "محمد باقر ع" کے حضرت زید بن امام زین العابدین کو پانچواں امام برحق جانتا ہے اور انکے بعد انکے بھائی حضرت یحییٰ کو چھٹا امام جانتا ہے پھر امامت اولاد امام حسن علیہ السلام میں منتقل سمجھکر محمد نفس زکیہ رض وابراہیم وادریس وغیرہ کی امامت کا قائل ہے۔ زیدیوں کی اذان ونماز مثل شیعہ اثنا عشری کے ہوتی ہے مگر تراویح بھی پڑھتے ہیں مسئلہ خلافت میں بھی شیعوں سے پورے طور پر متفق نہیں ہیں اور بعض دوسرے مسائل میں حنفیوں سے زیادہ ملتے ہیں۔ حضرت زید نے ۱۲۱ھ میں ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں امامت کا دعویٰ کیا تھا۔ بہت سے لوگ انکے جھنڈے تلے اکھٹے ہو گئے تھے ہشام نے انکے مقابلہ پر فوج بھیجی ۱۲۲ھ میں نواح کوفہ میں مقابلہ ہوا حضرت زید بڑی شجاعت سے لڑکر میدان جنگ میں کام آئے۔ چھٹی صدی ہجری میں فرقہ زیدیہ کا مصلیٰ کعبہ میں موجود تھا اور انکے طریق کی اذان ونماز بیت اللہ میں ہوا کرتی تھی اسوقت بھی مکہ معظمہ ومدینہ منورہ میں بہت سے زیدی موجود ہیں۔ یمن میں بھی اس طریقے کے مقلد پائے جاتے ہیں (باقی برصفحہ آیندہ)

ساتواں امام مانتے ہیں۔ بعض امام منتظر بھی کہتے ہیں۔ فرقہ نفسیہ جو انہیں کے متبعین کا گروہ ہے
ان کو مہدی جانتا ہے۔ اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نفس زکیہؑ مارے نہیں گئے بلکہ نگاہوں سے
پوشیدہ ہوگئے ہیں۔ وقت شہادت انکی عمر پینتالیس سال تھی ان کا سر اور ذوالفقار منصور کے
پاس بغداد بھیجدیگئی اور ان کا تن بے سر ان کی بہن حضرت فاطمہ بنت عبداللہ نے بقیع میں سپرد خاک
کردیا۔ مگر بقیع میں ان کے نام سے کوئی قبر منسوب نہیں ہے۔ مشہور یہ ہے کہ بمقام احجار زیت[1]
جبل سلع کے مشرق میں ان کو دفن کیا گیا یہاں انکی قبر بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ انکی شہادت سے
اس حدیث کی تصدیق ہوگئی جسمیں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے:-

"یقتل باحجار الزیت من ولدی نفس زکیہ"

یعنی احجار زیت میں میرا ایک لڑکا نفس زکیہ قتل ہوگا۔

(وفاء الوفا۔ تاریخ مذاہب اسلام۔ تاریخ کامل۔ تاریخ ابوالفدا۔ ناسخ التواریخ وغیرہ)

نویں صدی ہجری میں انکی قبر پر ایک بڑی عمارت بنی ہوئی تھی مگر قبہ نہ تھا۔ اس کا پتہ نہیں چلتا
کہ اہل نجد کی پہلی فتوحات کے وقت ۱۲۱۹ھ میں انکی قبر پر قبہ موجود تھا یا نہ تھا۔ چودھویں صدی ہجری کے
سیاح قبے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بعض سیاحوں نے حضرت نفس زکیہؑ کا نام سید زکی الدین بھی لکھا ہے
میں نے مدینے کے معلموں کو بھی ان کے حالات سے عموماً لاعلم پایا۔ مجھسے بھی ایک شخص نے
سید زکی الدین کے نام سے ہی ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کو کہا تھا۔ قبر وہی معمولی کچا چبوترہ تھا جسکے
گرد پتھروں کی ڈھیلی ڈھیلی بندش تھی اور ایک پتھر سرہانے نصب تھا۔ قبر کے قریب ایک
کنواں اور ایک مسجد بھی ہے۔

بقیہ حاشیہ۔ ہندوستان میں ان سیدوں کو زیدی کہتے ہیں جنکا سلسلہ نسب حضرت زید بن امام زین العابدین تک
یا حضرت امام حسن علیہ السلام کی نسل میں زید نامی بزرگ تک پہنچتا ہے۔

[1] احجار زیت۔ تیلیا پتھر۔ احجار جمع ہے حجر کی۔ میں نے دیکھا تھا اس مقام کے پتھر سیاہی اور چکناہٹ کی وجہ سے تیلیا ہیں۔

تمت

۲۷ رجب المرجب سنہ ۱۳۴۷ھ